اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ ۔(القرآن)

''بلاشبہ یہ قرآن'' اس راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔

تفسیر پارہ عمّ

سُورۃ النَّبَا تا سُورۃ النَّاس

مولانا شمس پیرزادہ رح

ادارہ دعوۃ القرآن

۵۹۔محمد علی روڈ، ممبئی ۴۰۰۰۰۳

☆ فون نمبر: 23465005

نوواں ایڈیشن ۲۰۰۰

جنوری ۲۰۰۲ء

ہدیہ: ۷۰/روپئے

فہرست

نمبر سورہ	نام سورہ	صفحہ	نمبر سورہ	نام سورہ	صفحہ
۷۸	النباء	۷	۹۷	القدر	۱۷۳
۷۹	النازعات	۱۹	۹۸	البینۃ	۱۷۹
۸۰	عبس	۳۱	۹۹	الزلزال	۱۸۷
۸۱	التکویر	۴۱	۱۰۰	العٰدیٰت	۱۹۱
۸۲	الانفطار	۵۳	۱۰۱	القارعۃ	۱۹۵
۸۳	المطففین	۶۱	۱۰۲	التکاثر	۱۹۹
۸۴	الانشقاق	۷۳	۱۰۳	العصر	۲۰۳
۸۵	البروج	۸۱	۱۰۴	الھمزہ	۲۰۷
۸۶	الطارق	۸۹	۱۰۵	الفیل	۲۱۳
۸۷	الاعلیٰ	۹۵	۱۰۶	قریش	۲۱۹
۸۸	الغاشیۃ	۱۰۵	۱۰۷	الماعون	۲۲۵
۸۹	الفجر	۱۱۱	۱۰۸	الکوثر	۲۳۱
۹۰	البلد	۱۲۳	۱۰۹	الکافرون	۲۳۷
۹۱	الشمس	۱۳۱	۱۱۰	النصر	۲۴۳
۹۲	الیل	۱۳۹	۱۱۱	اللھب	۲۴۹
۹۳	الضحیٰ	۱۴۷	۱۱۲	الاخلاص	۲۵۵
۹۴	الم نشرح	۱۵۳	۱۱۳	الفلق	۲۶۱
۹۵	التین	۱۵۹	۱۱۴	الناس	۲۷۱
۹۶	العلق	۱۶۵		انڈیکس	۲۷۶

تصاویر اور نقشہ جات

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱	قوم ہود اور قوم ثمود کا مسکن	۱۱۰
۲	غارِ حراء	۱۷۲
۳	مصحف عثمانی	۱۸۶
۴	خانۂ کعبہ پر ابرہہ کی فوج کشی	۲۱۸
۵	بیت اللہ	۲۱۹
۶	قریش اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب	۲۲۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تفسیر ''دعوۃ القرآن'' کا آخری جزء یعنی پارۂ عم کی تفسیر کا نوواں ایڈیشن قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ یہ اسی کا فضل ہے کہ تفسیر دعوۃ القرآن کو قبولیت عام حاصل ہوئی ہے۔ پانچ زبانوں اردو، مراٹھی، گجراتی، ہندی اور انگریزی میں تین تین جلدوں پر مشتمل اس تفسیر کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

یہ بھی اُسی کا کرم ہے کہ اردو تفسیر کی پہلی جلد کمپیوٹرائزڈ کتابت پر طبع ہوگئی ہے اس کے بعد دوسری اور تیسری جلد بھی مرحلہ وار شائع کی جائیں گی۔ **انشاء اللہ!**

تیسویں پارہ کی مخصوص اہمیت و افادیت نیز مسلمانوں کی اکثریت کا اپنی نمازوں میں ان سورتوں کے پڑھنے کے پیش نظر اس کو جدید ترین طباعت اور گٹ اپ میں شائع کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر پر آنے کی وجہ سے طباعت میں خوبصورتی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ترجمہ بالکل آیتوں کے سامنے آگیا ہے۔ اب قارئین کے لئے سہولت ہوگئی ہے کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ دیکھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں پارے کی سائز بھی اصل تفسیر سے چھوٹی کردی گئی ہے تاکہ سفر وحضر میں ساتھ رکھنے اور مطالعہ کرنے میں آسانی ہو۔

آج کل جادو، ٹونے، ٹوٹکے اور تعویذ گنڈوں کا عام رواج ہورہا ہے۔ باوا گری کے اشتہارات بھی شائع ہو رہے ہیں۔ مولانا شمس پیرزادہؒ نے معوذتین کی تفسیر میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

عام طور پر پارۂ عم کی تفسیر کے شروع میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر بھی دی جاتی ہے۔ لیکن مولانا مرحوم اس کو قرآن کی ترتیب کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہٰذا ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر کو علیٰحدہ سے شائع کر رہے ہیں۔ جن حضرات کو ضرورت ہو، اس کو علیٰحدہ سے حاصل کرسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں قرآن کا صحیح فہم حاصل کرنے اور اس کی تعلیمات کو عوام الناس تک پہنچانے کی توفیق اور ذرائع ووسائل عطا فرمائے۔ (آمین)

شہاب بانکوٹی
سکریٹری
ادارہ دعوۃ القرآن
ممبئی ۴۰۰۰۰۳

۲۰ر شوال المکرم ۱۴۲۲ھ
۵ر جنوری ۲۰۰۲ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

الحمد للہ دعوۃ القرآن مکمل تین جلدوں میں شائع ہوگئی ہے، جن میں پارۂ عم کی تفسیر بھی شامل ہے۔ اس کے باوجود پارۂ عم (تیسواں پارہ) کی تفسیر علیحدہ سے بھی شائع کی جارہی ہے، جب کہ اس سے پہلے بھی اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آخری پارہ چھوٹی چھوٹی اور بیشتر مکی سورتوں پر مشتمل ہے، جن میں قرآن کی بنیادی دعوت اور اس کی اساسی تعلیم دلائل وشواہد کے ساتھ نہایت مؤثر انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اس لئے دعوتی پہلو سے یہ جزء بڑی اہمیت کا حامل ہے اور مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے بڑی افادیت رکھتا ہے۔ اس کی افادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ نماز میں یہ سورتیں بہ کثرت پڑھی جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر ان کا مطلب صحیح طور سے ذہن نشین ہوجائے تو اس سے نماز کو اس کی روح کے ساتھ ادا کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ ان خصوصیات کے پیشِ نظر پارۂ عم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت عمل میں لائی جانی چاہئے۔

تفسیر کے سلسلہ میں ضروری باتیں ہم مقدمہ میں بیان کرچکے ہیں۔ یہاں مزید چند باتوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ قرآن کوئی سپاٹ کتاب نہیں ہے کہ آدمی اس پر سے سرسری طور سے گذر جائے، بلکہ وہ علم وحکمت کا ایک بیش بہا خزانہ ہے، جس کا ایک ایک لفظ غور وفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ اگر دریائے معانی میں غوطہ لگانے کا حوصلہ ہو تو یہاں گہر کی کمی نہیں۔ قیمتی جواہرات سے اپنا دامن بھر لیجئے اور اگر زیادہ گہرائی میں اترنے کی ہمت ہو تو درشہوار اور گوہر نایاب بھی ہاتھ آسکتے ہیں۔ اس کتاب کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ اسرار کائنات اور اسرار زندگی سے پردہ اٹھاتی ہے۔ مگر جو لوگ عربی سے نابلد ہیں اور خاص طور سے غیر مسلم، جو اس کتاب سے بالکل ناآشنا ہیں وہ اس کی عظمت کا اندازہ اسی صورت میں کرسکتے ہیں، جب کہ یہ پہلو اس طرح روشن ہو کر ان کے سامنے آجائے کہ گویا یہ علم و حکمت کا ایک ابلتا ہوا چشمہ ہے۔ ایک مختصر تفسیر میں ان پہلوؤں کو پیش کرنے کے لئے مشکل ہی سے گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ لیکن پارۂ عم کی اہمیت کے پیش نظر کچھ وسعت سے کام لینا پڑا، جس کی وجہ سے اس کی ضخامت بڑھ گئی۔

اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ پارۂ عم کی سورتیں قرآن کی بلاغت ایجاز اور اعجاز کلام کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس وجہ سے ان کا ترجمہ اور تشریح سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اسی لئے اس کی تفسیر کی تالیف میں ہمیں ایک سال سے زیادہ کا وقت لگا۔ اور اس راہ میں جن وادیوں کو طے کرنا پڑا اور جن گھاٹیوں سے گزرنا پڑا اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو اس ذوق سے آشنا ہیں۔

تفسیر کی تالیف میں ہم نے عربی، اردو اور انگریزی کی تقریباً تمام اہم تفاسیر کو سامنے رکھا ہے اور جابجا ان کے حوالے بھی دئے ہیں۔ روایات کے سلسلہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ کوئی صحیح حدیث جو کسی آیت سے متعلق ہو چھوٹنے نہ پائے۔ اور کوئی بھی کمزور روایت اس میں جگہ حاصل کرنے نہ پائے۔ روایات کے قبول کا

معیار جہاں ہم نے بلند رکھا ہے وہاں اس بات کا بھی پورا پورا اہتمام کرنے کی کوشش کی ہے کہ تفسیر کے معاملہ میں ذاتی رجحان اور شخصی ذوق راہ نہ پائے۔ بلکہ جو بات بھی کہی جائے دلیل کی بنیاد پر کہی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ نظم قرآن کس بات کا متقاضی ہے اور سنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی لغزش ہوئی ہو تو وہ اصلاح طلب ہے۔

پارۂ عم کی سورتیں بجز سورۂ نصر کے سب مکی ہیں اور زیادہ تر اس دور کی ہیں جب کہ دعوت کا آغاز ہوا تھا۔ اس لئے ان سورتوں میں دعوت کو پیش کرنے کا جو نہج اور طریقہ (APPROACH) اختیار کیا گیا ہے اس میں داعیان حق کے لئے بڑی رہنمائی کا سامان ہے کیوں کہ یہ سادہ، فطری اور مؤثر طریقہ ہے۔ قرآن نے اپنی دعوت کے لئے نہ فلسفہ کا انداز اختیار کیا اور نہ منطق کا، اس کی دعوت نہ تصوف کے قالب میں ڈھلی ہوئی ہے اور نہ سیاسی نظام کے سانچہ میں۔ بلکہ ہر قسم کے تکلف اور تصنع سے پاک اس کا اپنا ایک طریقہ ہے جو قلب و ذہن میں براہ راست نفوذ کرنے والا۔ اس کو جھنجھوڑنے والا اور غفلت کی نیند سے بیدار کر کے انسان کی کایا پلٹ دینے والا۔ ایک ایسی دعوت کے لئے جو عالمگیر سچائی کی دعوت ہو، یہی طریقہ موزوں بھی ہے۔ اس لئے کہ عالمگیر سچائی ایک بسیط حقیقت ہے جس کو کسی سانچہ میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر ان سورتوں کا مطالعہ کرے گا، اس پر یہ حقیقت بخوبی واضح ہوگی کہ قرآن کی دعوت کا رخ انسان کے نفس کی طرف ہے، کہ سب سے پہلے وہ اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کرے جو اس کے اپنے نفس کی پاکیزگی سے متعلق ہے اور جس کے بارے میں اسے سب سے پہلے خدا کے حضور جوابدہی کرنا ہے۔ یعنی اپنے عقائد اور اپنے اخلاق و کردار کی پاکیزگی اور احساس بندگی۔ اگر ایک داعی نے مخاطب کی توجہ کو اس نقطہ پر مرکوز کرنے کی کوشش نہیں کی اور آغاز ہی میں دعوت کے وسیع تقاضے بیان کرنا شروع کئے تو مخاطب اصل دعوت کو اپنے ذہن کی گرفت میں نہیں لے سکے گا اور بحث دوسرے رخ پر جا پڑے گی۔ الغرض قرآن کی اصل دعوت کیا ہے اور اس کو پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کون سا ہے؟ ان باتوں کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ کیوں کہ اس سلسلہ میں کچھ ایسے طریقے بھی رائج ہو گئے ہیں جو قرآن سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

ادارہ دعوۃ القرآن پانچ زبانوں اردو، مرہٹی، گجراتی، ہندی اور انگریزی میں ''تفسیر دعوۃ القرآن'' شائع کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ادارہ کی مدد فرمائے اور خیر و برکت سے نوازے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

ادارہ دعوۃ القرآن

۵۹۔ محمد علی روڈ ممبئی ۴۰۰۰۰۳

شمس پیرزادہؒ

۹/ جمادی الآخر ۱۴۱۶ھ

۳/ نومبر ۱۹۹۵ء

(۷۸) سورۃُ النَّبَا

نام اس سورہ کا نام ''النَّبا'' ہے جس کے معنیٰ اہم خبر کے ہیں۔ مراد قیامت اور دوبارہ اٹھائے جانے کی خبر ہے۔ یہ نام اس سورہ کی آیت ۲ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول سورہ مکی ہے اور ابتدائی آیات ہی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ سورہ اس وقت کی تنزیل ہے، جبکہ نبی ﷺ نے اہل مکہ کو قیامت کے آنے اور جزا و سزا کے واقع ہونے کی خبر دی تھی۔ جس کے نتیجہ میں اس موضوع پر ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قیامت کو ناممکن قرار دیتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ حالات دعوت کے پہلے مرحلہ ہی میں پیش آئے تھے۔

مرکزی مضمون اس سورہ کا مرکزی مضمون قیامت کے دن عدالتِ خداوندی کا برپا ہونا اور انسانوں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دینا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں ان لوگوں کو سرزنش کی گئی ہے جو قیامت کے عظیم اور ہولناک واقعہ کی خبر سن کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ گویا قیامت کی خبر ان کے نزدیک کسی سنجیدہ غور و فکر کی مستحق نہیں ہے۔ لیکن وہ وقت دور نہیں جب کہ قیامت واقعہ کی صورت میں ان کے سامنے آ نمودار ہوگی اور وہ فرمانروائے کائنات کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہوں گے۔

آیت ۶ تا ۱۶ میں اللہ کی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں، جو زندگی اور موت کے نہ صرف ممکن الوقوع ہونے پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ اس بات کی بھی شہادت دیتی ہیں کہ روز جزا ضروری ہے۔ کیوں کہ یہ اللہ کی ربوبیت اور حکمت کا عین تقاضا ہے۔

آیت ۱۷ تا ۲۰ میں بتایا گیا ہے کہ روز جزا کا ظہور مقررہ وقت پر ہوگا۔ اس روز آسمان و زمین کے نظام میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوگا اور تمام انسان زندہ ہو کر عدالت خداوندی کی طرف چل پڑیں گے۔

آیت ۲۱ تا ۳۰ میں سرکشوں کا انجام بیان کیا گیا ہے اور آیت ۳۱ تا ۳۶ میں خدا خوفی کے ساتھ زندگی گذارنے والوں کا۔

آیت ۳۷ تا ۴۰ خاتمہ کلام ہے جس میں عدالت خداوندی میں حاضری کی تصویر کھینچی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ لوگ باطل شفاعت کے بل پر جوابدہی سے نہیں بچ سکتے۔

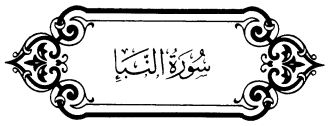

سُورَةُ النَّبَا

(۷۸) سُورةُ النَّبَا

آیات ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝١	۱ یہ لوگ کس چیز کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں؟
عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝٢	۲ اُس بڑی خبر ۱؎ کے بارے میں!
الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝٣	۳ جس کے متعلق یہ مختلف باتیں کر رہے ہیں۔ ۲؎
كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٤	۴ ان کی باتیں غلط ہیں۔ انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا ۔
ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝٥	۵ پھر سُن لو! ان کے خیالات باطل ہیں وہ جلد ہی جان لیں گے۔ ۳؎
اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝٦	۶ کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا؟ ۴؎
وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝٧	۷ اور پہاڑوں کو میخیں؟ ۵؎
وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۝٨	۸ اور کیا تم کو جوڑوں کی شکل میں پیدا نہیں کیا؟ ۶؎
وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۝٩	۹ اور تمہاری نیند کو باعث سکون۔ ۷؎
وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۝١٠	۱۰ اور رات کو لباس۔ ۸؎
وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝١١	۱۱ اور دن کو وقتِ معاش نہیں بنایا ؟ ۹؎
وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝١٢	۱۲ کیا تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان نہیں بنائے ؟ ۱۰؎
وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝١٣	۱۳ اور ایک روشن چراغ پیدا نہیں کیا؟ ۱۱؎
وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝١٤	۱۴ اور کیا ہم نے بادلوں سے موسلا دھار پانی نہیں برسایا؟ ۱۲؎

۱ بڑی خبر سے مراد قیامت اور روزِ جزا کے واقع ہونے کی خبر ہے۔ قرآن نے جب یہ خبر سنائی تا کہ لوگ متنبہ ہو کر ذمہ دارانہ زندگی گذاریں، تو مشرکینِ مکہ اس کا مذاق اڑانے اور اس کے خلاف آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ آیت کا اشارہ ان کی انہی چہ میگوئیوں کی طرف ہے۔

۲ مشرکینِ مکہ کے خیالات روزِ جزا اور آخرت کے بارے میں مختلف تھے۔ وہ انسان کو دوبارہ اٹھائے جانے کو سرے سے ممکن ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے؟ کچھ لوگوں کے نزدیک آخرت کا تصور کوئی معقول بات نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے ''زندگی تو بس دنیا کی زندگی ہے مرنے کے بعد ہمیں اٹھایا نہیں جائیگا۔'' اور کچھ لوگ آخرت کے بارے میں شک اور تذبذب میں مبتلا تھے۔ ان کے یہ خیالات کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں تھے بلکہ یہ محض اٹکل پچو باتیں تھیں۔

واضح رہے کہ قیامت اور روزِ جزا سے انکار کے معاملہ میں مشرکینِ عرب منفرد نہ تھے۔ بلکہ جہاں تک دیگر مشرکانہ مذاہب کا تعلق ہے، وہ بھی نہایت الجھی ہوئی باتیں پیش کرتے ہیں جس کا اندازہ درج ذیل اقتسابات سے ہوگا۔

Extract From The Encyclopaedia Of Religion And Ethics, Volume V :

Hindu: Although in the Rigveda no clear statement of Judgement is found, and Yama appears mainly as king of the region of bliss, yet he is to some extent an object of terror, and a dark under ground hell is spoken of as the fate of evil-doers (iv. 5.5, vii 104.3, ix-73.8)..... The later views differ widely from this, through the gradual introduction of the belief in transmigration, while Yama is now the judge of the dead.....In the Upanishads re- birth in varios conditions, in heaven,hell or on earth, appears as the result of ignorance of the true end of existence ..... Hinduism in all its forms endorses this view. All go to Yama over a dreadful road, on which the pious fare better than the wicked. Yama or Dharma judges and allots the fate. Throgh endless existences and re-births --- in human, animal, or plant forms --- alternated with lives in the heavens or hells, the soul must pass.

Buddhist : In Buddhism the idea of karma afforded an automatic principle of judgement, whereby the person after death entered upon an existence, higher or lower, according to his actions. At death, the force resulting from actions combined with clinging to existence causes creation of the five skandhas, or constituent elements of being. This is so swift that there is hardly any break in the continuity of personality, which is thus re-created in one of the six states ---gods, men, asuras, animals, plants, pretas, or inhabitants of one of the hells.(p.375)

لیکن ان تمام الجھی ہوئے باتوں کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس دنیا کا ایک دن خاتمہ ہونا ہے۔ اور موجودہ سائنس اس کی تائید کرتی ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار آگے چل کر لکھتا ہے:۔

Conclusion: The ideas regarding the end of the world wich are found in most eschatologies may be regarded as mythical speculations prompted by knowledge of actual catastrophes in Nature and of its phenomena. The world, as science teaches, and as the speculations of men suggested, must have an end; but they pictured that end in lurid colours, while generally anticipating after it a new order. (p. 391)

قرآن جزائے عمل کے لئے ایک نئے نظام عمل کے ساتھ نئے عالم کے برپا کئے جانے کی خبر کو محض اندھے عقیدہ (Dogma) کے طور پر نہیں، بلکہ آفاق وانفس کی نشانیوں (عقلی دلائل) کے ساتھ اتنے دلنشیں پیرایہ میں پیش کرتا ہے کہ کسی قسم کے شک وشبہ اور اختلاف کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور ضمیر پکار اٹھتا ہے کہ روز جزا کا برپا کیا جانا نہ صرف ممکن بلکہ ضروری ہے۔ اور قرآن آگے بڑھ کر پوری قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ یوم جزا لازماً برپا ہوگا۔

۳ یعنی وہ وقت دور نہیں جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ روز جزا کے بارے میں ان کی قیاس آرائیاں غلط تھیں۔ یہ حقیقت موت کے آتے ہی عالم برزخ میں جو قیامت تک کے لئے روحوں کا ٹھکانہ ہے، ان پر کھل جائے گی۔ اور پھر قیامت کے دن جب کہ تمام انسانوں کو جسم سمیت دوبارہ اٹھا کھڑا کیا جائے گا، وہ اپنی آنکھوں سے اس حقیقت کا مشاہدہ کریں گے۔ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ (انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا) کی تکرار ان دو مواقع کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۴ کرۂ زمین اگرچہ فضا میں معلق ہے اور سورج کے گرد گردش بھی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ نیز اسکی سطح کو اس طرح پھیلا دیا گیا ہے کہ اس پر آبادی ممکن ہوئی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاص انسان کو بسانے ہی کیلئے زمین کو فرش بنا کر ان تمام چیزوں کا انتظام کیا گیا ہے، جو انسانی زندگی کے لئے مطلوب ہیں۔ گویا زمین پر انسان کو بسانے کا کام ایک منصوبہ کے تحت عمل میں آیا ہے۔ کیا اس میں اللہ کی ربوبیت اور حکمت کی کھلی نشانی موجود نہیں ہے؟

۵ زمین پر پہاڑوں کی میخیں گاڑ دینے سے اس کی رفتار اور گردش میں توازن پیدا ہو گیا ہے اور اضطراب کی کیفیت نہیں رہی۔ مزید براں پہاڑوں سے انسانوں کو طرح طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً دریاؤں کی شکل میں پانی کے ذخائر وغیرہ۔

۶ ایسا نہیں ہوا کہ صرف مرد پیدا کر دیئے گئے ہوں یا عورتیں ہی عورتیں پیدا کر دی گئی ہوں۔ بلکہ مرد اور عورت کے جوڑے کی شکل میں انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ اس جوڑے کا ہر فرد اپنی جسمانی اور نفسانی خصوصیات کے لحاظ سے مختلف ہے۔ لیکن یہ اختلاف ان میں تضاد اور مخالفت نہیں بلکہ توافق اور مودت پیدا کر دیتا ہے۔ گویا وہ ایک دوسرے سے مل کر مکمل ہو جاتے ہیں۔ کیا انسان کی تکمیل کا یہ سامان اپنے اندر اللہ کی ربوبیت اور حکمت کی کوئی نشانی نہیں رکھتا؟

۷ نیند انسان کی تکان کو دور کرتی ہے اور اس کے بعد وہ تازہ دم ہو جاتا ہے۔ اگر نیند کا داعیہ اللہ تعالیٰ نے انسان

کی فطرت کے اندر نہ رکھا ہوتا تو مسلسل محنت کرنے سے اس کے قویٰ جواب دیدیتے۔اور وہ پرسکون زندگی گذارنے کے قابل نہ رہتا۔انسان کو آرام اور سکون بہم پہنچانے کا یہ انتظام کس قدر حیرت انگیز ہے! کیا یہ بھی کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے یا ایک مدبّر کا حکیمانہ منصوبہ؟

۸ اگر زمین پر دن ہی دن ہوتا تو انسان کے تحفظ اور راحت کا سامان نہیں ہوسکتا تھا۔آفتاب کی مسلسل تمازت انسان کو سکون وراحت سے محروم کر دیتی۔لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک ایسے قانون میں جکڑ دیا ہے کہ وہ اپنے محور پر برابر گردش کرتی رہتی ہے جس سے رات اور دن کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔اس طرح رات کی چادر انسان کو اپنے اندر اسی طرح چھپالیتی ہے جس طرح کہ لباس۔کیا زمین کی اس گردش کے پیچھے جو اس عظیم مقصد کو لئے ہوئے ہے کسی مدبر کا ہاتھ کارفرما نہیں ہے ؟

۹ اگر زمین پر رات ہی رات ہوتی تو معاشی دوڑ دھوپ اور گذر بسر کے لئے وہ سازگاری انسان کو ہرگز میسر نہ آتی، جس کی بنا پر وہ ایک بہترین مخلوق کی حیثیت سے زندگی گذار رہا ہے۔اور اقتصادی ترقی کے لئے بے شمار راہیں اس پر کھل گئی ہیں۔کیا یہ اللہ کی ربوبیت کا کرشمہ نہیں ہے؟

۱۰ یعنی اللہ کی پیدا کردہ کائنات کی وسعت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہو کہ حدِّ نظر تک دکھائی دینے والا آسمان، صرف آسمانِ اول ہے۔ایسے سات آسمان اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے ہیں۔اور اجرام سماوی کو مستحکم بنایا ہے کہ ایک طویل زمانہ گذر جانے کے باوجود ان میں شکست وریخت کے کوئی آثار پیدا نہیں ہوئے۔اور اس کے حسن وجمال میں ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوا۔نیز قوانین قدرت کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ کہیں سے کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوسکتا۔اگر آسمان کا نظام مضبوط نہ بنایا گیا ہوتا تو زمین کا نظام ہرگز قائم نہیں رہ سکتا تھا۔کیا اس میں اللہ کی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی عظیم نشانیاں موجود نہیں ہیں؟

۱۱ سورج کو ایسا روشن بنایا گیا ہے کہ اس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی۔موجودہ سائنس کی روشنی میں سورج کو دیکھئے تو کمالات خداوندی کے پہلو اور روشن ہوکر سامنے آئیں گے۔سورج کا درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔وہ زمین سے ایک سو گنا سے زائد بڑا ہے۔اسے زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر رکھا گیا ہے ،جس کی وجہ سے زمین پر نہ بے انتہا گرمی ہوتی ہے نہ بے انتہا سردی۔بلکہ زندہ مخلوق کے لئے جو درجہ حرارت مطلوب ہے ٹھیک وہی درجہ حرارت یہاں رہتا ہے۔اور سورج کی اسی حرارت سے بارش بھی ہوتی ہے اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔پھر کیا تمہیں اس روشن چراغ سے بھی اللہ کی قدرت اور ربوبیت کے بارے میں کوئی روشنی نہیں ملتی؟

۱۲ بادلوں کے ذریعہ انسانی آبادی کو وافر پانی مہیا کرنے کا انتظام اور اس کے ذریعہ غلہ اور سبزی کی پیداوار اور گھنے باغوں کا اُگ جانا، جس سے انسان کی رزق رسانی کا سامان ایک تسلسل کے ساتھ ہو رہا ہے، کیا انسان کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی نہیں ہے؟ کیا اس کے پیچھے ایک ایسی ہستی کا ہاتھ دکھائی نہیں دیتا جو اس کی پرورش کا پورا پورا انتظام کر رہی ہے؟

لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ﴿۱۵﴾	۱۵ تاکہ اُگائیں اس کے ذریعہ غلہ اور نباتات۔
وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ﴿۱۶﴾	۱۶ اور گھنے باغ۔
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ﴿۱۷﴾	۱۷ بیشک فیصلہ کا دن ایک مقرر وقت ہے۔ ۱۳
يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾	۱۸ جس دن صور پھونکا جائیگا تو تم آؤ گے فوج در فوج۔ ۱۴
وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾	۱۹ اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔ ۱۵
وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾	۲۰ اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن کر رہ جائیں گے۔ ۱۶
اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾	۲۱ بے شک! جہنم گھات میں ہے۔
لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾	۲۲ سرکشوں کا ٹھکانہ ۔ ۱۷
لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾	۲۳ جس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔ ۱۸
لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾	۲۴ وہاں وہ نہ کسی قسم کی ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ پینے کی چیز کا۔
اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾	۲۵ بجز گرم پانی اور پیپ کے۔
جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾	۲۶ ان کے کرتوتوں کا ٹھیک ٹھیک بدلہ!
اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾	۲۷ وہ حساب کی امید نہ رکھتے تھے۔
وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾	۲۸ ہماری آیتوں کو یکسر جھٹلا دیا تھا۔
وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ﴿۲۹﴾	۲۹ درانحالیکہ ہم نے ہر چیز کو لکھ کر ضبط کر رکھا تھا۔ ۱۹
فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾	۳۰ تو چکھو! اب ہم تمہارے عذاب ہی میں اضافہ کریں گے۔

۱۳؎ یہ ہے وہ بات، جس پر اوپر کے مضمون آیت ۶ تا ۱۶؎ میں استدلال کیا گیا ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ فیصلہ کا دن (Day of Judgement) ایک امر قطعی ہے اور اس کے وقوع کا وقت بھی بالکل مقرر ہے۔ مشرکین مکہ اس کو ماننے سے اس بناء پر انکار کر رہے تھے کہ اس سے انسان کا دوبارہ اٹھایا جانا لازم آتا ہے، جو ان کے نزدیک ایک ناممکن بات تھی۔ چنانچہ وہ کہتے تھے کہ انسان جب مر کر مٹی میں مل گیا تو اسے دوبارہ کس طرح زندہ کیا جا سکتا ہے ؟ وہ اپنی تنگ ذہنیت کی بنا پر اللہ کی قدرت و حکمت کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے عقل کو اپیل کرنے والا انداز اختیار کیا گیا۔ اور فیصلہ کے دن پر اللہ کی قدرت اور اس کی ربوبیت و حکمت سے استدلال کیا گیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ زمین، یہ آسمان اور یہ طرح طرح کی نعمتیں جن سے تمہاری زندگی وابستہ ہے کس بات کی شہادت دے رہی ہیں؟ کیا اس بات کی کہ ان کا خالق نہایت محدود قدرت والا ہے اور اس کے کاموں میں مقصدیت کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں چلتا، اور اس کائنات کے اجزاء بالکل بے ترتیب ہیں اور یہ پورا کارخانہ (Unsystematic) معلوم ہوتا ہے؟

یا یہ کہ آفاق و انفس کے یہ آثار اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ تمہارا خالق زبردست قدرت کا مالک ہے۔ اور نہ صرف زبردست قدرت کا مالک ہے بلکہ ساتھ ہی وہ ربوبیت اور حکمت کی صفات سے بھی منصف ہے۔ اللہ کو ان صفات سے متصف مان لینے کے بعد روز جزا کو مان لینے میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ان صفات کا لازمی تقاضا قرار پاتا ہے کہ روز جزا برپا ہو۔ جب یہ واضح ہوا کہ اللہ زبردست قدرت کا مالک ہے، پھر اس کے لئے مُردہ کو زندہ کرنا نہایت آسان بات ہے۔ اس کے ناممکن ہونے کا کیا سوال؟ اور پھر جو ہستی انسان کی ربوبیت کا سامان اس اہتمام کے ساتھ کر رہی ہو اور جس نے ان گنت نعمتوں سے اسے نوازا ہو وہ اپنی ان نعمتوں کا حساب اس سے کیوں نہ لے گی؟ اور اپنے وفادار بندوں کو انعام کا مستحق اور سرکشوں کو مستحقِ سزا کیوں نہ ٹھہرائے گی؟ اس کی حکمت کا ظہور اس کائنات کی ایک ایک چیز سے ہو رہا ہے۔ اس کا ہر کام دانائی پر مبنی ہے اور منصوبہ بند ہے۔ پھر کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ انسان ہی کی تخلیق بے مقصد ہوئی ہے؟ اسے مر کر مٹی میں مل جانا ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں، نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ماننے والے اور اس سے کفر کرنے والے اس کے اطاعت شعار اور اس کے نافرمان سب برابر ہیں۔ نہ کسی کو انعام ملنا ہے اور نہ کسی کو سزا۔ اللہ کی عدالت کوئی عدالت ہی نہیں جہاں جواب دہی کیلئے حاضری کا سوال ہو۔ کیا اس قسم کی باتیں تمہاری عقل میں سماتی ہیں اور اس کی صفت حکمت سے کوئی مناسبت رکھتی ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جس حکمت کا مُشاہدہ انسان اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں کرتا ہے اس کا یہ تقاضا ہے کہ یوم جزا برپا ہو۔ اس سے قرآن کی اس خبر کی بھی مکمل تائید ہوتی ہے کہ جزا کا ایک دن مقرر ہے۔ اُس روز تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے فرمانروائے کائنات کی عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

۱۴؎ یعنی قیامت کے دن بگل بجتے ہی سارے مُردہ انسان زندہ ہو کر عدالت خداوندی میں حاضر ہونے کے لئے نکل پڑیں گے۔

۱۵؎ عالم بالا کی حقیقتیں آج انسان کی نظروں سے چھپی ہوئی ہیں لیکن قیامت کے دن انسان آسمان کے کھل جانے سے ان کا مشاہدہ کرے گا۔

۱۶؎ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ قیامت کے دن اس دنیا کا نظام بدل جائے گا۔ یہ زمین ایک چٹیل میدان کی شکل اختیار کر لے گی۔ جہاں تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے عدالت برپا کی جائے گی۔ بڑے بڑے پہاڑ فضا میں اڑ رہے ہوں گے اور ان کی جگہ ریت کا میدان ہوگا۔ میدان حشر میں ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس سے قیامت کے دن کی ہولناکی، زمین کی ساخت میں عظیم تبدیلیوں کے رونما ہو جانے اور میدان حشر کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۷؎ خدا کے سرکش بندے دنیا میں خدا سے بے خوف ہو کر زندگی گذارتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لئے عذاب اور خطرہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن قیامت کے دن جہنم اس طرح ظاہر ہوگی جیسے وہ گھات ہی میں تھی۔ اور وہ اس میں ایسے پھنسیں گے کہ پھر کبھی اس سے نکل نہ سکیں گے۔

۱۸؎ یعنی ایک دور کے بعد دوسرا دور۔ اس طرح وہ مسلسل عذاب ہی میں رہیں گے۔ اتنی سخت سزا اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی بندگی کی جگہ اللہ سے سرکشی کا رویہ اختیار کیا۔ اپنے محسنِ حقیقی کی ناشکری کرتے رہے اور روز جزا کو ماننے اور اس کے مطابق ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ لہٰذا جو بیج انہوں نے بویا تھا اسی کے وہ پھل کاٹتے رہیں گے۔

۱۹؎ یعنی ان کے اعمال کا ریکارڈ ہم تیار کر رہے تھے۔ گویا ہر شخص کی زندگی کی مکمل بولتی فلم تیار کی جا رہی تھی، جس میں اقوال و افعال ہی نہیں، نیتوں تک کو ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ اور یہ اس خام خیالی میں مبتلا رہے کہ اپنی من مانی کرنے کے لئے بالکل آزاد ہیں۔ اور ان کے اعمال کا ریکارڈ تیار نہیں کیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ انہیں نہ کوئی ایسا کیمرہ دکھائی دیتا تھا جو ان کی عملی زندگی کی تصویر کھینچ رہا ہو اور نہ کوئی ٹیپ ریکارڈ جو ان کی باتوں کے کیسٹ تیار کر رہا ہو۔

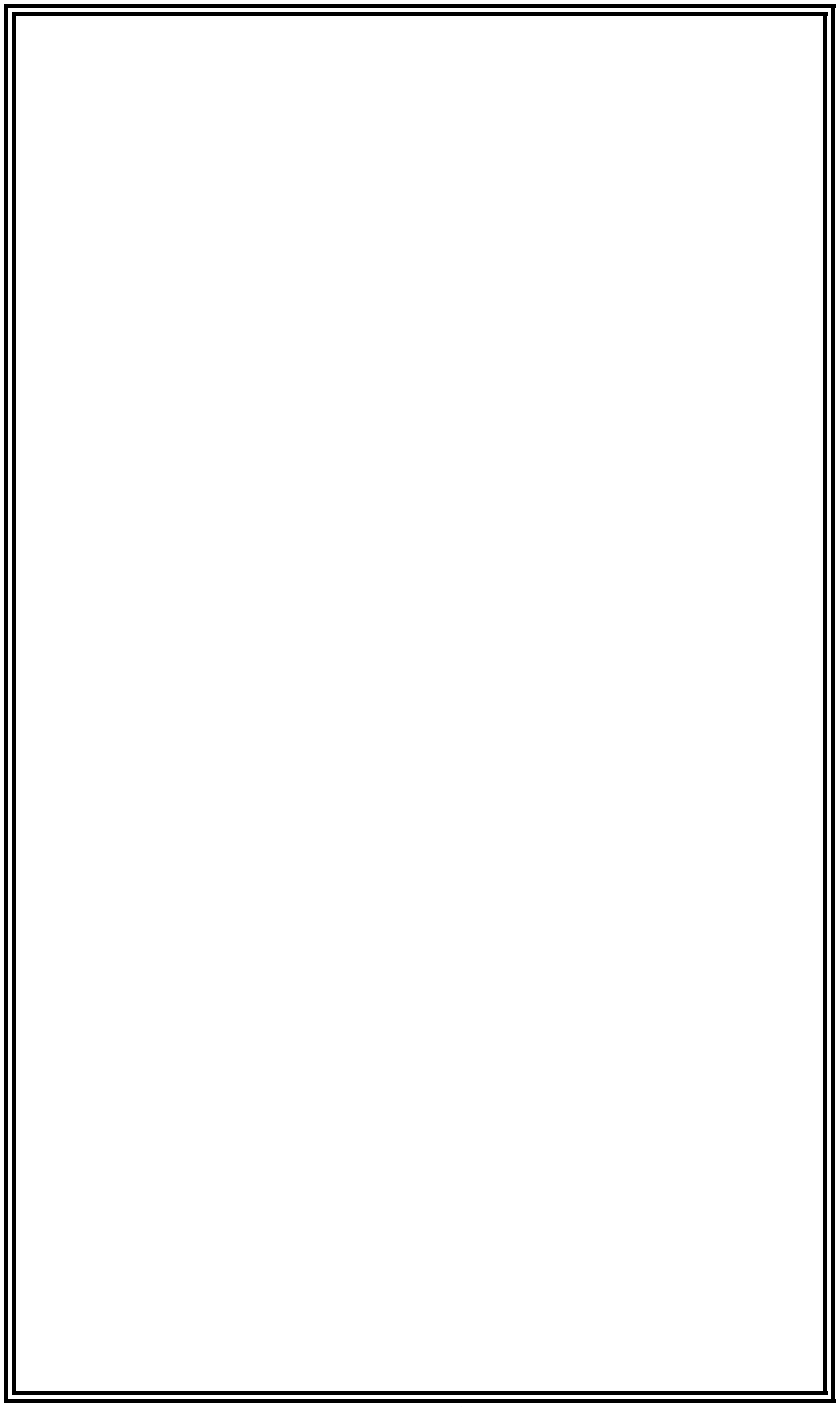

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾	۳۱ یقیناً متقیوں ۲۰ کیلئے کامیابی ہے۔
حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾	۳۲ باغ اور انگور۔
وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾	۳۳ اور نوخیز ہمسن لڑکیاں۔
وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾	۳۴ اور چھلکتے جام۔ ۲۱
لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾	۳۵ وہاں وہ نہ کوئی لغو بات سنیں گے اور نہ جھوٹی بات۔ ۲۲
جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾	۳۶ یہ تمہارے رب کی طرف سے جزا ہوگی اور کافی انعام۔ ۲۳
رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾	۳۷ اس کی طرف سے، جو آسمانوں اور زمین اور اس کے درمیان کی ساری چیزوں کا مالک ہے۔ رحمٰن، جس سے بات کرنے کا کسی کو یارا نہیں۔ ۲۴
يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾	۳۸ جس دن ۲۵ روح (الامین) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی بات نہ کر سکے گا سوائے اس کے، جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ بالکل درست بات کہے گا۔ ۲۶
ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾	۳۹ یہ دن برحق ہے ۲۷ تو جو چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنالے۔
اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكَافِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾	۴۰ ہم نے تمہیں ایک ایسے عذاب سے آگاہ کر دیا ہے جو قریب آ لگا ہے۔ ۲۸ جس دن آدمی دیکھ لے گا کہ اس نے آگے کیلئے کیا کیا ہے؟ ۲۹ اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا! ۳۰

۲۰؎ یہاں متقین کا لفظ طاغین (سرکش) کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے۔یعنی وہ لوگ جو اللہ اور یوم جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اس کی آیات کو مانتے ہیں اور اُسی طور سے زندگی گذارتے ہیں کہ انہیں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔

۲۱؎ مراد شراب طہور کے جام ہیں۔

۲۲؎ یعنی جنت کا ماحول نہایت پاکیزہ ہوگا۔سوسائٹی بھی پاک اور کھانے پینے کی تمام اشیاء بھی پاک۔یہاں تک کہ وہاں کی شراب بھی دنیوی شراب کی طرح نہیں ہوگی کہ آدمی پی کر بکواس کرنے لگے۔بلکہ وہ نہایت پاکیزہ ہوگی اور اس سے ایسے سرور کی کیفیت پیدا ہوگی جس میں بیہودگی کا کوئی عنصر نہ ہوگا۔اسی طرح وہاں دوسری لغویات اور تماشے بھی نہیں ہونگے۔اور نہ جھوٹ وافترا پردازیوں کا وجود ہوگا۔بلکہ وہ ایک سنجیدہ اور پُرمسرت ماحول ہوگا جہاں ہر طرف اخلاق اور شرافت کے نمونے ہی دکھائی دیں گے۔

۲۳؎ متقیوں کو ان کے نیک اعمال کی صرف جزا دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا جائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی طرف سے کافی انعامات سے بھی نوازے گا۔

۲۴؎ یعنی قیامت کے دن جب خداوندِ کائنات اپنی عدالت برپا کرے گا، تو اس عدالت کے رعب کا عالم یہ ہوگا کہ کوئی اس کے حضور زبان کھولنے کی جرأت نہ کرسکے گا۔اس سے مشرکین کے اس خیال کی تردید ہوتی ہے کہ ان کے دیوی دیوتا جو چاہیں گے خدا سے منوا سکیں گے۔

۲۵؎ روح سے مراد روح الامین یعنی جبریل ہیں۔فرشتوں کے سردار ہونے کی حیثیت سے ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔اور بتلانا یہ مقصود ہے کہ روز قیامت جب اللہ عدالت برپا فرمائے گا تو فرشتے حتیٰ کہ جبریل بھی صف بستہ کھڑے ہوں گے۔سب پر ہیبت طاری ہوگی اور کسی کی یہ مجال نہ ہوگی کہ بلا اجازت بول سکے۔

۲۶؎ مقصود سفارش کے غلط تصور کی تردید ہے، جس میں اہل مذاہب گرفتار ہیں۔جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر قیامت آ ہی گئی اور اعمال کی جوابدہی کے لئے خدا کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا، تو یہ دیوی دیوتا جن کی وہ پوجا کرتے رہے ہیں، ہمارے سفارشی بن کر کھڑے ہوں گے اور ہمیں عذاب سے نجات دلوا کے رہیں گے۔لیکن قرآن بتلاتا ہے کہ اول تو کسی ''دیوی دیوتا'' کا آخرت میں وجود ہی نہیں ہوگا۔سب اللہ کے عاجز بندے کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔اور سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے۔اور عدالتِ خداوندی کے رعب کا عالم یہ ہوگا کہ مقرب ترین فرشتے بات کرنے کی جرأت نہ کریں گے۔اگر سفارش کے لئے کوئی زبان کھول سکے گا تو وہی جس کو اللہ اجازت دے۔اور اس صورت میں وہ ٹھیک اور درست بات ہی کہے گا۔اور مشرکین کے لئے سفارش کوئی بھی نہیں کرسکے گا۔کیوں کہ ایسے لوگوں کے حق میں سفارش کرنا اللہ کے اس فیصلے کے بنا پر کہ جو ناقابل معافی جرم کے مرتکب ہی ہوئے درست بات نہ ہوگی۔اللہ کی اجازت کے بعد کسی کی سفارش کیلئے کوئی زبان کھولے گا بھی، تو صرف ایسے گنہگار بندوں کے لئے، جو اہل ایمان ہوں اور جن کے حق میں اللہ سفارش قبول کرنا پسند فرمائے۔

لہٰذا کوئی شخص اس خام خیالی میں مبتلا نہ رہے کہ وہ خواہ شرک وکفر کا مرتکب کیوں نہ ہوا ہو، اور خواہ اس نے ایک سرکش کی حیثیت سے زندگی کیوں نہ گذاری ہو، کسی نہ کسی کے طفیل اس کی نجات ہو جائے گی۔

۲۷ یعنی جزا کا دن قیاس واٹکل کی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے، جس کی خبر پوری صداقت کے ساتھ تمہیں دی جارہی ہے۔

۲۸ قریب اس اعتبار سے کہ دنیا کی بیشتر عمر گذر چکی ہے۔ اب قیامت کے آنے میں جو وقت باقی رہ گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ ویسے بھی وقت ایک اضافی چیز ہے۔ قیامت کے دن جب کہ زمان ومکان کے پیمانے بدل جائیں گے، انسان نے جو وقت دنیا میں گذارا تھا اسے بہت تھوڑا معلوم ہوگا۔

۲۹ انسان دنیا میں اچھے بُرے جو کام بھی کرتا ہے، اس کا لازماً ایک اثر اور ایک نتیجہ ہے جو دوسری زندگی (آخرت) میں مرتب ہوگا۔ اس حقیقت کو مَا قَدَّمَت یَدَاہُ (جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیوں کہ انسان کا ہر عمل اس کے اپنے ہاتھوں بیج بُونے کے مترادف ہے، جس کے پھل وہ آنے والی زندگی میں کاٹے گا۔

۳۰ یعنی جو لوگ روز جزا کو ماننے اور اس کی بنیاد پر ذمہ دارانہ زندگی گذارنے سے انکار کررہے ہیں وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ یوم جزا برپا ہوگا اور انسان اپنے کرتُوت اپنے سامنے دیکھ لے گا۔ تو ایسے لوگوں کے حصہ میں سوائے حسرت اور پچھتاوے کے کچھ نہیں آئے گا۔ اس وقت ہر منکرِ آخرت کو احساس ہوگا کہ کاش وہ مر کر مٹی میں مل گیا ہوتا اور حساب دینے کی نوبت ہی نہ آتی!

﴿۷۹﴾سورۃ النّازعات

نام سورہ کا آغاز والنازعات سے ہوا ہے جس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام النازعات رکھا گیا ہے۔ یہ لفظ ہواؤں کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورہ نبا کے متصلاً بعد نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون اس سورہ کا موضوع قیامت کا وقوع اور جزائے عمل کے لئے انسان کو دوبارہ اٹھایا جانا ہے۔ پس منظر میں خاص طور سے وہ سرکش اور فرعون صفت لوگ ہیں جو اپنی دنیا بنانے میں مست رہتے ہیں۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں روز جزا پر ہواؤں کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۶ تا ۱۴ میں حادثۂ قیامت کی تصویر پیش کرتے ہوئے منکرین کے اعتراض کا ذکر کیا گیا ہے۔

آیت ۱۵ تا ۲۶ میں حضرت موسیٰ کا مختصراً بیان ہوا ہے کہ کس طرح فرعون ان کی دعوت کو رد کرنے کے نتیجہ میں عبرتناک انجام سے دوچار ہوا۔ یہ گویا مکافاتِ عمل پر تاریخ سے استشہاد ہے۔

آیت ۲۷ تا ۳۳ میں انسان کی دوبارہ پیدائش کے ممکن ہونے پر اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت سے استدلال کیا گیا ہے۔

آیت ۳۴ تا ۴۱ میں واضح کیا گیا ہے کہ جس دن قیامت کا حادثہ پیش آئے گا، سرکشوں اور دنیا پرستوں کا انجام کیسا برا ہوگا۔ اور اللہ سے ڈرنے والوں کا انجام کتنا خوشگوار ہوگا۔

آیت ۴۲ تا ۴۶ میں منکرین قیامت کے اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ آخر قیامت آئے گی کب؟

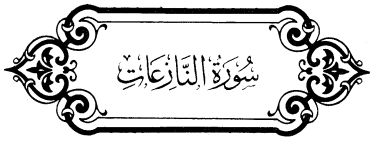

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۷۹)سورۃ النازعات

آیات ۴۶

اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾	۱ قسم ہے ۱ ان (ہواؤں) کی، جو (بادلوں کو) شدت کے ساتھ گھسیٹتی ہیں۔
وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾	۲ اور ان کی جو نرم نرم چلتی ہیں۔
وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾	۳ اور ان کی جو سبک رفتار ہیں۔ ۲
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾	۴ پھر جو (تعمیلِ حکم میں) بازی لے جاتی ہیں۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ﴿۵﴾	۵ اور ایک کام (بارش) کا انتظام کرتی ہیں۔ ۳
يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾	۶ جس دن زلزلہ کا شدید جھٹکا لگے گا۔
تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۭ﴿۷﴾	۷ اس کے پیچھے دوسرا جھٹکا آئے گا۔ ۴
قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾	۸ کتنے دل اس دن دھڑک رہے ہوں گے۔ ۵
اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾	۹ نگاہیں ان کی پست ہوں گی۔
يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۭ﴿۱۰﴾	۱۰ کہتے ہیں کیا ہم پھر پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟ ۶
ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۭ﴿۱۱﴾	۱۱ کیا اس وقت، جب کہ ہماری ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہوں گی؟ ۷
قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾	۱۲ کہتے ہیں یہ لوٹنا بڑے خسارہ کا ہوگا۔ ۸
فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾	۱۳ وہ تو بس ایک ڈانٹ ہوگی۔ ۹
فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾	۱۴ کہ وہ یکا یک میدان میں آموجود ہوں گے۔ ۱۰
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿۱۵﴾	۱۵ کیا تمہیں موسیٰ کے واقعہ کی خبر پہنچی ہے؟ ۱۱

۱ ابتدائی پانچ آیتوں میں جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے، ان کی صرف صفات بیان کی گئی ہیں ۔موصوف کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں ہوا ہے۔اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی حدیث منقول ہے۔رہے تفسیری اقوال تو وہ متعدد ہیں۔بعض نے فرشتے مراد لئے ہیں اور بعض نے ستارے۔کسی کے نزدیک گھوڑے مراد ہیں اور کسی کے نزدیک بادل۔ان میں سے زیادہ مشہور قول جس کو عام طور سے مفسرین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ ان سے فرشتے مراد ہیں۔ہم نے درج ذیل وجوہ کی بناہ پر ہوائیں مراد لی ہیں۔

اولاً :۔قرآن کریم میں جہاں اس طرح کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان کی نوعیت استدلال یا استشہاد کی ہے۔ یہاں انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے پر استدلال مقصود ہے جو ظاہر ہے محسوس چیز ہی سے ہوسکتا ہے۔اور ہوائیں ایک محسوس چیز ہیں، جب کہ فرشتے غیر محسوس۔

ثانیاً:۔بیان کردہ صفات فرشتوں اور ستاروں وغیرہ کے مقابلہ میں ہواؤں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہیں۔

ثالثاً :۔ عربی میں ''نزائع'' خاص قسم کی ہواؤں کو کہتے ہیں۔(لسان العرب لفظ نزع) نازعات اس سے ملتا جلتا لفظ ہے۔قرآن میں لفظ " تَنزِعُ " ہوا کے لئے استعمال ہوا ہے۔تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُنْقَعِرٍ (القمر آیت نمبر ۲۰) ''وہ ہوا لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی جیسے جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے''۔

رابعاً :۔قرآن میں دوسرے مقامات پر ہواؤں کی قسم قیامت اور روز جزا پر استدلال کے طور پر کھائی گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ ذاریات اور سورہ مرسلات) اس لئے یہاں بھی جب کہ مدلول روز جزا ہے، ہوائیں مراد لینا قرآن کے بیان سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

خامساً:۔ یہاں صفات مؤنث استعمال ہوئی ہیں اور ہواؤں کے لئے مؤنث صفات کا استعمال عربی میں معروف ہے۔

۲ '' السَّابِحَات '' (سبک رفتار) اصل میں گھوڑوں کا وصف ہے۔ یہاں ہواؤں کو گھوڑوں سے ان کے تیز رفتار ہونے کی بنا پر تشبیہہ دی گئی ہے۔گویا بادل ہواؤں کے دوش پر سوار ہیں۔اور وہ بگ ٹٹ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

۳ ان آیات میں ہواؤں کی کیفیات اور ان کے تصرفات بیان کئے گئے ہیں، جس سے بارش کا نظام وجود میں آتا ہے۔یہ ہوائیں ہی ہیں جو بادلوں کو ہزاروں میل سے گھسیٹ کر لاتی ہیں۔اور جب کسی علاقہ میں بادل جمع ہو جاتے ہیں تو ہوائیں نرم نرم چلنے لگتی ہیں، جس سے فضا خوشگوار ہو جاتی ہے۔

یہ ہوائیں جو لاکھوں اور کروڑوں لیٹر پانی کا وزن اٹھائے ہوئے چلتی ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سبک رفتار گھوڑے، جو کسی مہم کے لئے دوڑا دئے گئے ہوں۔اور جس طرح بعض گھوڑے بعض پر سبقت لے جاتے ہیں اسی طرح بعض ہوائیں بعض پر بازی لے جاتی ہیں۔فضا میں ہواؤں کی اس یورش کو سابقات سے تعبیر کیا گیا ہے۔بارش کا یہ انتظام ہواؤں ہی کے ذریعہ عمل میں آتا ہے اس لئے مجازاً ان کو، اَلْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا کہا گیا ہے۔جس طرح سورہ ذاریات میں انہیں اَلْمُقَسِّمَاتِ اَمْرًا (ایک کام یعنی بارش کو تقسیم کرنے والی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ان ہواؤں کو شہادت میں پیش کر کے جس بات پر استدلال کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ روز جزا کا پیش آنا اور انسانوں کا دوبارہ اٹھایا جانا برحق ہے۔ استدلال کی نوعیت یہ ہے کہ ہواؤں کا یہ نظام، اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت، اس کی ربوبیت اور اس کی عظمت وجلال کی زبردست نشانیاں پیش کرتا ہے اور ان پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ بارانی ہوائیں جب چلتی ہیں تو وہ اپنی مختلف کیفیات کے ذریعہ غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو چونکا دینے کا سامان کرتی ہیں، مثلاً بادلوں کو گھسیٹنے کا عمل، جس کے ساتھ کڑک اور بجلی بھی ہوتی ہے اور جو فضا کو خوشگوار بنائے ہوئے، نرم نرم چلتی ہیں اور کبھی سبک رفتار ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ہواؤں کے مختلف گروپ جب یورش کرتے ہیں تو حکم الٰہی کی تعمیل وتنفیذ میں ان کے بازی لے جانے کا وصف بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ رہا تدبیر امر کا پہلو تو یہ ہوائیں کسی علاقہ میں ابر کرم برساتی ہیں اور کسی علاقہ کو بارش سے محروم رکھ کر یہ بادل آگے نکل جاتے ہیں۔ کہیں یہ طوفان لاتی ہیں اور درختوں اور مکانوں کو اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ تو کہیں خوشگوار چلتی ہیں۔ کبھی گرم لُو کی صورت اختیار کر جاتی ہیں تو کبھی نسیم سحر کے روپ میں ظاہر ہوتی ہیں۔ پس یہ ہوائیں یوں ہی نہیں چلتیں بلکہ دلوں کو مس کرتے ہوئے چلتی ہیں۔ اور ہر اُس شخص کے اندر جو غور و فکر کرتا ہے اور حقیقت کو بے لاگ طور پر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے، یہ یقین پیدا کرتی ہیں کہ اس کائنات (Univers) کا خالق زبردست قدرت کا مالک ہے اور وہ نہایت حکمت کے ساتھ اس پر فرمانروائی کر رہا ہے، جس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس دنیا کی بھی کوئی غایت اور اس کا کوئی مقصد ہو اور انسان کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ ملے۔ گویا ہواؤں کا یہ نظام جزائے عمل کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اور انسانی کی دوسری پیدائش کو نہ صرف ممکن بلکہ اس کی حکمت کا مقتضیٰ قرار دیتا ہے، جو اس نظام میں کارفرما ہے۔ غرضیکہ ہواؤں کے تصرف اور ان کی کیفیات میں قانون جزا کی نشانیاں بالکل نمایاں ہیں۔ اور ان کی شہادت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو ہستی بارانی ہواؤں کے ذریعہ مُردہ زمین کو زندہ کرتی ہے وہ یقیناً مُردوں کو زندہ کر دینے والی ''ہوائیں'' بھی چلا سکتا ہے۔ اور جس طرح ہوائیں سمندر سے پانی کے قطروں کو بخارات کی شکل میں آسمان پر پھیلا دیتی ہیں اور پھر ان منتشر بخارات کو سمیٹ کر پانی کی شکل میں برسا دیتی ہیں۔ اسی طرح مُردہ انسان کے منتشر اجزاء کو سمیٹ کر دوبارہ زندہ کرنے کا عمل بھی ممکن ہے۔ اور جب اس کی خبر خود اللہ تعالیٰ دے رہا ہے تو پھر اس میں شک کا کیا سوال؟ درحقیقت قیامت سے انکار خدا کی صفتِ قدرت و حکمت سے انکار کرنے کے ہم معنیٰ ہے۔

۴ پہلا جھٹکا وہ ہے جب زمین کا موجودہ نظام درہم برہم ہوگا اور تمام انسان مر جائیں گے۔ اور دوسرا جھٹکا وہ ہے جب تمام مُردے زندہ ہو کر زمین سے نکل آئیں گے۔ اس وقت زمین کی ساخت بدل چکی ہوگی اور اسے ایک نئے نظام کے ساتھ قائم کر دیا گیا ہوگا۔

۵ دل قیامت کی ہولناکی اور بازپرس کے ڈر سے دھڑک رہے ہوں گے۔ یہ حال کافروں اور فاسقوں کا ہوگا۔ رہے مومنین صالحین تو انہیں کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔

۶ یعنی کیا مرنے کے بعد پھر ہمیں زندہ کیا جائے گا؟

۷ یہ تھا منکرینِ قیامت کا اشکال، کہ جب انسان کا مادی وجود نہیں رہے گا تو پھر وہ کس طرح وجود میں آ سکے گا۔ اور جب اس کا وجود ہی محال ہے تو حشر اور جزاء وسزا کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ ان کا یہ اشکال بہ آسانی رفع ہوسکتا تھا اگر وہ صاف ذہن (Unprejudiced mind) سے اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرتے، جس کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ یہ مطالعہ خالق کائنات کے بارے میں انہیں صحیح معرفت عطا کرتا۔ اور انہیں محسوس ہوتا کہ زمین سے لے کر آسمان تک اور ہواؤں سے لے کر بارش تک کائنات کی ہر چیز قرآن کے بیان کی تصدیق کر رہی ہیں۔

۸ اس طرح وہ آخرت کا مذاق اڑاتے تھے۔ کہ اگر واقعی ہمیں دوسری زندگی عطا ہوئی، جس کی اطلاع یہ نبی دے رہا ہے تو وہ زندگی ہمارے لئے بڑی خسارہ کی ہوگی۔ کیوں کہ ہم اس کا انکار کرتے رہے اور اس کے لئے ہم نے کوئی تیاری نہیں کی۔

۹ یعنی انسانوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو کوئی خاص تیاری نہیں کرنا پڑے گی، بلکہ اس کا صرف ایک حکم اس کے لئے کافی ہوگا۔ اور یہ حکم ڈانٹ کی شکل میں ہوگا، جسے پوری زمین پر بیک وقت نشر کیا جائے گا۔

۱۰ یعنی اسی گوشت پوست کے ساتھ انسان سطح زمین پر آموجود ہوگا۔ بالفاظ دیگر انسان مرنے کے بعد نہ جانور کا روپ دھارے گا اور نہ کسی اور مخلوق کا۔ بلکہ قیامت کے دن وہ اپنی پہلی حالت ہی میں قبر سے نکل کھڑا ہوگا۔

۱۱ یہ تاریخ سے استشہاد ہے کہ رسولوں کو جھٹلانے اور سرکشی اور بغاوت کا رویہ اختیار کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی عذاب کا کوڑا برساتا رہا ہے۔ جس کی نمایاں مثال فرعون اور اس کا لشکر ہے، جو تباہی سے دوچار ہوا۔ اس میں جزائے عمل کے اس قانون کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے جو قیامت کے دن حرکت میں آئے گا۔

اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۶﴾	۱۶ جبکہ اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا۔ ۱۲
اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾	۱۷ فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہوگیا ہے۔ ۱۳
فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾	۱۸ اور اس سے کہو، کیا تو چاہتا ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے۔ ۱۴
وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾	۱۹ اور میں تجھے تیرے رب کی راہ دکھاؤں کہ تو اس سے ڈرنے لگے۔ ۱۵
فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾	۲۰ پھر (موسیٰ نے) اس کو بڑی نشانی دکھائی۔ ۱۶
فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿۲۱﴾	۲۱ مگر اس نے جھٹلایا اور نہ مانا۔
ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾	۲۲ پھر پلٹا اور مخالفت میں سرگرم ہوگیا۔ ۱۷
فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾	۲۳ اور لوگوں کو جمع کر کے اعلان کیا۔
فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾	۲۴ اور کہا، میں ہوں تمہارا سب سے بڑا رب۔ ۱۸
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾	۲۵ بالآخر اللہ نے اُسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿۲۶﴾	۲۶ بے شک اس میں بڑی عبرت ہے، ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے۔ ۱۹
ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾	۲۷ کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ دشوار ہے یا آسمان کی؟ اس نے اس کو بنایا۔ ۲۰
رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾	۲۸ اس کی چھت بلند کی۔ ۲۱ اور اس کو درست اور ہموار کیا۔ ۲۲
وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾	۲۹ اس کی رات ڈھانک دی اور اس کا دن نکالا۔ ۲۳

۱۲؎ ''طُویٰ'' اس وادی کا نام ہے جو کوہ سینا میں ہے۔ اُسے مقدس اس لئے فرمایا کہ اللہ نے یہاں تجلی فرمائی تھی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا تھا۔

۱۳؎ فرعون (Pharoah) مصر کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے۔ اور جس فرعون سے حضرت موسیٰ کا سابقہ پیش آیا تھا وہ تقریباً ۱۴۰۰ قبل مسیح مصر میں حکمراں تھا۔ فرعون کی سرکشی یہ تھی کہ وہ اپنے کو خدا کا بندہ سمجھنے کے بجائے، آزاد اور خود مختار سمجھتا تھا۔ اپنے رب اعلیٰ ہونے کا مدعی تھا۔ اور حکومت و فرمانروائی کے سارے کام اللہ سے کفر اور اس سے بغاوت کی بنیاد پر انجام دیتا تھا۔ اس نے اپنی خودسری کی بنا پر بندگان خدا کے ساتھ ظلم و جور کا رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ اس وقت کی مسلم قوم ''بنی اسرائیل'' پر سخت ظلم ڈھا رہا تھا۔

۱۴؎ پاکیزگی اختیار کرنے کا مطلب اسلام قبول کرنا ہے، جو انسان کو کفر و شرک کی گندگیوں سے پاک کرتا اور ایمان اور حُسن عمل سے سنوارتا ہے۔

۱۵؎ عقائد و اعمال کی پاکیزگی کا انحصار خدا خوفی پر ہے۔ اور خدا خوفی اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب کہ انسان کو خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے۔ ''رب کی راہ دکھاؤں'' سے اشارہ اسی معرفت الٰہی (خدا کی پہچان) کی طرف ہے۔

۱۶؎ بڑی نشانی سے مراد لاٹھی کے سانپ بن جانے کا معجزہ ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا اور جو اس بات کی واضح علامت تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

۱۷؎ تاکہ لوگ حضرت موسیٰ پر ایمان نہ لائیں اور ان کی دعوت قبول نہ کریں۔

۱۸؎ قدیم زمانہ کے بادشاہ صرف حکومت ہی کے دعویدار نہیں ہوتے تھے بلکہ رعایا سے اپنی پوجا بھی کراتے تھے۔ تاکہ لوگوں کو ان کے ساتھ گرویدگی ہو، ان کی حکومت مضبوط ہو، اور وہ پوری ''شانِ خدائی'' کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ اپنے اس تقدس کو منوانے کے لئے وہ اپنا رشتہ ستاروں اور دیوی دیوتاؤں سے بھی جوڑتے تھے۔ اور ان کے اوتار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ فرعون بھی اپنی پرستش لوگوں سے کراتا تھا۔ اور اس مفہوم میں اپنے رب اعلیٰ ہونے کا مدعی تھا۔ اس وقت مصر میں بت پرستی رائج تھی۔ اور فرعون نے اپنے علاوہ کسی بت کی پرستش کو قانوناً ممنوع نہیں ٹھہرایا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا اپنی اُلوہیت اور اپنے رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت توحید کے مقابلہ میں تھا۔ وہ دوسرے خداؤں کی جو نفی کرتا تھا وہ محض موسیٰ علیہ السلام کو زچ کرنے کیلئے تھی۔

فرعون کے اس دعوے کا مطلب یہ لینا صحیح نہ ہوگا، کہ وہ خالقِ کائنات ہونے کا مدعی تھا۔ کیوں کہ یہ دعویٰ تو کوئی احمق ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح اس کا یہ مطلب لینا بھی صحیح نہ ہوگا کہ وہ سیاسی معنیٰ میں اپنے آپ کو الٰہ اور رب اعلیٰ کہتا تھا۔ اگر فرعون کا یہ دعویٰ محض سیاسی معنیٰ میں ہوتا، تو وہ لوگوں سے یہ نہ کہتا کہ ''اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ'' (مجھے اندیشہ ہے کہ موسیٰ تمہارا دین بدل نہ ڈالیں۔ المومن: ۲۶) کیونکہ محض سیاسی حاکمیت کا دعویٰ کرنے والے شخص کو اس سے کیا مطلب کہ لوگوں کا مذہب برقرار رہتا ہے یا تبدیل ہو جاتا ہے؟ اسی طرح فرعون حضرت موسیٰ سے یہ بھی

نہ کہتا کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَ نَا (کیا تو اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اپنے آبائی مذہب سے ہٹادے؟ یونس: ۷۸)

۱۹؎ یعنی جن لوگوں کے اندر خدا کا کچھ خوف ہے ان کے لئے اس واقعہ میں بڑا سبق ہے۔ سبق اس بات کا کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے، بلکہ اللہ اپنے قانون عدل کے ساتھ اس پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ فرعون جیسے جابر پر شکوہ بادشاہ پر بھی اس کا تازیانہ عبرت برسا ہے۔ اس لئے نافرمانوں کو اس دنیا میں بظاہر جو ڈھیل ملتی ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں کہ انسان کو اللہ کے حضور اپنے طرز عمل کے سلسلہ میں جوابدہی کرنا نہیں ہے۔ اور نہ ہی قانونِ مکافاتِ عمل کی کوئی حقیقت ہے۔

۲۰؎ یعنی آسمان کی تخلیق جو بے شمار ستاروں، محیر العقول کہکشاؤں، عظیم الشان سیاروں اور زبردست نظام شمسی پر مشتمل ہے۔ اور جن کے درمیان کمال درجہ کا نظم پایا جاتا ہے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے لئے اس عظیم الشان عالم کی تخلیق آسان ہوئی۔ تو پھر انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لئے کیوں مشکل ہو؟ کیا اتنی واضح بات بھی تمہاری عقل میں نہیں سماتی؟

۲۱؎ آسمان کی بلندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض ستارے اتنی دوری پر ہیں کہ ان کی روشنی زمین پر پہنچنے میں کئی نوری سال لگ جاتے ہیں۔

۲۲؎ یعنی آسمان کا صرف مادہ پیدا کر کے نہیں چھوڑا، بلکہ اس کا مادہ پیدا کرنے کے بعد اس سے ایک عظیم الشان کائنات تشکیل دی، اسے باہم مربوط کیا، اور ایسا آراستہ کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ عالم بالا ایک سجی سجائی اور پر رونق بزم ہے، جو ہر دیکھنے والے کو غور و فکر کی دعوت دے رہی ہے۔

۲۳؎ دن اور رات کو آسمان کی طرف منسوب کرنا اس اعتبار سے ہے کہ انسان کو رات اور دن کے آثار آسمان پر ظاہر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

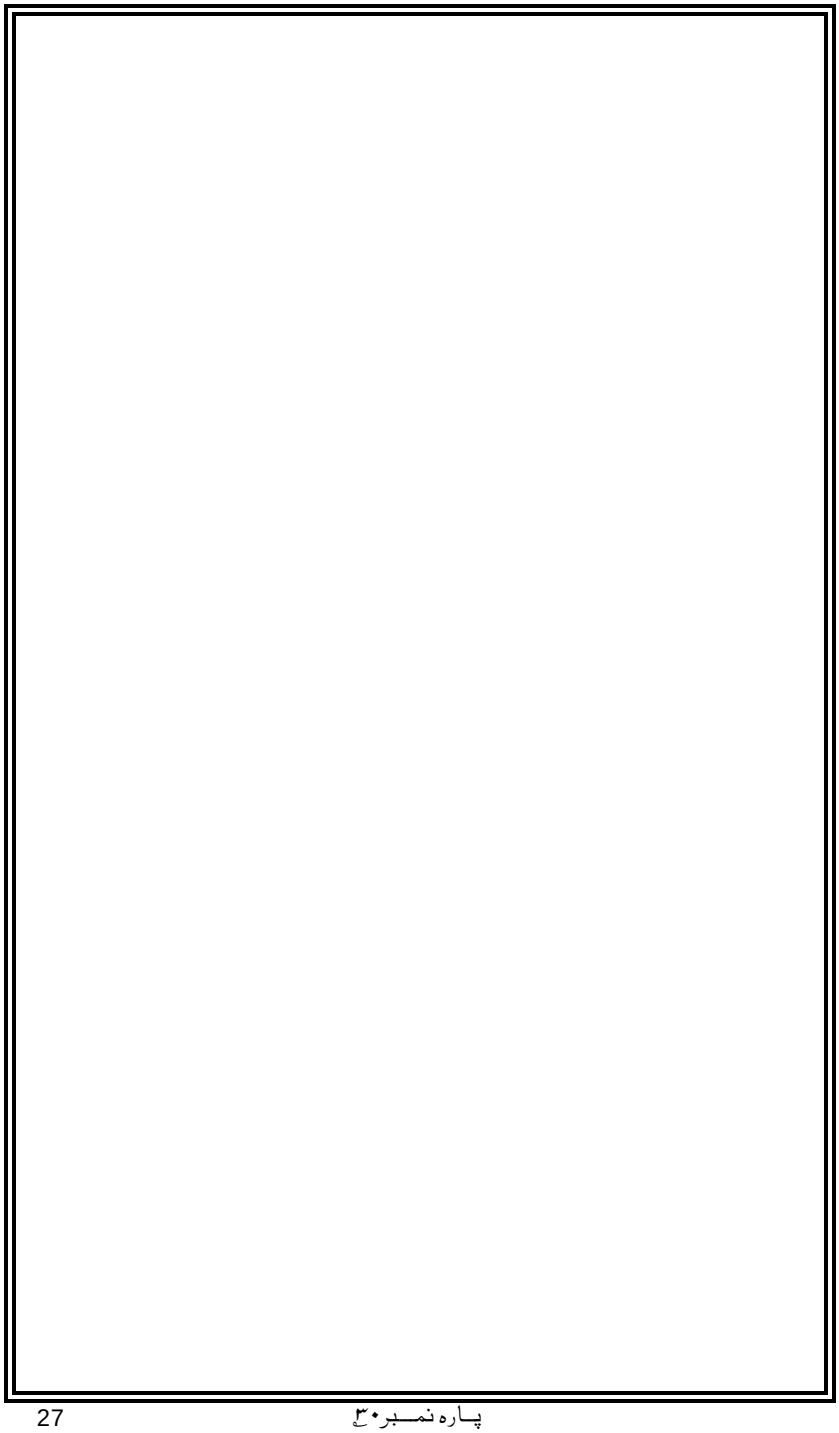

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾	۳۰ اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ ۲۴
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾	۳۱ اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔
وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾	۳۲ اور پہاڑ اس میں گاڑ دیئے۔
مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾	۳۳ تاکہ تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی زندگی کا سامان ہو۔ ۲۵
فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿۳۴﴾	۳۴ پھر جب وہ عظیم ہنگامہ برپا ہوگا۔ ۲۶
يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾	۳۵ جس دن انسان اپنے کئے کو یاد کرے گا۔ ۲۷
وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿۳۶﴾	۳۶ اور دوزخ ہر دیکھنے والے کے لئے بے نقاب کردی جائے گی۔
فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾	۳۷ تو جس نے سرکشی کی ہوگی۔ ۲۸
وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾	۳۸ اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ہوگی۔ ۲۹
فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِىَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾	۳۹ دوزخ ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔
وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿۴۰﴾	۴۰ البتہ جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا ہوگا ۳۰ اور اپنے نفس کو بُری خواہشات سے روکا ہوگا۔
فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾	۴۱ جنت اس کا ٹھکانہ ہوگی۔
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿۴۲﴾	۴۲ (اے نبی!) یہ لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ گھڑی کب آ ٹھہرے گی؟
فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿۴۳﴾	۴۳ اس کا وقت بتانے سے تمہیں کیا واسطہ ۔ ۳۱

۲۴؎ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے آسمان کو پیدا کیا اور اسکے بعد زمین کو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آسمان کے علاوہ زمین کو بھی پیدا کیا اور اسے بچھایا۔ آسمان کے کمالات اور زمین کی نعمتیں دونوں لائقِ غور ہیں۔

۲۵؎ زمین کا یہ مربّیانہ اور حکیمانہ نظام ایک عظیم منصوبہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور قرآن اس منصوبہ کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ حیاتِ بعدالموت اور جزائے عمل ہے۔

۲۶؎ یعنی قیامت، جو اس کائنات کا سب سے بڑا ہنگامہ ہے۔

۲۷؎ انسان جو کچھ اس دنیا میں کرتا ہے وہ سب اس کے ذہن کے پردوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنی زندگی کے گذشتہ سالہا سال کے واقعات اپنے حافظہ کی مدد سے یاد کرتا ہے۔ یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے اعمال کا ریکارڈ خود انسان کا ذہن تیار کر رہا ہے۔ قیامت کے دن اس کا حافظہ اتنا تیز ہوگا کہ اس کے اعمال کے سارے نقوش اس کے ذہن پر ابھر آئیں گے۔

۲۸؎ یعنی خدا کا وفادار بندہ بن کر رہنے کے بجائے کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کیا ہوگا۔ اوپر فرعون کی سرکشی کی مثال گذر چکی۔

۲۹؎ یعنی آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو مقصود بنایا ہوگا اور اس کے مفاد کو مقدم رکھا ہوگا۔

۳۰؎ یعنی جو دنیا میں اس تصور سے کانپتے رہے کہ اللہ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ ظاہر ہے جس کے اندر جوابدہی کا یہ تصور ہوگا، وہ اللہ کے وفادار بندے ہی کی حیثیت سے زندگی گذارے گا۔

۳۱؎ یعنی رسول کو قیامت کا وقت بتانے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہے، بلکہ اسے متنبہ کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ قیامت تو اپنے وقت پر آ کر رہے گی۔ جس طرح موت کہ اپنے وقت پر آ کر رہتی ہے۔ گو انسان کو اس کا وقت پہلے سے معلوم نہیں ہوتا۔

اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿۴۴﴾	۴۴ اس کا علم تو تمہارے رب ہی کو ہے۔
اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿۴۵﴾	۴۵ تمہارا کام صرف ان لوگوں کو خبردار کرنا ہے جو اس سے ڈریں۔
كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿۴۶﴾	۴۶ جس روز وہ اسے دیکھ لیں گے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ وہ (دنیا میں) ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں ٹھہرے تھے۔ ۳۲

۳۲ یعنی اس وقت وہ قیامت کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔لیکن جب آئے گی تو انہیں محسوس ہوگا کہ بہت جلد آ گئی۔اور انہیں دنیا میں جو مہلت ملی تھی وہ بہت تھوڑی تھی۔ وقت ایک اضافی چیز ہے۔گھنٹوں کے مقابلہ میں منٹ وقت کا نہایت قلیل حصہ معلوم ہوتا ہے۔اسی طرح دنوں کے مقابلہ میں گھنٹے اور مہینوں اور سالوں کے مقابلہ میں دن۔قیامت کے دن جب زمان ومکان بدل جائیں گے۔اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار سال کا ہوگا۔تو جو وقت انسان نے دنیا میں گذارا تھا، وہ اسے وہاں کے زمان کی نسبت سے بہت تھوڑا معلوم ہوگا۔اور اس وقت یہ احساس ابھرے گا کہ کاش اپنے یہ قیمتی لمحات اپنی آخرت بنانے میں صرف کئے ہوتے!

(۸۰) سورۂ عبس

نام سورہ کا آغاز لفظ عبس (تیوری چڑھائی) سے ہوا ہے جو ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام عبس رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس زمانہ میں نازل ہوئی ہوگی جب کہ اہل مکہ کے سامنے دعوت پیش ہو چکی تھی۔ اور سرداران قریش نے اسے رد کر دیا تھا۔

مرکزی مضمون اِنذار یعنی جزا کے دن سے انسان کو خبردار کرنا ہے تا کہ وہ عقیدہ و عمل میں صحیح رویہ اختیار کرے۔ سابق سورہ کے ساتھ اس کی مناسبت بالکل ظاہر ہے۔ اس کے اخیر میں یہ فرمایا گیا تھا کہ تم ان ہی لوگوں کو قیامت سے خبردار کر سکتے ہو جو اس سے ڈرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ اس سورہ میں واضح کیا گیا ہے کہ جو لوگ قیامت کا انکار کرنے پر مصر ہوں اور انہیں اپنے انجام کی کوئی پرواہ نہ ہو ان کے پیچھے جوش تبلیغ میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۱۰ میں ایک مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ کبر و غرور اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں، ان کے پیچھے پڑنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف توجہ دیں، جو طالب حق ہیں اور اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

آیت ۱۱ تا ۱۶ میں قرآن کی عظمت و رفعت بیان کی گئی ہے، تا کہ واضح ہو جائے کہ جس چیز کو قبول کرنے کی دعوت نبی ﷺ دے رہے ہیں وہ کتنے بلند مرتبہ کی چیز ہے۔ لہٰذا جو اس کی ناقدری کریں گے وہ اپنے ہی کو بہت بڑے خیر سے محروم رکھیں گے۔ اس باعظمت کلام کو پیش کرنے کے لئے پروقار طریقہ ہی اختیار کیا جانا چاہئے۔

آیت ۱۷ تا ۳۲ میں قیامت کا انکار کرنے والوں کو تنبیہ، اور انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے پر اللہ کی ربوبیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

آیت ۳۳ تا ۴۲ میں قیامت کی ہولناکی کی تصویر پیش کرتے ہوئے نیک کردار اور بدکردار لوگوں کا الگ الگ انجام بیان کیا گیا ہے۔

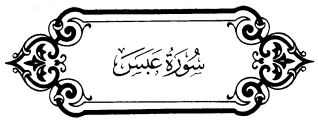

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۸۰) سورۃُ عبس

آیات ۴۲

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝۱	۱ تیوری چڑھائی ۱ اور منہ پھیرلیا۔
اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲	۲ اس بات پر کہ اس کے پاس نابینا آیا۔ ۲
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝۳	۳ (اے پیغمبر!) تمہیں کیا معلوم شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝۴	۴ یا نصیحت پر دھیان دیتا اور نصیحت اس کے حق میں مفید ہوتی۔
اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝۵	۵ جو شخص بے پرواہی برتتا ہے۔
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝۶	۶ اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔
وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝۷	۷ حالانکہ اس کے اصلاح قبول نہ کرنے کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔
وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝۸	۸ اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے۔
وَهُوَ يَخْشٰى ۝۹	۹ وہ اللہ سے ڈرتا بھی ہے۔
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝۱۰	۱۰ اس سے تم بے پرواہی برتتے ہو۔ ۳
كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱	۱۱ ہرگز نہیں۔ ۴ یہ تو ایک یاددہانی ہے۔ ۵
فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝۱۲	۱۲ تو جو چاہے اسے قبول کرے۔
فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳	۱۳ یہ ایسے صحیفوں (اوراق) میں ہے جو نہایت قابل احترام ہیں ۔۶

۱ تیوری چڑھانے کا فعل، جیسا کہ آگے کے مضمون سے واضح ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوا تھا۔ لیکن یہاں مخاطب کے بجائے غائب کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ متنبہ کرنے کا یہ حکیمانہ انداز ہے۔

۲ مراد عبداللہ ابن اُم مکتومؓ ہیں جو نابینا تھے۔ یہ حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی اور نبی ﷺ کے برادر نسبتی تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حقیر جان کر تیوری نہیں چڑھائی تھی۔ کیوں کہ آپ غریبوں، ناداروں اور معذوروں کی سب سے زیادہ قدر فرمانے والے تھے۔ بلکہ ان کا آنا اس بنا پر آپ کو ناگوار ہوا تھا کہ آپ کی مجلس میں اس وقت قریش کے بڑے بڑے سردار موجود تھے، جن کے سامنے آپ بڑے انہماک کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے۔ اس موقع پر عبداللہ ابن اُم مکتومؓ کی طرف توجہ کرنے سے سرداران قریش کی طرف التفات میں کمی ہوتی، اس لئے آپ نے سرداران قریش سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور عبداللہ ابن اُم مکتومؓ کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ چوک کسی غلط جذبہ کے تحت نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ جوش دعوت میں ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ یہ ایک ناپسندیدہ بات تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس پر گرفت فرمائی۔

۳ ان آیات میں، جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ مختصراً یہ ہے کہ نبی ﷺ کی مجلس میں ابوجہل، امیہ بن خلف، عتبہ وغیرہ سرداران قریش موجود تھے، جنہیں آپ قبول اسلام کی دعوت دے رہے تھے کہ اس اثناء میں ابن ام مکتومؓ جو نابینا تھے تشریف لائے۔ وہ اپنی اصلاح کی غرض سے اور نصیحت سننے کی طلب میں تشریف لائے تھے۔ ان کی طرف توجہ کرنے کے بجائے آپ سرداران قریش ہی کی طرف متوجہ رہے، جو نصیحت پر کان دھرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ یہ بات شانِ نبوت اور وقارِ دعوت کے خلاف تھی۔ اس لئے اس پر تنبیہ نازل ہوئی۔ اس تنبیہ کا رخ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ لیکن اصل میں اس کی زد منکرین دعوت پر پڑ رہی ہے۔ اور مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ، جن لوگوں پر دعوت حق واضح ہو چکی اور وہ دیدہ و دانستہ انکار پر مصر ہیں۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور اپنی توجہ ان بندگان خدا کی طرف مبذول کرو جو ہدایت کے طالب اور قرآن کے قدرداں ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی زندگیوں میں پاکیزگی آجائے۔ دوسری طرف منکرین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تمہاری اصلاح کے سلسلہ میں پیغمبر کے اس اضطراب اور انتھک کوشش کے باوجود، اگر تم اس پر کان دھرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو، تو جس کتاب کی طرف تمہیں دعوت دی جا رہی ہے اس کی وقعت اس سے کم ہونے والی نہیں۔ بلکہ تم خود ہی بے وقعت ہو گے۔ یہ کتاب تو نہایت بلند اور عالی مرتبت ہے۔ اس کی ناقدری کرنے والوں کے حصہ میں سوائے محرومی کے کچھ نہیں آسکتا۔

۴ یعنی ایسے ناقدروں کے پیچھے پڑنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

۵ مراد قرآن ہے۔

۶ یہاں قرآن کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ اور واضح کرنا یہ مقصود ہے کہ، جو لوگ اس کلام کی ناقدری کرتے ہیں وہ اپنی ہی قدر گھٹاتے ہیں۔ ورنہ اس کی جو قدر و منزلت آسمانوں میں ہے اس کا اگر انہیں اندازہ ہوتا تو وہ ہرگز ناقدری نہ کرتے۔

مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾	۱۴ بلند مرتبہ اور پاکیزہ ہیں۔ ۷
بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾	۱۵ ایسے کاتبوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ ۸
كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾	۱۶ جو معزز اور وفا شعار ہیں۔ ۹
قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿۱۷﴾	۱۷ غارت ہو ۱۰ انسان کیسا ناشکرا ہے!
مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿۱۸﴾	۱۸ اسے اللہ نے کس چیز سے پیدا کیا؟ ۱۱
مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾	۱۹ ایک بوند سے پیدا کیا اور اس کی منصوبہ بندی کی۔ ۱۲
ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾	۲۰ پھر اس کے لئے راہ آسان کر دی۔ ۱۳
ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾	۲۱ پھر اس کو موت دی۔ ۱۴ اور قبر میں دفن کرایا۔ ۱۵
ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾	۲۲ پھر جب وہ چاہے گا اسے اٹھا کھڑا کرے گا۔ ۱۶
كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾	۲۳ ہرگز نہیں۔ اس نے اس حکم کی تعمیل ۱۷ نہیں کی، جو اللہ نے اُسے دیا تھا۔
فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾	۲۴ انسان ذرا اپنی غذا ۱۸ کو دیکھے۔
اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾	۲۵ کہ ہم نے خوب پانی برسایا۔ ۱۹
ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾	۲۶ پھر زمین کو اچھی طرح پھاڑا ۔ ۲۰
فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾	۲۷ پھر اس میں اگائے غلے۔
وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾	۲۸ اور انگور اور ترکاریاں۔
وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾	۲۹ اور زیتون اور کھجور۔
وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾	۳۰ اور گھنے باغ۔
وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾	۳۱ اور میوے اور چارہ۔

۷ قرآن شیطان کی دخل اندازیوں سے بالکل پاک ہے۔اس میں باطل کی آمیزش ممکن ہی نہیں، کیوں کہ شیاطین کی رسائی اس کتاب تک ہو ہی نہیں سکتی۔انہیں اس سے بہت دور رکھا گیا ہے۔لہٰذا قرآن از اوّل تا آخر خالص کلام الٰہی پر مشتمل اور ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہے۔

۸ مراد فرشتے ہیں جو قرآن کو لکھ رہے تھے۔

۹ یہ ان فرشتوں کی صفات ہیں جو قرآن کو آسمان پر لکھ رہے تھے۔اور اسے بحفاظت نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا رہے تھے۔اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ قرآن، جن فرشتوں کے ذریعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جا رہا ہے۔وہ ایسے ذی شان بلند پایہ اور امانتدار ہیں، کہ ان سے کسی قسم کی خیانت کا صدور ممکن ہی نہیں۔اور نہ وہ شیطان کو کسی قسم کی مداخلت کا موقع دے سکتے ہیں۔اس لئے اس میں شک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں کہ وہ اس خدائی امانت کو جوں کا توں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا رہے ہیں۔

۱۰ یہاں سے کلام کا رخ کفار کی طرف پھرتا ہے۔

۱۱ یعنی انسان اپنی حقیقت پر غور کرے کہ اس کی زندگی کا آغاز پانی کے ایک حقیر قطرے سے ہوا۔پھر اس میں یہ گھمنڈ کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خدا کے سامنے اپنے کو کچھ سمجھنے لگے، اور اس کے اس احسان کو کہ اسے ایک بہترین مخلوق کی حیثیت دی، فراموش کر دے۔

یہاں قیامت کے دن انسان کے اٹھائے جانے پر بھی استدلال ہے ۔یعنی جس ہستی کی کرشمہ سازیوں کا یہ حال ہو کہ وہ پانی کی ایک حقیر بوند سے انسان جیسی عظیم مخلوق کو اٹھا کھڑا کر سکتی ہے، اس کے لئے آخر یہ کیوں ناممکن سمجھا جائے کہ وہ قیامت کے دن اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گی؟

۱۲ یعنی ہر انسان کی تخلیق ایک منصوبہ کے ساتھ ہوئی ہے۔مثلاً اس کی شکل وصورت، جسامت، ذہنی صلاحیت، کام کرنے کی استعداد، قوت وطاقت، مقامِ پیدائش اور موت کا وقت وغیرہ، اس خدائی منصوبہ کے مطابق ہی انسان زندگی گذارتا ہے، اور اس سے آزاد ہونا اس کے لئے ناممکن ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی تخلیق کی ایک غایت ہے۔

۱۳ مراد زندگی کی راہ ہے جس کے نشیب وفراز کو انسان بآسانی طے کرتا ہے۔اس کے وجود کو برقرار رکھنے اور اس کی نشوونما کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت تھی، سب مہیا کر دیئے گئے ہیں، مثال کے طور پر بچہ جبلی طور پر ماں کی چھاتیوں کو چوستا ہے اور اس کے لئے غذا کی فراہمی آسان ہو جاتی ہے۔اسی طرح عملِ تنفس ایک مشکل کام ہے، لیکن انسان مرتے دم تک اس طرح تسلسل کے ساتھ سانس لیتا اور خارج کرتا رہتا ہے، کہ اسے ذرا بھی تکان لاحق نہیں ہوتی۔

۱۴ یعنی موت ہر شخص کے لئے مقدر ہے۔اس سے کسی کو مفر نہیں۔اور جب انسان کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی موت کو ایک لمحہ کے لئے بھی ٹال نہیں سکتا، تو پھر وہ کس بل بوتے پر اپنے خالق سے کفر کرتا ہے؟

۱۵ معلوم ہوا کہ مُردوں کو قبر میں دفن کرنا طریقۂ فطرت ہے، بخلاف جلانے کے کہ یہ طریقہ نہ الہامی ہے اور نہ

مطابق شرع۔

اسلام چونکہ مہد سے لیکر لحد تک کا دین ہے۔اس لئے اس نے جہاں جینے کا صحیح طریقہ بتلایا ہے، وہاں مرنے کا بھی صحیح طریقہ بتلایا ہے۔

۱۶؎ یعنی انسان کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔یہ کام اس کے لئے نہ مشکل ہے اور نہ اس کی مشیت میں کوئی چیز مانع ہوسکتی ہے۔

۱۷؎ حکم سے مراد وہ تمام احکام ہیں جو انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائے ہیں۔مثلاً ایک خدا کی پرستش کرنا، سچ بولنا، انصاف کرنا، ظلم نہ کرنا وغیرہ، اور وہ احکام بھی جو اس نے اپنے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعہ نازل فرمائے۔

۱۸؎ یعنی زندگی بعد موت پر دلائل بہ کثرت ہیں۔انسان جس غذا سے روزانہ فائدہ اٹھاتا ہے اسے معمولی خیال کرتا ہے۔ذرا اسی پر غور کر کے دیکھے کہ وہ پیدا کیسے ہوتی ہے؟ اگر اللہ اسے پیدا نہ کرتا تو انسان کو غذا کہاں سے میسر آتی؟ اس کی پرورش کا یہ سامان اور ربوبیت کا یہ اہتمام اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان سے ان نعمتوں کے بارے میں باز پرس ہو، کہ اس نے اپنے رب کی ان نعمتوں کو پا کر اس کی شکر گذاری کا طریقہ اختیار کیا یا ناشکری کی۔

۱۹؎ بارش کا کوئی الگ دیوتا نہیں ہے۔بلکہ اللہ ہی ہے جو آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے انسان کو پینے کے لئے بھی پانی میسر آتا ہے۔اور زمین کی روئیدگی کا بھی سامان ہوتا ہے۔اگر وہ بارش کا انتظام نہ کرتا تو کیا انسان کے لئے زندہ رہنا ممکن ہوتا؟

۲۰؎ ''یہ اللہ ہی کا کرشمۂ قدرت ہے کہ وہ مینہ برساتا اور زمین کو پھاڑ کر اس کے اندر سے کونپلیں نکالتا اور نباتات اگاتا ہے۔یہ سب دیکھتے ہوئے یہ کہنے کی جسارت کس طرح کرتے ہو کہ وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ قیامت کے دن زمین پھاڑ کر مُردوں کو جِلا اٹھائے۔

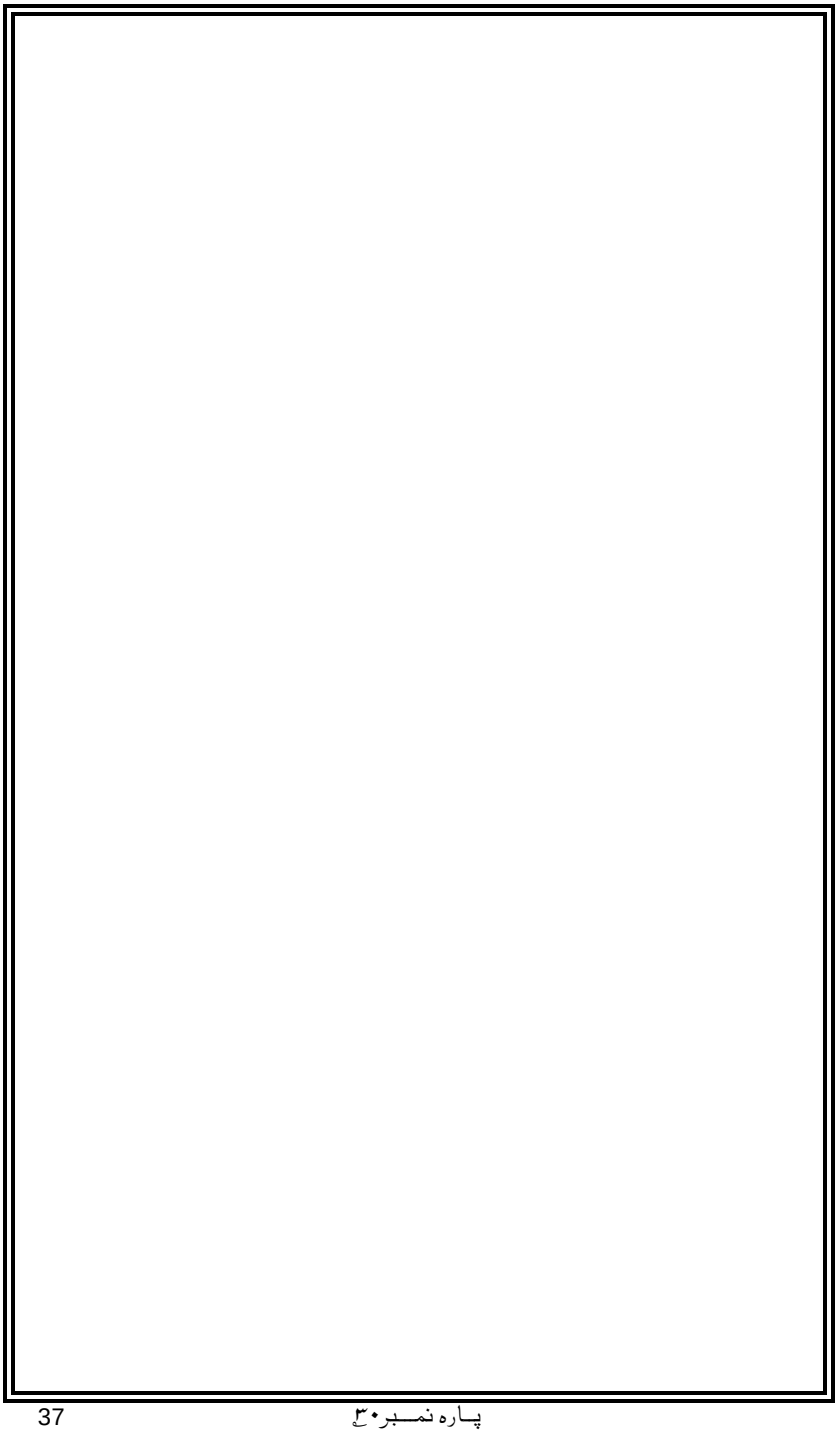

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾	۳۲ تمہاری اور تمہارے مویشیوں کی منفعت کے لئے۔۲۱
فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾	۳۳ پھر جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز گرجے گی۔۲۲
يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾	۳۴ اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے۔
وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾	۳۵ اپنی ماں اور اپنے باپ سے۔
وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾	۳۶ اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے۔
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾	۳۷ اس روز ہر کسی کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔۲۳
وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾	۳۸ کتنے ہی چہرے اس روز روشن ہوں گے۔۲۴
ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾	۳۹ خنداں اور شاداں۔۲۵
وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾	۴۰ اور کتنے ہی چہرے اس روز غبار آلود ہوں گے۔
تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾	۴۱ ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔۲۶
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾	۴۲ یہ ہوں گے وہی کافر اور فاجر لوگ۔

۲۱؎ یعنی کیا یہ نعمتیں جن سے تم رات دن فائدہ اٹھاتے ہو اپنے ساتھ ذمہ داری کا کوئی تصور نہیں لاتیں؟ جس خدا نے تم پر یہ احسانات کئے ہیں کیا وہ تم سے باز پرس نہیں کرے گا، کہ تم اس کے شکر گذار بندے بن کر رہے یا کفرانِ نعمت کیا ؟

۲۲؎ مراد قیامت کی ہولناک آواز ہے ۔ جب آخری صور پھونکا جائے گا تو اس کی ہولناک آواز تمام مرے ہوئے انسانوں کو اٹھا کر کھڑا کرے گی۔

۲۳؎ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ دنیا میں انسان اپنے قریبی عزیزوں کی خاطر قبولِ حق سے گریز کرتا ہے، لیکن قیامت کے دن کی مصیبت ایسی ہوگی کہ نہ یہ ان کے کام آسکے گا۔ اور نہ وہ اس کے کام آسکیں گے۔ ہر شخص کو اپنی نجات کی فکر لگی ہوگی اور کسی کو ہوش نہ ہوگا۔

۲۴؎ یہ مخلص مومنین کے چہرے ہونگے جو ایمان کی روشنی سے دمک رہے ہوں گے۔

۲۵؎ خوشی اس بات کی کہ وہ دنیا کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ چہروں کی شگفتگی ان کی نیک روی کا نتیجہ ہوگی اور جنت کا پروانہ پا کر وہ شاداں وفرحاں ہوں گے۔

۲۶؎ یہ کافروں کے چہرے ہوں گے جن پر کفر کی سیاہی چھائی ہوئی ہوگی اور ان کی بدعملی ان کے چہروں کو خاک آلود کر رہی ہوگی۔

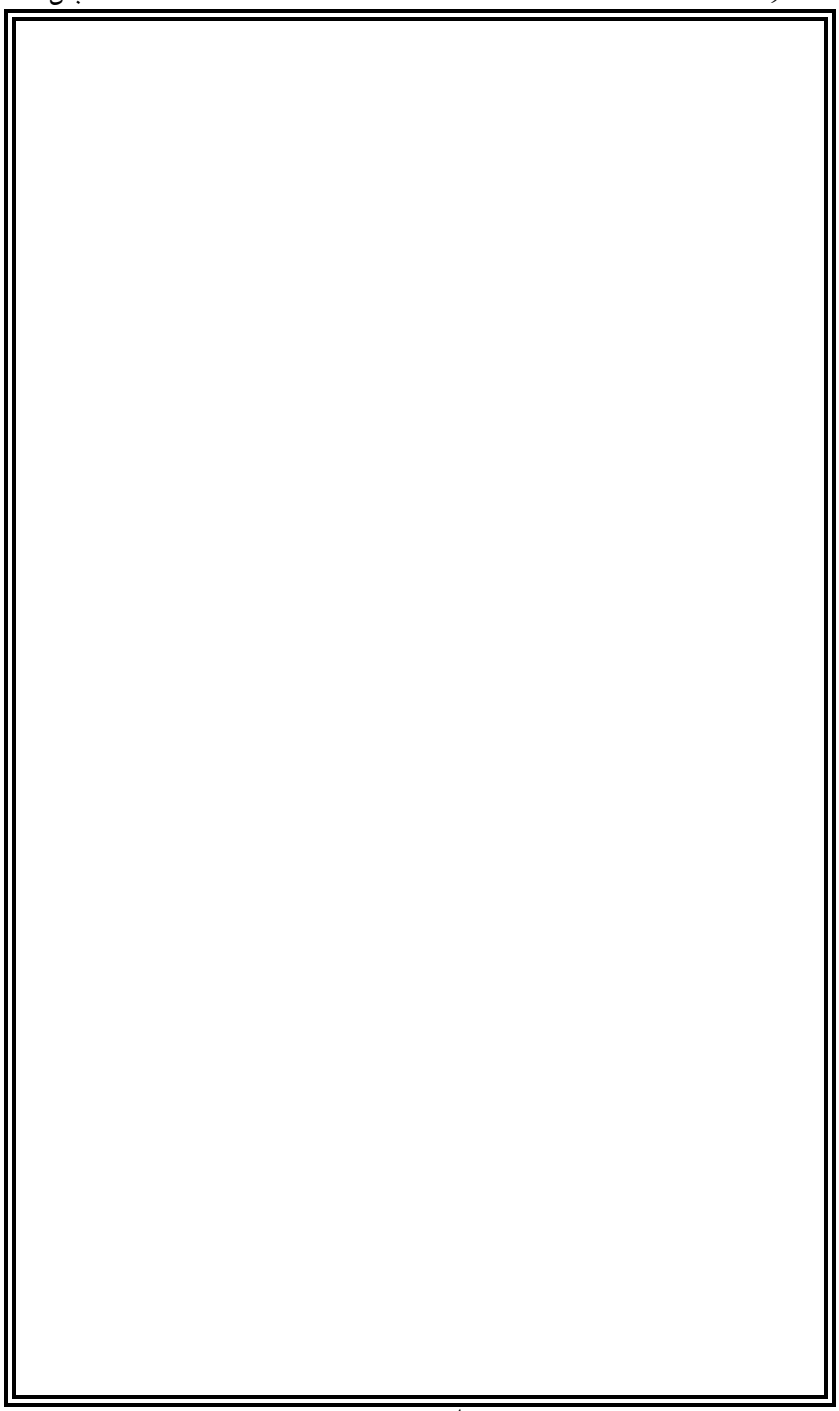

(۸۱) سُورۃُ التکویر

نام اس سورہ کی پہلی آیت میں خبردار کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ لپیٹنے کے لئے لفظ کُوِّرَتْ استعمال ہوا ہے۔ اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام التکویر ہے۔ یعنی وہ سورہ جس میں لپیٹنے کا ذکر ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون غفلت میں پڑے ہوئے انسانوں کو روزِ جزا سے خبردار کرنا ہے۔ اور یہ واضح کرنا ہے کہ پیغمبر اور قرآن اس کی جو خبر دے رہے ہیں وہ ہر قسم کے شبہہ سے بالاتر ہے۔ سابق سورہ میں قیامت کی ہولناکی کا ذکر تھا اس سورہ میں اس کی ہولناکی کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ آدمی قیامت کو اپنے سامنے دیکھنے لگتا ہے۔ گویا یہ سورہ قیامت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص روز قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہو وہ سورہ تکویر، سورہ انفطار اور سورہ انشقاق کو پڑھ لے۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۷۴ بحوالہ احمد و ترمذی)

نظم کلام آیت ۱ تا ۶ میں قیامت کے پہلے حادثہ (نفخِ اوّل) کی تصویر کھینچی گئی ہے اور آیت ۷ تا ۱۴ میں دوسرے حادثہ (نفخِ ثانی) کی۔

آیت ۱۵ تا ۲۵ میں قرآن اور پیغمبرِ قرآن کے بارے میں واضح کیا گیا ہے کہ وہ جو دعوت پیش کر رہے ہیں اور خبر دے رہے ہیں وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔

آیت ۲۶ تا ۲۹ میں منکرین کو تنبیہ ہے کہ قرآن کی راہ کو چھوڑنا حق و صداقت کی راہ کو چھوڑنا ہے۔ اسلئے وہ سوچیں کہ اس سے انکار کر کے کس گڑھے میں گرنا چاہتے ہیں؟

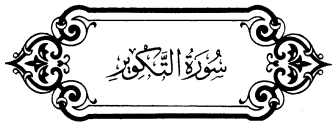

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۸۱)سُورۃُ التکویر

آیات ۲۹

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝١	۱ جب سورج لپیٹ دیا جائے گا ۔۱
وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝٢	۲ اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ ۲
وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝٣	۳ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ ۳
وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝٤	۴ اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی۔ ۴
وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝٥	۵ اور جب وحشی جانور اکٹھے کئے جائیں گے۔ ۵
وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝٦	۶ اور سمندر بھڑکا دئے جائیں گے ۔ ۶
وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝٧	۷ اور جب لوگوں کو (مختلف گروہوں میں) بانٹ دیا جائے گا۔ ۷
وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝٨	۸ اور جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا۔
بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝٩	۹ کہ وہ کس گناہ میں ماری گئی؟ ۸
وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝١٠	۱۰ اور جب اعمال نامے کھول دئے جائیں گے ۔۹
وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝١١	۱۱ اور جب آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ ۱۰
وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝١٢	۱۲ اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی۔
وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝١٣	۱۳ اور جب جنت قریب لائی جائے گی۔ ۱۱

۱ سورج کو لپیٹ دئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ آسمانی چراغ، جس کی روشنی کروڑ ہا میل تک پھیلی ہوئی ہے اور جس سے پورا عالم جگمگا رہا ہے قیامت کا دھماکہ ہوتے ہی گل ہو جائے گا۔ اور جب سورج ہی تاریک ہو جائے گا تو یہ دنیا، جس عظیم حادثہ سے دوچار ہوگی اس کے تصور ہی سے انسان کانپ اٹھتا ہے۔

سورج اس کائنات کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور جدید سائنسی اکتشافات کے مطابق زمین کی سطح سورج سے طاقت کی جو مقدار حاصل کرتی ہے، چار ملین ہارس پاور فی مربع میل ہے۔ گویا سورج زمین کے لئے پاور ہاؤس کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن یہ خبر دیتا ہے کہ ایک روز آئے گا جب کہ سورج اپنی یہ عظیم طاقت کھو چکا ہوگا۔ اور وہ قیامت کا دن ہوگا۔ یہ خبر خود اللہ دے رہا ہے، جو سورج سمیت پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ تو یقین کرنے کے لئے یہ بات بالکل کافی ہے۔ تاہم جہاں تک سائنس کا تعلق ہے وہ بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتی ہے کہ سورج کو بالآخر تاریک ہونا ہے۔

"And eventually, the sun will become a black dwarf, a very dense,nonluminous object of degenerate matter. "(The New Encyclopaedia Britanica vol. 17 p 808)

ایک زمانہ میں انسان سورج کو دیوتا سمجھ کر اس کی پوجا کرتا رہا ہے۔ اور آج بھی جدید سائنسی اکتشافات کے باوجود سورج کے پرستاروں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا بیان یہ ہے کہ سورج خدا نہیں، بلکہ خدا کی پیدا کردہ کائنات کا ایک جز اور اس کا محکوم ہے۔ اور اسی وقت تک روشنی دیتا رہے گا، جب تک اللہ کا وہ حکم نہیں آجاتا جو کائنات کی بساط کو الٹ کر رکھ دے گا۔ جس دن وہ حکم آجائے گا سورج اپنی تمام توانائی کھو دے گا اور اس کی روشنی بالکل ختم ہو جائے گی۔

۲ آفتاب عالمتاب اور جگمگاتے ہوئے تاروں کو دیکھ کر انسان یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ یہ دنیا سدا بہار ہے اور اس کی رونق کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ لیکن قرآن دوٹوک انداز میں انسان کو آگاہ کرتا ہے کہ یہ فریب خیال ہے۔ حقیقت میں ایک ایسا وقت آنے والا ہے اور وہ بہت قریب ہے، جب کہ سارے چراغ بجھا دئے جائیں گے۔ اور یہ دنیا تاریکی کی نذر ہو جائے گی تاکہ توڑ پھوڑ کے اس عمل سے ایک نیا عالم وجود میں لایا جا سکے، جس میں نتائجِ عمل کا ظہور ہو۔

۳ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا جھٹکا لگتے ہی زمین اپنی کشش کھو دے گی۔ اس سے جو ہولناک کیفیت پیدا ہوگی اس کا ہلکا سا تصور ہی انسان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے پہاڑوں کے اڑائے جانے کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر ہوا ہے۔

۴ قرآن جس دور اور ماحول میں نازل ہوا اس میں، دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں جو جننے کے قریب ہوتی تھیں سب سے زیادہ قیمتی چیز خیال کی جاتی تھیں۔ اور اہل عرب کی نظر میں یہ محبوب مال تھا۔ اس محبوب مال کا ذکر بطور مثال کے کیا گیا ہے۔ مقصود اس سے یہ واضح کرنا ہے کہ قیامت کا دھماکہ ہوتے ہی انسان اپنے عزیز ترین مال کو بھول جائے

گا۔دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں جو آج اس کے مالک کے نزدیک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں اس طرح بے قیمت ہو کر آوارہ پھرنے لگیں گی کہ ان کو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔کیوں کہ قیامت کا آغاز ہوتے ہی انسان کو کسی بھی چیز کا ہوش نہیں رہے گا۔

واضح رہے کہ اونٹنی کا یہ ذکر اس وقت کی عربوں کی معیشت کے پیش نظر گویا ان کے قیمتی سرمایہ پر انگلی رکھ کر اس کے بے وقعت ہو جانے کو ظاہر کرنے کے مترادف تھا،جس نے کلام میں زبردست تاثیر پیدا کردی۔اس مثال سے اصلاً یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ قیامت کا بگل بجتے ہی مال و دولت کے یہ ڈھیر جس کے حصول کو انسان اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوتے ہے۔اور اس بنا پر حقیقی مقصدِ زندگی کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا،سب بیکار اور فنا ہو جائیں گے۔خواہ وہ محبوب اونٹنی کی شکل میں ہوں یا قیمتی کاروں،بڑے بڑے کارخانوں اور شاندار عمارتوں کی شکل میں۔

۵ یعنی قیامت کا ظہور ہوتے ہی ایسی خوفناک صورت پیدا ہوگی کہ انسان تو انسان،وحشی جانوروں پر بھی سراسیمگی کی حالت طاری ہوگی۔اور وہ جنگلوں سے بھاگ کر دوسرے جانوروں اور انسانوں کے ساتھ اکٹھا ہونے لگیں گے۔

۶ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ سمندر میں آگ لگ جائے گی۔لیکن قیامت کا حادثہ بذات خود عجیب تر ہے۔اس کا پہلا جھٹکا ہی تمام عجیب باتوں کو ختم کر کے رکھ دے گا۔کیوں کہ قیامت کا مطلب ہی یہ ہے کہ کائنات کی ساخت میں زبردست تبدیلی ہوگی اور عظیم انقلاب رونما ہوگا۔ویسے بھی پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں سے مرکب ہے۔اور اللہ کا ایک اشارہ اس کی اس کیمیاوی ترکیب کو جدا کرنے کے لئے کافی ہے جس کے نتیجہ میں یہ گیسیں بھڑکنے اور بھڑکانے کا کام کرسکتی ہیں۔

قرآن کے بیان کے مطابق حشر کے لئے زمین کو چٹیل میدان کی شکل دی جائے گی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سمندروں کو پاٹ دیا گیا ہوگا اور اس سے پہلے اس کے پانی کو بھڑکا کر ختم کر دیا گیا ہوگا۔

۷ یہاں سے قیامت کے دوسرے مرحلہ کا ذکر شروع ہوتا ہے،جب کہ تمام انسانوں کو جسم سمیت دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

گروہوں میں تقسیم کرنے سے مراد عقائد و اعمال کی بنیاد پر لوگوں کی گروہ بندی اور درجہ بندی ہے۔دنیا میں تو مومن و کافر،مسلم و مجرم،نیک و بد اور ظالم و مظلوم سب مخلوط رہتے ہیں۔لیکن قیامت کا جھٹکا لگتے ہی انسانی سوسائٹی کا موجودہ ڈھانچہ چکنا چور ہو جائے گا۔اور میدان حشر میں ایمان و اخلاق کی بنیاد پر لوگوں کے الگ الگ گروہ بنائے جائیں گے۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سورہ واقعہ آیت ۷ تا ۴۴)

۸ زندہ درگور کرنے کا طریقہ عربوں کے بعض قبائل میں رائج تھا۔اس کا ایک سبب تو فقر کا اندیشہ ہوتا اور معاشی خستہ حالی کے پیش نظر وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کھانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو،اس لئے تحدید نسل اور فیملی پلاننگ(Family planing) کا جاہلانہ اور ظالمانہ طریقہ انہوں نے اختیار کر رکھا تھا،وہ بچوں کے پیدا ہوتے

ہی ان کو دفن کر دینے کا تھا۔اس کا دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لئے عار سمجھتے تھے۔اور جھوٹی غیرت انہیں اس قبیح اور سنگدلانہ حرکت پر آمادہ کرتی تھی۔قرآن نے ان کی اس حرکت پر سخت گرفت کی اور بتلایا کہ قیامت کے دن عدالت خداوندی میں اس جرم کا ارتکاب کرنے والے کے خلاف مقدمہ چلایا جائے گا۔

زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے یہ سوال کہ وہ کس جرم میں ماری گئی، اس کے بے گناہ مارے جانے اور مارنے والے کے جرم کی سنگینی پر دلالت کرتی ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کا یہ بیان اصلاح کے معاملہ میں اس قدر موثر ثابت ہوا کہ اس ظالمانہ رواج کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہو گیا۔

۹ دنیا میں انسان جو کچھ کرتا ہے خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا اور خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا اعمال سے، افکار و نظریات سے ہو یا تحریک و جدوجہد سے، قول ہو یا فعل، تقریر ہو یا تحریر حتیٰ کہ حرکات و سکنات اور چال ڈھال کا بھی ریکارڈ تیار کیا جارہا ہے۔یہ ریکارڈ دنیا میں خفیہ طریقے پر اللہ کے فرشتے تیار کر رہے ہوتے ہیں، جو ہر فرد کے ساتھ الگ الگ لگے ہوتے ہیں۔اس ریکارڈ کو قرآن کی زبان میں ''صحیفہ'' یا ''کتاب'' اور اردو میں ''نامۂ اعمال'' کہا جاتا ہے۔انسان کے مرنے پر یہ ریکارڈ تہہ کر کے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔اور قیامت کے دن اللہ کی عدالت میں پیشی کے موقع پر اس کو کھول کر ہر شخص کے سامنے رکھا جائے گا، تاکہ وہ اپنا ریکارڈ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

آدمی کا زندگی بھر کا ریکارڈ ایک ورق (Sheet) کی شکل میں پیش کیا جانا نزول قرآن کے دور میں عام انسان کے لئے حیرت انگیز بات تھی۔لیکن سائنسی ترقی کے موجودہ دور میں، جب کہ کتابوں کی مائیکرو فلمیں (Micro films) تیار کی جانے لگی ہیں، کچھ بھی حیرت کی بات نہیں رہی۔

۱۰ مراد آسمان سے اوپر کی دنیا کا بے نقاب کیا جانا ہے۔آج تو ہماری نگاہیں نیلگوں آسمان تک جا کر رک جاتی ہیں۔لیکن قیامت کے دن ہم اس دنیا کا بھی مشاہدہ کر سکیں گے، جو آسمان سے اوپر ہے۔اور ان غیبی حقائق کو بھی دیکھ سکیں گے، جو آج ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔لیکن ان کی خبر قرآن دے رہا ہے۔اس روز انسان کو خدا کی خدائی اور کائنات کی وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔آج انسان دنیا کے جس خول میں بند ہے اسی خول کو پوری کائنات سمجھ بیٹھا ہے۔اور اس سے آگے جن حقائق کی اسے خبر دی جارہی ہے اس کو وہ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔جس طرح مرغی کا بچہ جب تک انڈے کے خول کے اندر بند رہتا ہے یہ سمجھتا ہے کہ یہی کچھ دنیا ہے۔

۱۱ قیامت کے دن زمان و مکان کے پیمانے بالکل بدل چکے ہوں گے۔اس روز انسان جان لے گا کہ جنت میدان حشر سے بہت قریب ہے۔اور جو لوگ اس کے اہل قرار پائیں گے ان کو اس تک پہنچنے کے لئے نہ انتظار کرنا پڑے گا اور نہ طویل مسافت کی مشقت برداشت کرنا ہوگی۔بلکہ وہ خود آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کرے گی۔اس کی تفصیلی نوعیت قیامت کے دن ہی واضح ہو سکے گی۔آج ہم محدود علم کی بنا پر اسے سمجھ نہیں سکتے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾	۱۴ اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا لے کر حاضر ہوا ہے۔ ۱۲
فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾	۱۵ پس نہیں، ۱۳ میں قسم کھاتا ہوں ۱۴ غروب ہونے والے، ۱۵
الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾	۱۶ چلنے والے، ۱۶ اور چھپ جانے والے ۱۷ ستاروں کی۔ ۱۸
وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾	۱۷ اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہو۔
وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾	۱۸ اور صبح کی جب کہ وہ سانس لے۔ ۱۹
اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾	۱۹ کہ یقیناً یہ ایک معزز پیغامبر کا (لایا ہوا) کلام ہے۔ ۲۰
ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾	۲۰ جو قوت والا ہے۔ ۲۱ اور مالک عرش کے ہاں بلند مرتبہ ہے۔ ۲۲
مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾	۲۱ وہاں اس کا حکم مانا ۲۳ جاتا ہے اور وہ ۲۴ امانت دار ہے۔
وَ مَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾	۲۲ اور تمہارا ساتھی دیوانہ نہیں ہے۔ ۲۵
وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾	۲۳ اس نے اس فرشتہ کو کھلے افق پر دیکھا ہے۔ ۲۶
وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾	۲۴ اور وہ غیب کی باتیں بتانے کے معاملہ میں بخیل نہیں ہے۔ ۲۷
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾	۲۵ اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔ ۲۸
فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾	۲۶ پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو ؟

۱۲؎ یہ ہے ان آیات کا مرکزی مضمون ۔ مطلب یہ ہے کہ جب قیامت ان تمام ہولناکیوں کے ساتھ رونما ہوگی، جو اوپر بیان ہوئی ہیں، تو وہ دن عدالت خداوندی میں پیشی کا ہوگا۔ اس روز انسان اپنی زندگی بھر کا کچا چٹھا لے کر حاضر ہوگا تا کہ اپنے پروردگار کے حضور جوابدہی کر سکے۔ وہ دن بڑا ہولناک ہوگا اور وہ گھڑی بڑی سخت ہوگی۔ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

۱۳؎ یہ منکرین کے اس خیال کی تردید ہے، کہ قرآن جو قیامت کی خبر دے رہا ہے کسی دیوانہ کی بڑ یا القائے شیطانی ہے۔

۱۴؎ اس طرح کی جو قسمیں کھائی جاتی ہیں ان کا مطلب ان چیزوں کے تقدس اور عظمت کو بیان کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کو شہادت اور دلیل کے طور پر پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ عربی کا اسلوبِ کلام ہے، جس میں زور کلام بھی ہے اور بلاغت بھی۔ غیر عربی داں اس اسلوبِ کلام سے نا آشنا ہونے کی بنا پر ان قسموں کا جو قرآن میں مختلف مقامات پر کھائی گئی ہیں صحیح محل اور ان کے اشارات و مضمرات سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

۱۵؎ متن میں لفظ '' الخُنَّسُ '' استعمال ہوا ہے جس سے مراد غروب ہونے والے ستارے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ستاروں کی جگمگاہٹ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے، بلکہ ان کے غروب ہونے کے پہلو کو بھی سامنے رکھنا چاہئے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قانون خداوندی کے آگے بالکل بے بس ہیں۔ اس پہلو کی طرف توجہ دلانے کی غرض سے ستاروں کے چلتے رہنے کی صفت سے پہلے ان کے غروب ہونے کی صفت کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۶؎ متن میں لفظ '' الجوارِ '' استعمال ہوا ہے جس سے مراد چلتے رہنے والے ستارے ہیں۔ ستاروں کا چلنا اس معنیٰ میں بھی ہوسکتا ہے کہ انسان کا عام مشاہدہ یہی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ان میں سے کون سے ستارے سیارے ہیں اور کون سے ثوابت۔ اور اپنی اس حقیقت کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے جس کا انکشاف جدید سائنس نے کیا ہے کہ ستارے خلا میں متحرک ہیں۔

The stars themselves are moving throgh space - some at tremendous speed -- but so vast is our distance from them that their position do not appear to the Naked eye to alter,even in a century (The Marvels & Mysteries of Science - p. 82.)

۱۷؎ متن میں لفظ '' الکُنَّس '' استعمال ہوا ہے جس سے مراد چھپنے والے اور غائب ہوجانے والے ستارے ہیں۔ دن میں ستارے غائب رہتے ہیں نیز چلتے چلتے نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ اس مناسبت سے ان کی یہ صفت بیان ہوئی ہے۔

۱۸؎ یہاں ستاروں کی رفتار اور ان کے طلوع و غروب کو اس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے نہ کہ القائے شیطانی۔ ان کا مقررہ وقت پر طلوع و غروب اور ان کی رفتار میں باقاعدگی اس بات کی نشاندہی کرتی

ہے کہ وہ قانون الٰہی میں جکڑے ہوئے ہیں ۔ اور اس سے سرِ مو انحراف نہیں کر سکتے ۔ کروڑ ہا میل کی بسیط فضاء میں ستاروں کا ایک نامعلوم زمانہ سے معلق رہنا اور ایک حیرت انگیز نظم کا پابند ہو کر رہنا، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ کائنات کا نظام ایک حکیمانہ نظام ہے ۔ جس کے پیچھے ایک علیم و خبیر ہستی کا مدبرانہ منصوبہ کارفرما ہے ۔ قرآن اس منصوبہ کی تشریح کرتا ہے اور خالق کائنات کی، جن صفات کی طرف ستاروں کا یہ نظام اشارہ کرتا ہے ان کو وہ کھول کر پیش کرتا ہے ۔ گویا قرآن کا عکس اس کائنات کے آئینہ میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ اور اس کی صداقت کو آثار کائنات کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے ۔

ستارے اور سیارے اپنے حیرت انگیز طبعی کوائف کی بنا پر انسان کو دعوت فکر دیتے ہیں ۔ لیکن انسان کے غور و فکر کا انداز یہ رہا ہے کہ ان کو وہ متصرف بالذات مان کر ان کی پوجا کرتا اور ان سے شگون لیتا رہا ہے ۔ جس کی بناء پر علم جوتش (Astrology) کو فروغ حاصل ہوا اور کہانت (Soothsaying) کی گرم بازاری ہوئی ۔ اس طرح انسان کے بھٹکنے کا سامان ہوتا رہا ۔ پھر انسان ان کی ساخت اور ان کے فاصلے وغیرہ کے بارے میں معلومات کے ڈھیر لگاتا ہے ۔ جس کی بنا پر علم فلکیات (Astronomy) کو فروغ ہوا اور سائنس نے خوب ترقی کی ۔ یہ صورت انسان کے لئے مفید ہوئی تو بس اس کی معلومات میں اضافہ کی حد تک ۔ اس سے انسان اپنی اور کائنات کی اصل غایت معلوم کرنے کے تعلق سے کوئی رہنمائی حاصل نہ کر سکا ۔ قرآن غور و فکر کا جو انداز اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ان کے مشاہدہ سے ان کے خالق کی معرفت (پہچان) حاصل کرے ۔ کیوں کہ یہ ستارے اپنے خالق کی عظیم الشان صفات کا مظہر ہیں ۔ جس طرح ایک حسین ترین تصویر کو دیکھ کر اس کے مصور (Artist) کی فن تصویری میں مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اسی طرح ان درخشاں ستاروں کی صناعی اور ان کے حیرت انگیز نظام کو دیکھ کر خالق کائنات کی صفت قدرت، صفت ربوبیت، صفت علم، صفت فرمانروائی، صفت عدل، صفت حکمت، اور اس طرح کی دوسری صفات کی ابتدائی معرفت انسان کو حاصل ہو جاتی ہے ۔ بالفاظ دیگر ستارے اپنے خالق کا جو تعارف اپنی خاموش زبان سے کراتے ہیں وہ قرآن کے بیان سے، جو خالق کائنات کا مکمل اور تفصیلی تعارف پیش کرتا ہے کامل درجہ ہم آہنگ ہے ۔ اور یہ اس کی حقانیت کا بیّن ثبوت ہے ۔ پھر کمال درجہ کے اس حکیمانہ کلام کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ انسانی تصنیف ہے یا شیطانی وساوس کا نتیجہ ہے یا اس بنا پر کہ وہ قیامت کی آمد کی خبر دے رہا ہے اسے کہانت پر محمول کرنا حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کیسی مذموم کوشش اور کتنی بڑی ناانصافی ہے؟

۱۹ رات کے رخصت ہونے اور صبح کے نمودار ہونے کا وقت بھی عجائبات قدرت میں سے ہے ۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا رات کی تاریکی کو چیر کر صبح نے جنم لیا ہے ۔ اور جب نسیم سحر چلتی ہے تو یہ احساس کروٹیں لینے لگتا ہے کہ گویا صبح سانس لے رہی ہے ۔ یہاں ان کیفیات کو شہادت میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس ہستی نے رات اور دن کے آمد و رفت کا یہ عجیب و غریب نظام قائم کیا ہے، وہ اس نظام کے بطن سے ایک عجیب تر نظام نو بھی پیدا کر سکتا ہے اور اس کی حکمت اس کی متقاضی ہے کہ ایسا کیا جائے ۔ اس لئے قرآن قیامت کی آمد اور ایک نئے نظام

کی تشکیل، جس میں جزائے عمل کا معاملہ پیش آئے گا۔۔۔۔کی جو خبر دے رہا ہے وہ خلاف عقل نہیں، بلکہ موجودہ نظام کائنات کا ایک ابھرتا ہوا تقاضا ہے۔

۲۰ یہ وہ بات ہے جس پر اوپر کی آیات میں استشہاد کیا گیا ہے یعنی قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر۔ معزز پیغامبر سے مراد جبریل ہیں جو خدا کے معزز فرشتے ہیں۔ وہ خدا کا کلام لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے اور ٹھیک ٹھیک ان ہی الفاظ میں آپ کو پہنچاتے تھے۔

چونکہ یہ کلام القائے ملکوتی ہوتا تھا نہ کہ القائے شیطانی اس لئے آیت میں کلام کو خدا کے فرستادہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

۲۱ یہ وحی لانے والے فرشتہ جبریل علیہ السلام کی صفت ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوت عطا فرمائی ہے۔ اس لئے شیاطین ان کے کام میں مخل نہیں ہو سکتے۔ ان کی پرواز آسمان سے پرے ہے اور وہ اللہ کا پیغام اس کے رسول تک بحفاظت پہنچانے پر پوری طرح قادر ہیں۔

۲۲ یہ حضرت جبریل کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے۔ یعنی ان کی رسائی براہ راست فرمانروائے کائنات تک ہے اور وہ اس کے حضور مقرب اور عالی مقام ہیں۔

۲۳ یعنی جبریل فرشتوں کے سردار ہیں، وہ اس کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں۔ لہٰذا جس کے ماتحت فرشتوں کی فوج ہو اور جس کے اشارہ پر وہ حرکت میں آتے ہوں اس کے کام میں شیطانی قوتوں کے دخل انداز ہونے کا کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے؟

۲۴ حضرت جبریل علیہ السلام کی صفتِ امانت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ کلام الٰہی کو جوں کا توں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا رہے ہیں۔ ان کی طرف سے کسی کمی وبیشی کا ہرگز احتمال نہیں ہے۔

قرآن کے لانے والے فرشتہ کا یہاں جو تعارف کرایا گیا ہے، اس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ یہ کلام لفظاً لفظاً ارشاد الٰہی (word of god) ہے، جس کو نہایت اہتمام کے ساتھ اور نہایت پاکیزہ ذریعہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جا رہا ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش کا کوئی امکان نہیں ہے۔

۲۵ ساتھی سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور خطاب اہل مکہ سے ہے، جن کے درمیان آپ نے ساری زندگی بسر کی اور ایک دانشمند انسان ہی کی حیثیت سے آپ متعارف رہے۔ ایسی شخصیت کو دیوانہ قرار دینا ایک بے تکی بات تھی۔ لیکن منکرینِ قرآن آپ کی مخالفت میں ایسے اندھے ہو گئے تھے کہ اس قسم کی بے تکی باتیں کہتے ہوئے ان کو ذرا تامل نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آپ کے دعوئے رسالت کو دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ان عقلمندوں کی سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی کہ آپ کی پیش کردہ کتاب ایسی حکیمانہ باتوں سے پُر اور ایسی پاکیزہ تعلیمات پر مشتمل ہے کہ اس کی نظیر پیش کرنے سے دنیا قاصر ہے۔ پھر کیا کوئی دیوانہ آج تک حکیمانہ باتیں پیش کر سکا ہے یا کسی مجنون نے لوگوں کے اخلاق سنوارے ہیں؟ سچ ہے ۔

؎ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

۲۶؎ یعنی وحی لانے والے فرشتہ کو اپنی اصل شکل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کے کھلے کنارہ پر دیکھا تھا اس لئے اس میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو ان کی اصل شکل میں دیکھا تو ان کے چھ سو پَر تھے اور ان کے عظیم وجود سے آسمان و زمین کے درمیان کی فضا بھر گئی تھی ۔ (مسلم کتاب الایمان) اس سے ان کی زبردست طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۷؎ یعنی جو وحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی جارہی ہے اس میں ملأ اعلیٰ کے حقائق کا بھی انکشاف ہے اور قیامت کی آمد کی خبر بھی۔ ان باتوں سے لوگوں کو باخبر کرنے میں آپ کسی بخل اور تنگی سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ بلکہ اپنا فرض منصبی سمجھ کر اسے بے کم و کاست لوگوں تک پہنچانے میں سرگرم ہیں۔ تاکہ لوگ ہوش میں آئیں اور اپنے رب کی ہدایت کو قبول کریں۔

گویا وحی الٰہی کا یہ پورا سلسلہ آسمان سے لے کر زمین تک سِلْسِلَةُ الذَّهَبِ (سونے کی زنجیر) ہے، جس کی کوئی کڑی بھی ناقص نہیں ہے کہ آدمی کے لئے شبہہ کرنے کی کوئی گنجائش ہو۔

۲۸؎ نزول قرآن کے زمانہ میں کہانت کا رواج تھا۔ کاہن (Soothsayers) غیب کی خبریں جاننے کے دعویدار ہوتے۔ اور شیاطین جن کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ آسمان میں پرواز کر کے غیب کی خبریں لاتے ہیں۔ جھوٹی خبریں ان پر القاء کرتے اور وہ ان میں مزید جھوٹ ملا کر بیان کرتے۔ وہ چونکہ مستقبل کا حال بیان کرنے کے دعویدار ہوتے تھے اس لئے انہیں لوگوں سے نذرانے وصول کرنے اور اپنی دوکان چمکانے کا خوب موقع ملتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وحی الٰہی اور قیامت کی آمد کی خبر سن کر منکرین قرآن نے آپ پر کہانت کا الزام لگا کر وحی الٰہی کے بارے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ القائے شیطانی ہے۔ یہاں ان کے اسی الزام کی تردید کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے شیطان کو اس کلام پاک سے کیا نسبت ہوسکتی ہے۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

کیا کسی شیطانی کلام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ انسان کو خدا سے جوڑے۔ اس میں بصیرت کی روشنی پیدا کرے، اس کے اخلاق کو سنوارے، اس کے خیالات میں پاکیزگی پیدا کرے، اس کے کردار کو بلند کرے اور سماج میں بھلائیوں کی پرورش کے لئے اسے آمادہ کرے۔ اگر شیطانی کلام کی یہ خصوصیات ہوسکتی ہیں تو ماننا پڑے گا سب سے بڑا نیک صفت اور مصلح شیطان ہی ہے۔ جب کہ کوئی شخص بھی اس کا نام اس پر لعنت بھیجے بغیر نہیں لیتا۔ ورنہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر القائے شیطان کا الزام لگانے والے بجائے خود القائے شیطانی کا شکار ہیں۔ اس لئے اتنی موٹی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

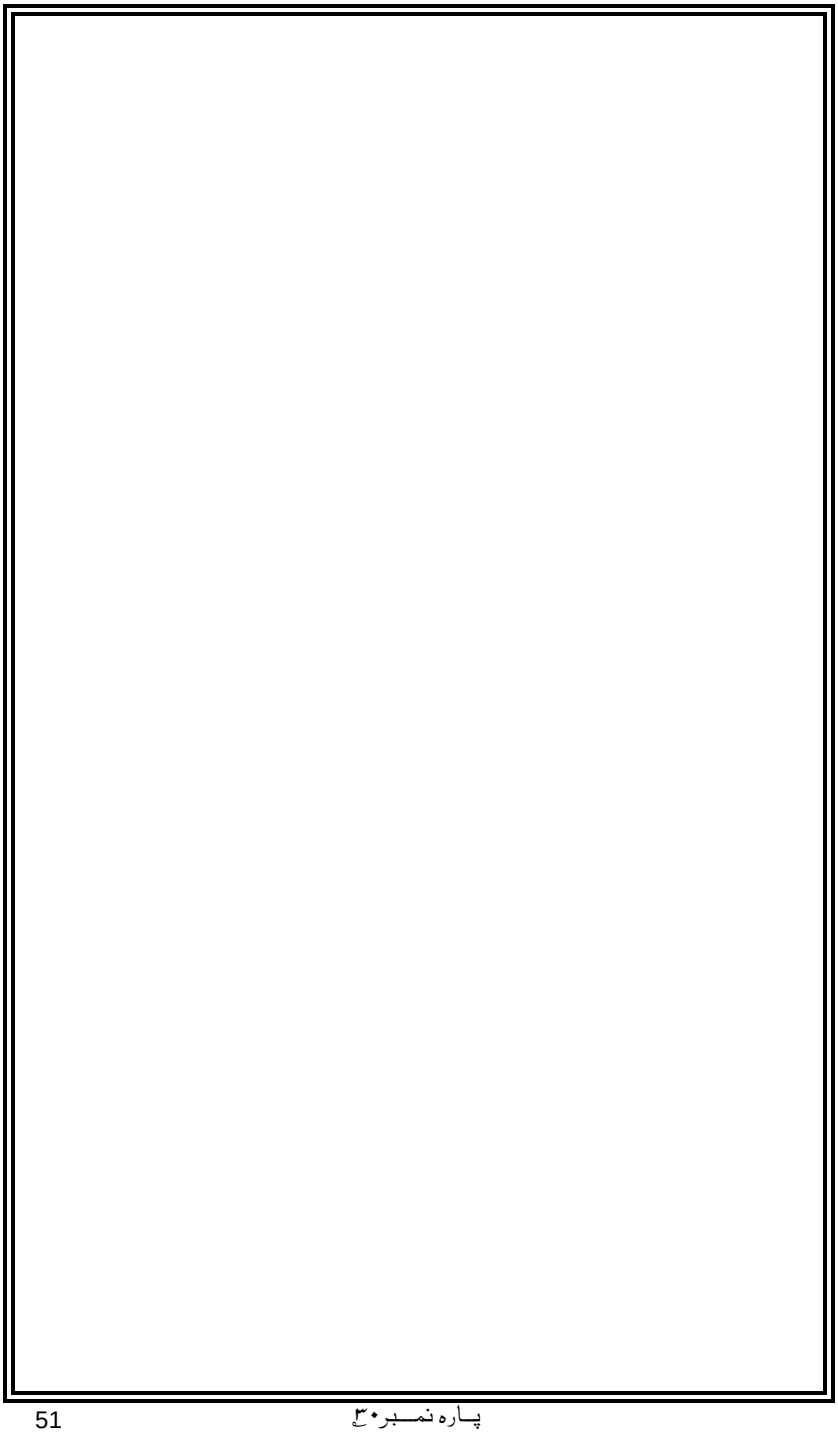

اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۲۷﴾	۲۷ یہ تو دنیا والوں کیلئے ایک یاددہانی ہے۔
لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ ؕ﴿۲۸﴾	۲۸ تم میں سے ہر اس شخص کے لئے جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے۔۲۹
وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۹﴾	۲۹ اور تم نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔۳۰

۲۹ یعنی قرآن یاددہانی اور نصیحت تو ہے سارے انسانوں کے لئے۔لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو راہ راست اختیار کرنا چاہیں، جو طالب حق نہ ہو وہ اس چشمۂ ہدایت سے فیضیاب نہیں ہوسکتا۔

۳۰ یعنی گو نصیحت حاصل کرنے اور ہدایت پانے کے لئے انسان کا چاہنا شرط اوّل ہے۔لیکن یہ کام توفیق الٰہی کے بغیر انجام نہیں پاسکتا اللہ کی مشیت انسان کی مشیت پر غالب ہے اس لئے انسان اس گھمنڈ میں مبتلا نہ رہے کہ وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔

(۸۲) الانفطار

نام پہلی ہی آیت میں آسمان کے انفطار (پھٹ جانے) کی خبر دی گئی ہے۔اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام الانفطار ہے۔

زمانۂ نزول سورہ بالاتفاق مکی ہے اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اور سورہ تکویر کا زمانۂ نزول قریب قریب ایک ہی رہا ہوگا یعنی مکہ کا ابتدائی دور۔

مرکزی مضمون اس سورہ کا بھی مرکزی مضمون جزائے عمل ہی ہے۔لیکن استدلال ایک دوسرے پہلو سے کیا گیا ہے اور اس اہتمام سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، جو ہر شخص کی عملی زندگی کو ریکارڈ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں قیامت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔اور بتایا گیا کہ جب یہ حادثۂ عظیم رونما ہو گا تو انسان کا۔کیا دھرا سب اس کے سامنے آجائے گا۔

آیت ۶ تا ۸ میں انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ جس خدا نے انسان کو بہترین قالب میں ڈھالا اور اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا اسے کیا من مانی کرنے کے لئے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ اس کی اپنے خدا کی ساتھ وفاداری اور غیر وفاداری کا امتحان نہیں ہوگا؟ اور کیا وہ اس کے حضور اپنے طرز عمل کے لئے جوابدہ نہیں قرار پائے گا۔؟

آیت ۹ تا ۱۲ میں اس اہتمام کا ذکر ہے، جو اللہ نے ہر شخص کے اعمال کو ضبط تحریر میں لانے کیلئے کر رکھا ہے۔

آیت ۱۳ تا ۱۹ میں مختصر الفاظ میں نیکوکاروں اور بدکاروں کا انجام سامنے لایا گیا ہے۔اور متنبہ کیا گیا ہے کہ پیشی کے دن کسی کے بس میں کچھ نہ ہوگا۔اور سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوں گے۔

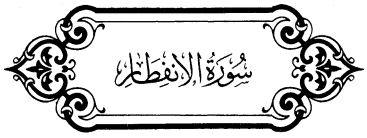

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۸۲) سورۃُ الانفطار

آیات ۱۹

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱	۱ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۱
وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲	۲ اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ ۲
وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳	۳ اور جب سمندر بہادئے جائیں گے۔ ۳
وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴	۴ اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی۔ ۴
عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵	۵ اس وقت ہر شخص کو معلوم ہو جائے گا کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے؟ اور پیچھے کیا چھوڑا ہے؟ ۵
يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶	۶ اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے رب کریم کے بارے میں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے؟ ۶
الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝۷	۷ جس نے تجھے بنایا، اور ٹھیک ٹھیک (انسان) بنایا۔ اور تیری بناوٹ میں اعتدال رکھا۔
فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝۸	۸ اور جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔ ۷
كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝۹	۹ نہیں ! ۸ مگر تم جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو۔ ۹
وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝۱۰	۱۰ حالانکہ تم پر نگراں مقرر ہیں۔ ۱۰

۱ اس مادی دنیا کو دیکھ کر انسان ماضی میں یہ خیال کرتا رہا ہے کہ اس کے یہ لیل ونہار ہمیشہ یہی رہیں گے۔ اور وہ کبھی کسی حادثہ سے دوچار ہونے والی نہیں۔ اور جہاں تک موجودہ سائنس کا تعلق ہے اس کی ترقی نے انسان کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ سورج کی طاقت بھی زائل ہوسکتی ہے۔ اور یہ کائنات عظیم حادثہ سے دوچار ہوسکتی ہے۔ البتہ سائنس دانوں کے اندازہ کے مطابق یہ صورت اربوں سال بعد پیش آئے گی۔

لیکن قرآن جو کلام الٰہی ہے صرف امکان ہی کی بات نہیں کرتا، بلکہ مثبت طور پر اور واشگاف الفاظ میں یہ خبر دیتا ہے کہ عنقریب یہ کائنات عظیم حادثہ سے دوچار ہوگی۔ اور زمین تو زمین آسمان کا نظام بھی درہم برہم ہوجائے گا۔ تاکہ ایک نئی دنیا ایک نئے نظام کے ساتھ وجود میں لائی جائے۔ ظاہر ہے نئی تعمیر کے لئے تخریب ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے جہان نو کی تعمیر کے لئے اس دنیا کی شکست وریخت کچھ بھی تعجب خیز نہیں۔

قیامت کے دن آسمان وزمین کے درہم برہم ہوجانے کے ذکر سے بائبل بھی خالی نہیں ہے۔

''اس دن آسمان بڑے شوروغل کے ساتھ برباد ہو جائیں گے اور اجرام فلک حرارت کی شدت سے پگھل جائیں گے۔ اور زمین اور اس پر کے کام جل جائیں گے۔'' (۲۔ پطرس ۳:۱۰)

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن جس حادثہ عظیم کی خبر دے رہا ہے، وہ کوئی نئی خبر نہیں ہے جو قرآن نے پہلی مرتبہ دی ہو، بلکہ نوع انسانی کو وحی الٰہی کے ذریعہ برابر آگاہ کیا جاتا رہا ہے۔ البتہ قرآن جتنے مؤثر پیرایہ میں اور جس تفصیل کے ساتھ قیامت کی تصویر کشی کر رہا ہے، اس کی نظیر ان تحریف شدہ آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب میں بھی ملنا مشکل ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ قرآن کے اس بیان سے قیامت کے بارے میں زبردست یقین پیدا ہوجاتا ہے۔ اور دل ودماغ کو ایسا جھٹکا لگتا ہے کہ دنیا کے بارے میں انسان کے زاویۂ نظر میں عظیم تبدیلی رونما ہوجاتی ہے۔

۲ ستارے بزم جہاں کی رونق ہیں۔ لیکن جب یہ بزم ہی ختم کر دی جائے گی تو ان قمقموں کے باقی رہنے کا کیا سوال؟ جس قانونِ کشش نے ان کو خلا میں منظم کر رکھا ہے اس میں ذرا سا اختلال ان کو منتشر کرنے کیلئے کافی ہے۔ ستاروں کے گرنے کا ذکر انجیل میں بھی موجود ہے۔

''سورج تاریک ہوجائے گا اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور ستارے آسمان سے گریں گے اور آسمانوں کی قوتیں ہلائی جائیں گی۔'' (متی ۲۴: ۲۹)

۳ یعنی سمندر جوش میں آکر اپنے حدود کو توڑ کر بہہ پڑیں گے۔ اور ساتھ ہی جیسا کہ سورۂ تکویر میں بیان ہوا، بھڑک اٹھیں گے۔

۴ قبروں کے اکھیڑ دیئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جوں ہی قیامت کا دوسرا صور پھونک دیا جائے گا، زمین کے اندر سے مردے اس طرح باہر نکل پڑیں گے جیسے قبریں اکھیڑ کر مردوں کو باہر نکالا گیا ہو۔ قیامت تک جتنے انسان بھی پیدا ہوئے اور مر گئے ان سب کو زمین اُگل دے گی۔ خواہ کوئی قبر میں دفن ہوا ہو یا سمندر میں غرق ہوا ہو اور خواہ کسی کی لاش جلا دی گئی ہو یا خلا میں اسکے اجزاء منتشر ہوگئے ہوں۔

۵ آگے بھیجنے (مَـا قَـدَّمَـتْ) سے مراد آدمی کا اچھا یا برا عمل ہے، جو اس نے اخروی زندگی کے لئے کیا۔ گویا انسان روزانہ اپنے اعمال کا پارسل نئی دنیا کو بھیجتا ہے جہاں قیامت کے دن وہ پہنچنے والا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص صدا بہار پھولوں کا پارسل بھیجتا ہے تا کہ اس کے لئے جنت کی بہار بن جائیں۔ اور کوئی شخص آتش گیر مادہ کا پارسل بھیجتا ہے تا کہ اس کو جلانے کے لئے ایندھن کا کام دے۔

پیچھے چھوڑنے (مَـــا اَخَّـــرَتْ) سے مراد تقویٰ اور نیکی کے وہ کام ہیں، جو انسان کے کرنے کے تھے، لیکن اس نے نہیں کئے۔ اس طرح قیامت کے دن ہر شخص کو اس کی کارکردگی اور اس کی کوتاہیاں Commission & Ommissions اچھی طرح معلوم ہو جائیں گی۔

۶ یہاں خدا کی صفت کریمی کا حوالہ دینے سے مقصود اس کے محسن ہونے کا احساس دلانا ہے، تا کہ آدمی کے اندر احساس ذمہ داری ابھرے۔ خدا کے محسن اور مہربان ہونے کا تقاضا یہ تھا کہ آدمی اس کی طرف لپکتا اور اس کا شکر گذار او روفادار بندہ بن کر رہتا۔ لیکن وہ اس سے بے نیازی اختیار کرتا ہے اور اس کے حضور اپنے کو جوابدہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہ سراسر دھوکا ہے جس میں انسان مبتلا رہتا ہے۔ لیکن اس دھوکہ میں پڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف خواہش پرستی ہے جو اسے اپنے مہربان رب سے بغاوت پر آمادہ کرتی ہے۔

۷ انسان دنیا کی ممتاز ترین مخلوق ہے۔ اور اس کی تخلیق میں خالق کی صناعی پوری طرح نمایاں ہے۔ انسان کا پہلے ہیولیٰ (لوتھڑا) تیار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسے اس طرح درست کیا جاتا ہے کہ وہ متناسب اعضاء کی شکل میں متشکل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے قویٰ میں ایسا توازن رکھا جاتا ہے کہ اس کا وجود دنیا کی سب سے معتدل مخلوق ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ مزید یہ کہ نوع انسانی کا ہر فرد شکل وصورت میں دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ دنیا میں اربوں انسان پیدا ہوتے ہیں اور ان سب کا موڈل ایک نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک کا موڈل الگ ہوتا ہے، تا کہ اس کی انفرادیت اور اس کا تشخص برقرار رہے۔ غرضیکہ انسان کی ساخت اور اس کی شکل وصورت کے مشاہدہ سے اس کے خالق کے کمال قدرت اور حیرت انگیز صناعی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ انسان کے حق میں وہ کتنا بڑا محسن ہے، جس نے اس کو دنیا کی بہترین مخلوق بنا کر اٹھایا !

۸ یعنی تمہارا یہ گمان صحیح نہیں کہ دنیا یونہی چلتی رہے گی، نہ قیامت آئے گی اور نہ خدا کے حضور تمہاری پیشی ہوگی۔

۹ یعنی قیامت کی آمد کی جو خبر قرآن دے رہا ہے اس کو جھٹلانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم جزاوسزا کی حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ کیوں کہ اس کو تسلیم کرنے کے بعد انسان کو خواہشات نفسانی کے علی الرغم ایک ذمہ دارانہ زندگی گذارنی پڑتی ہے۔

آج بھی انسان نے جزاوسزا کے مذہبی تصور سے بچنے کے لئے کائنات کی ایسی ''سائنٹیفک'' توجیہہ کی ہے کہ ذہن نہ خدا کی طرف منتقل ہوتا ہے اور نہ قیامت کی طرف۔

۱۰ یعنی تم جزاوسزا کو جھٹلانا چاہو تو جھٹلاؤ، اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جزاوسزا کا معاملہ لازماً پیش آنا

ہے۔اوراس کے لئے اللہ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ تمہارے اعمال کو ریکارڈ کیا جائے۔

نگراں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسان کے قول وفعل کا ریکارڈ تیار کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے مقرر ہیں۔ ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے لگے ہوتے ہیں۔ایک دائیں جانب اور دوسرا بائیں جانب۔

كِرَامًا كٰتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾	۱۱ گرامی قدر کاتب۔ ۱۱
يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾	۱۲ جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔ ۱۲
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۱۳﴾	۱۳ یقیناً نیکو کار ۱۳ عیش و نشاط میں ہوں گے۔
وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ﴿۱۴﴾	۱۴ اور بدکار ۱۴ جہنم میں۔
يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾	۱۵ وہ اس میں جزا کے دن داخل ہوں گے۔
وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾	۱۶ اور اس سے غائب نہ ہو سکیں گے ۔ ۱۵
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۷﴾	۱۷ اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیا ہے ؟
ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾	۱۸ پھر (سن لو!) تمہیں کیا خبر کہ جزا کا دن کیا ہے؟ ۱۶
يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾	۱۹ وہ دن جب کوئی شخص کسی کے لئے کچھ نہ کر سکے گا اور معاملات صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہوں گے۔ ۱۷

۱۱؎ مراد قول وعمل کو ریکارڈ کرنے والے فرشتے ہیں۔ان کی صفت ''کراماً'' (گرامی قدر، معزز) بیان کی گئی ہے، جس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ انتہائی ذمہ داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ان کے بارے میں نہ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص نیکی کرے اور یہ لکھیں نہیں۔اور نہ یہ اندیشہ ہوسکتا ہے کہ ایک کی بدی دوسرے کے کھاتہ میں جمع کردیں۔یہ خفیہ طریقہ پر مگر باوقار انداز میں نہایت ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتے رہتے ہیں۔لہٰذا ان کو دنیوی حکومتوں کی سی آئی ڈی پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا جس کے علم کا دائرہ بھی محدود ہوتا ہے۔اور جو نافرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے الٹی سیدھی رپورٹ پیش کرتی رہتی ہے۔البتہ یہ حقیقت ہے کہ اس خفیہ پولس پر بھی اللہ کی ''خفیہ پولس'' مقرر ہے، جو ان کی ساری حرکتوں کو ضبط تحریر میں لا رہی ہے۔

فرشتوں کی کتابت کی نوعیت تو اللہ ہی کو معلوم ہے۔البتہ موجودہ سائنس اور ٹیکنولوجی کے دور میں یہ سمجھنا ہمارے لئے کچھ مشکل نہیں رہا کہ انسان کی تمام حرکات وسکنات کو اور اس کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔فلم، ریڈیو، فوٹو، ٹیلیویژن اور ٹیپ ریکارڈنگ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔اور اب تو یہ بھی ممکن ہوا ہے کہ زمین پر بیٹھ کر ہم لاکھوں اور کروڑوں میل دور چاند، مریخ اور زحل جیسے سیاروں کی تصویں منگائیں۔اصل میں موجودہ سائنس نے دو اہم قوانین قدرت کا انکشاف کیا ہے، جن میں سمجھنے والوں کے لئے بہت کچھ رہنمائی کا سامان موجود ہے۔ایک یہ کہ ہماری تصویر ہر لمحہ فضا میں بنتی رہتی ہے۔اسی تصویر کو محفوظ کرنے کی تکنک (Technic) سائنس نے اختیار کی ہے۔

اسی طرح ہماری آواز ہوا میں لہریں پیدا کرتی ہے۔ان لہروں کو کیسٹ میں محفوظ کر کے اسی آواز کو پھر سنا جاسکتا ہے۔یہ سب کچھ جب انسان کے لئے ممکن ہوا ہے۔اور ممکن بھی ایسا کہ اسی پر موجودہ تمدن کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔تو پھر انسان کے لئے یہ باور کرنا کیا مشکل ہے کہ جس خدا نے یہ قانون قدرت بنایا ہے، اس نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ ہر شخص کی پوری زندگی کو فلمایا جائے۔اور قیامت کے دن ہماری بولتی فلم ہمارے سامنے پیش کردی جائے۔اس وقت اپنی بولتی فلم کو دیکھ کر انسان کے ہوش ٹھکانے نہیں رہیں گے۔مگر انسان آج ہی یہ یقین کرلے کہ اس کی پوری زندگی کو فلمایا جارہا ہے۔اور اس کی بولتی فلم اسے دکھائی جانے والی ہے تو انسان اپنے رویہ میں بڑا محتاط اور ذمہ دار ہوگا۔اور کبھی ایسا کام کرنے یا ایسی بات زبان سے نکالنے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا جو کل آخرت کے ٹیلیویزن پر وہ دیکھنا اور سننا پسند نہیں کرے گا۔

۱۲؎ یہاں افعال کا ذکر ہے اور سورہ ''ق'' میں صراحت ہے کہ جو لفظ بھی انسان اپنی زبان سے نکالتا ہے، اس کو نوٹ کرنے کے لئے ایک فرشتہ موجود ہوتا ہے۔اور یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دو ہوتے ہیں جو دائیں اور بائیں جانب بیٹھے نگرانی کررہے ہوتے ہیں۔

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ۔ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۔ (ق ۱۷۔۱۸)

۱۳؎ سورہ کا مضمون اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نیکو کار وہ لوگ ہیں، جن کا بنیادی وصف رب کریم کے حضور جوابدہی کا احساس ہے۔

۱۴؎ جو لوگ رب کریم کے حضور جوابدہی کے قائل نہ ہوں اور آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلائیں، وہ قرآن کی اصطلاح میں فاجر (بدکار) ہیں۔ کیوں کہ جہاں خدا کے حضور پیشی کا تصور نہ ہو وہاں پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔

۱۵؎ یعنی وہ جہنم میں لازماً داخل ہوں گے۔ اور داخل ہونے کے بعد اس سے نکل بھاگنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو گی۔ وہ ہمیشہ کے لئے اسی میں پڑے رہیں گے۔

۱۶؎ سوال کو اس لئے دہرایا گیا ہے تا کہ جزا کے دن کی اہمیت واضح ہو جائے۔ اور عدالت خداوندی میں حاضری کے تصور سے انسان لرز اٹھے۔

۱۷؎ یعنی دنیا میں انسان جو بااختیار نظر آتا ہے قیامت کے دن بالکل بے اختیار ہو گا۔ خواہ دنیا میں وہ شاہ رہ چکا ہو یا گدا۔ اس روز انسان کی بے بسی کا یہ حال ہو گا کہ وہ اپنے ہی لئے کچھ کر نہ سکے گا۔ کُجا یہ کہ دوسروں کیلئے کرے۔ اختیار اور اقتدار سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہو گا اور معاملات کے فیصلے وہ خود فرمائے گا۔

یہ ہے عدالت خداوندی میں پیشی کا وہ تصور، جو قرآن پیش کرتا ہے اور جو عقیدہ آخرت کا لازمی جز ہے۔ بخلاف اس کے عقیدۂ تناسخ ایک چکر ہے جس میں عدالت خداوندی میں پیشی کا کوئی مرحلہ پیش آنے والا ہی نہیں ہے۔ اس سے اسلام کے عقیدۂ آخرت اور مشرکین کے عقیدۂ تناسخ کے بنیادی فرق کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

(۸۳) المطفِّفِین

نام سُورہ کے آغاز ہی میں مطففین (ناپ تول میں کمی کرنے والوں) کو وعید سنائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام (المُطفِّفِین) ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی تنزیل ہے، جب کہ قرآن کی دعوت اہل مکہ کے سامنے پیش ہو چکی تھی۔وہ یوم جزا کا انکار کر رہے تھے اور اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے تھے۔

مرکزی مضمون رب العالمین کے حضور پیشی اور جزائے عمل ہے۔اس کا احساس دلانے کے لئے معاملات کی اس خرابی پر گرفت کی گئی ہے، جس میں آخرت کا احساس نہ رکھنے والے لوگ عام طور سے مبتلا ہوتے ہیں۔

نظم کلام سورہ انفطار سے اس کا ربط بالکل واضح ہے۔اس میں آگاہ کیا گیا تھا کہ اعمال کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے فرشتے مقرر ہیں۔اس سورہ میں اس حقیقت سے باخبر کیا گیا ہے کہ انسان کی عملی زندگی کا ریکارڈ اس کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں محفوظ رکھنے کا انتظام اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے۔

آیت ۱ تا ۶ میں کاروباری معاملات میں بددیانتی اور فریب کاری پر گرفت کرتے ہوئے خدا کے حضور جوابدہی کا احساس دلایا گیا ہے۔

آیت ۷ تا ۱۷ میں اس حقیقت سے باخبر کیا گیا ہے کہ بدکاروں کا نامۂ اعمال ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں ایک خاص دفتر میں ہے جو مجرمین ہی کے لئے مخصوص ہے۔اور قیامت کے دن اس ریکارڈ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔اور اس روز ان کا انجام بڑا ہی حسرتناک ہوگا۔

آیت ۱۸ تا ۲۸ میں نیک کردار لوگوں کو خوشخبری دی گئی ہے کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں اعلیٰ درجہ کے دفتر میں ہے، جو نیکوکاروں کے لئے مخصوص ہے، محفوظ کیا جاتا ہے۔اور قیامت کے دن اس ریکارڈ کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے گا۔اور اس روز وہ فائز المرام ہوں گے۔

آیت ۲۹ تا ۳۶ میں اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ منکرین کے طنز و تشنیع سے کبیدہ خاطر نہ ہوں۔آج وہ تم پر ہنس رہے ہیں مگر کل تم ان پر ہنسو گے۔

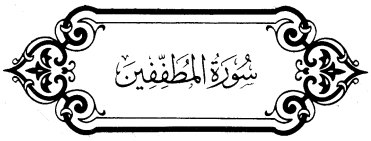

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ①

الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ②

وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ③

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ④

لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ⑤

يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ⑥

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ⑦

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ⑧

كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ⑨

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑩

الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ⑪

(۸۳) سُورۃُ المطففین

آیات ۳۶

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ تباہی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے۔

۲ جو لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں۔

۳ اور جب ان کو ناپ کر، یا تول کر دیتے ہیں تو گھٹا کر دیتے ہیں۔

۴ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ انہیں اٹھایا جائے گا؟ ۱

۵ ایک بڑے دن۔ ۲

۶ جس دن سب لوگ رب العالمین کے حضور کھڑے ۳ ہوں گے۔

۷ (ان کا گمان صحیح) نہیں۔ ۴ یقین جانو بدکاروں کا نامۂ عمل سجّین میں ہوگا۔

۸ اور تمہیں کیا معلوم کہ سجّین کیا ہے؟

۹ وہ ایک ریکارڈ آفس ہے۔ ۵

۱۰ تباہی ہے اس دن انکار کرنے والوں کے لئے!

۱۱ جو روز جزا کا انکار کرتے ہیں۔

۱؎ ان ابتدائی آیات میں ناپ تول میں کمی کرنے والوں پر سخت گرفت کی گئی ہے۔ یہ گرفت اگرچہ ڈنڈی مارنے اور ناپ گھٹا کر دینے پر کی گئی ہے، تاہم اس کے مفہوم میں لین دین کے معاملہ میں کی جانے والی ہر قسم کی بددیانتی اور فریب دہی شامل ہے۔ مثال کے طور پر اشیاء میں ملاوٹ کرنے (Adulteration) پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیوں کہ ملاوٹ کی صورت میں اصل شئے کو مقدار سے کم دیا جاتا ہے۔ چنانچہ دودھ میں پانی ملانے کا مطلب خالص دودھ کی مقدار کو گھٹا دینا ہے۔ اور چونکہ گھٹا دینے کا یہ عمل خریدار سے چھپا کر کیا جاتا ہے اس لئے یہ فریب دہی بھی ہے اور خسّت بھی۔

اس خرابی کی اصل وجہ قرآن نے یہ بتلائی ہے کہ ایسے لوگ خدا کے حضور پیشی کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ حالانکہ ان کا ضمیر خود اس بات کی گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور جوابدہ ہیں۔ کیوں کہ اس مجرمانہ طرز عمل کو اختیار کرنے والے لوگ، جب دوسروں سے لیتے ہیں تو ناپ بھر کر لیتے ہیں۔ اور کوئی شخص بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک دی جائے اور اس کو مقدار سے کم دیا جائے۔ بالفاظ دیگر انسانی فطرت عدل ہی کو پسند کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہر ایک کے ساتھ عدل کا معاملہ کیا جائے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کا خالق عدل ہی کو پسند کرتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت عدل کی خلاف ورزی کرتے ہیں، وہ دراصل اپنے رب کی مرضی اور اس کے اس حکم کے خلاف کام کرتے ہیں، جو ان کی فطرت میں ودیعت ہوا ہے۔ پھر ان کا رب ان کی ان مجرمانہ حرکتوں پر گرفت کیوں نہیں کرے گا؟ کیا ڈنڈی مارنے والے اور انصاف کا ترازو قائم کرنے والے دونوں یکساں ہو سکتے ہیں اور کیا دونوں کا انجام یکساں ہوگا؟ انسان کی فطرت اور اس کا وجدان اس کو یکساں تسلیم نہیں کرتا۔ یہیں سے قرآن کے بیان کی صداقت روشن ہو جاتی ہے کہ انسان کو ایک دن جی اٹھنا ہے۔ اور اپنے رب کے حضور اپنے طرز عمل کے سلسلہ میں جوابدہی کرنی ہے۔ اور اس کے مطابق جزا یا سزا پانا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ انسان، جب خدا کے حضور جوابدہی کا تصور نہیں رکھتا تو اس کے لینے کے پیمانے اور ہوتے ہیں اور دینے کے اور۔ وہ نہ صرف اپنا حق پورا پورا وصول کرنا چاہتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر بھی ڈاکہ ڈالے۔ اس ذہنیت کی اصلاح کا صحیح اور مؤثر ذریعہ خدا کے حضور جوابدہی کا تصور ہی ہے۔ اسلئے معاشی خرابیوں کو دور کرنے کا مسئلہ ہو یا سماجی بگاڑ کے سدھار کا مسئلہ، افراد میں یہ شعور بیدار کئے بغیر حقیقی اصلاح ممکن نہیں ہے۔

۲؎ مراد قیامت کا دن ہے، جو نہایت سخت ہوگا۔

۳؎ عدالت خداوندی میں حاضری کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ آدمی اس پر سے سرسری طور سے گذر جائے۔ بلکہ یہ نہایت سخت اور کٹھن مرحلہ ہوگا جو ہر شخص کو لازماً پیش آنا ہے۔ لہٰذا اگر وہ چاہتا ہے کہ سلامتی کے ساتھ اس مرحلہ سے گذر جائے تو اسے اپنے دل و دماغ میں اس تصور کو بسانا ہوگا اور اسی بنیاد پر زندگی گذارنا ہوگی۔

ذرا تصور کیجئے عدالت خداوندی کا، جب کہ سارے انسان زندہ ہو کر میدان حشر میں جمع ہو چکے ہوں گے۔ فرمانروائے کائنات عدالت برپا فرمائے گا۔ ہر شخص کی اس کے حضور پیشی ہوگی اور اسے اپنی پوری زندگی کا حساب

پیش کرنا ہوگا۔فرشتے اس بات کے منتظر ہوں گے کہ کس کے حق میں کیا فیصلہ ہوتا ہے،تا کہ اس کا نفاذ عمل میں لائیں۔ اس وقت انسان بالکل بے بس ہوگا۔اگر انسان آج اس بے بسی کا تصور کر لے،تو خوفِ خداوندی سے کانپ اٹھے اور اس کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے۔حدیث نبوی میں قیامت کے موقف کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

یَومَ یَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِینَ حَتَّی یَغِیبَ اَحَدُھُم فِیْ رَشْحِہٖ اِلٰی أَنْصَافِ اُذُنَیْہِ (مسلم کتاب ا لجنۃ)

''جس روز لوگ رب العالمین کے حضور پیشی کے لئے کھڑے ہوں گے تو وہ پسینہ میں اس طرح شرابور ہوں گے کہ بعض لوگوں کے کان کے نصف حصہ تک کا جسم پسینہ میں ڈوب رہا ہوگا۔''

اللہ اکبر! کیسا شدید مرحلہ ہوگا جس سے اللہ کے رسول نے انسان کو پیشگی باخبر کر دیا ہے! کاش کہ لوگ قیامت کے موقف کے تصور سے اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کیلئے تیار ہوتے!

۴؎ یعنی ان کا یہ گمان غلط ہے کہ نہ دوبارہ جی اٹھنا ہے اور نہ خدا کے حضور جوابدہی کرنا ہے۔

۵؎ ''سجّین''، سجن سے بنا ہے، جس کے معنیٰ قید خانہ کے ہیں۔یہاں یہ لفظ قرآن نے اپنی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔اور اس کی خود ہی یہ تشریح کی ہے کہ وہ ''کتاب مرقوم'' ہے یعنی ''ریکارڈ آفس''۔

یہ عالم برزخ کی ایک بڑی حقیقت ہے، جس سے انسان کو باخبر کیا گیا ہے۔ہر ہر فرد کی عملی زندگی کا ریکارڈ تیار کرنے پر فرشتوں کو جو مامور کیا گیا ہے اس کا سلسلہ اس کی موت تک جاری رہتا ہے۔موت کے بعد اس کا نامۂ عمل عالم برزخ میں منتقل ہو جاتا ہے۔اگر وہ بدکار تھا تو اس کے نامۂ عمل کا اندراج ''سجّین'' نامی ریکارڈ آفس میں کیا جاتا ہے۔اور اگر وہ نیکوکار تھا تو جیسا کہ آگے بیان ہوا ہے، اس کا اندراج ''علّیین'' میں ہوتا ہے۔اس سے اصلاً یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ہر ہر شخص کے نامۂ عمل کو اس کے مرنے کے بعد محفوظ رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے اہتمام کر رکھا ہے اور قیامت کے دن اس کو کھول دیا جائے گا۔اور اسی کی بنیاد پر عدالت خداوندی میں فیصلہ ہوگا۔

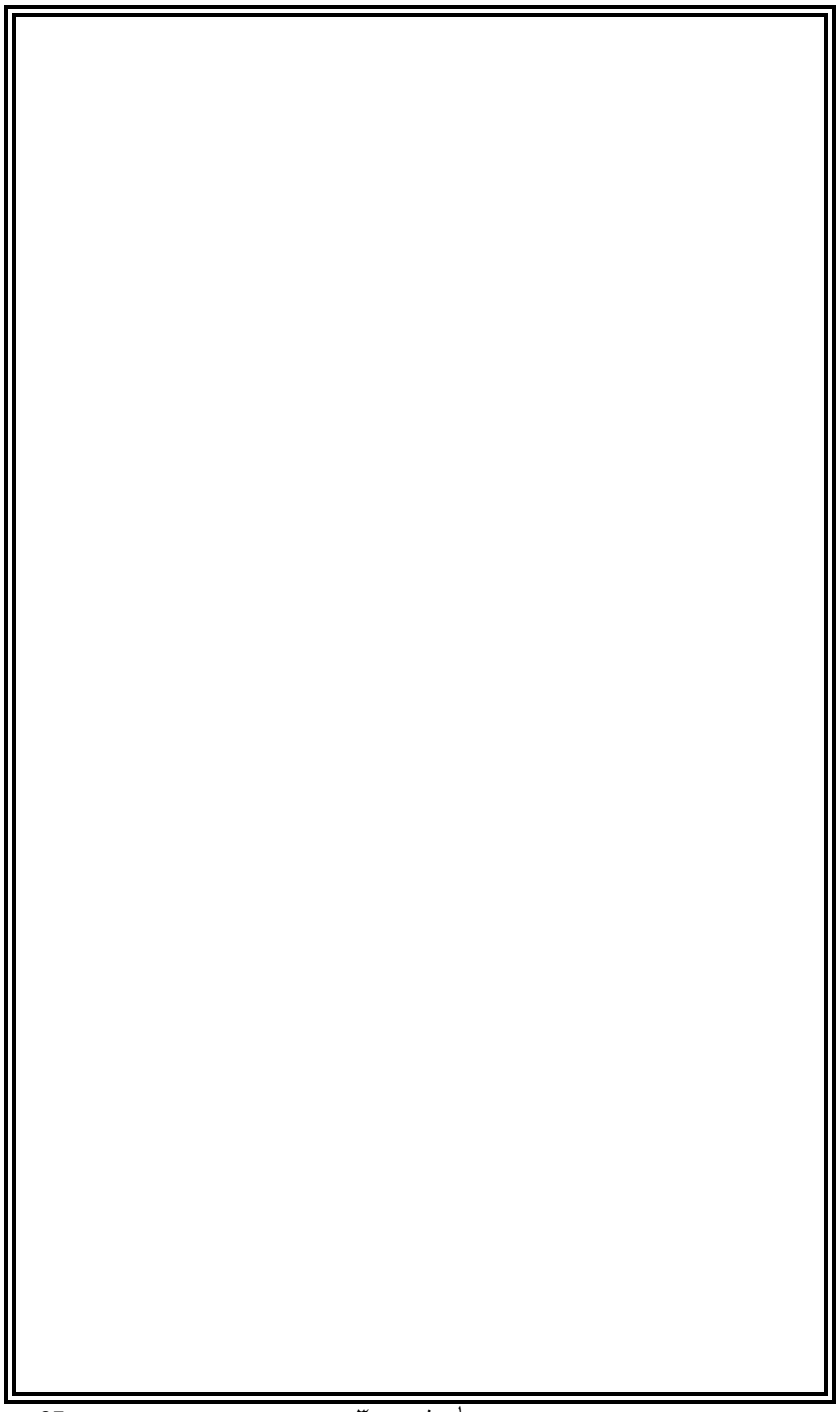

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿١٢﴾	۱۲ اور اس کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں، جو حد سے گذرنے والے ۶ گنہگار ۷ ہوتے ہیں۔
اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾	۱۳ ایسے شخص کو جب ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو اگلے لوگوں کے فسانے ہیں۔ ۸
كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٤﴾	۱۴ نہیں، ۹ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال (بد) کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ ۱۰
كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴿١٥﴾	۱۵ ہرگز نہیں۔ ۱۱ اس دن وہ اپنے رب سے دور رکھے جائیں گے۔ ۱۲
ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ﴿١٦﴾	۱۶ پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔
ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿١٧﴾	۱۷ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے، جس کا تم انکار کرتے رہے ہو۔
كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿١٨﴾	۱۸ (ان کا دعویٰ صحیح) نہیں۔ ۱۳ یقیناً نیک کردار لوگوں کا نامۂ اعمال علّیین میں ہوگا۔
وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿١٩﴾	۱۹ اور تمہیں کیا معلوم کہ علّیین کیا ہے؟
كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿٢٠﴾	۲۰ وہ ایک ریکارڈ آفس ہے۔ ۱۴
يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿٢١﴾	۲۱ جہاں مقربین کی (بارگاہ الٰہی میں) حضوری ہوتی ہے۔ ۱۵
اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿٢٢﴾	۲۲ بے شک نیکوکار عیش میں ہوں گے۔

۶؎ حد سے گذر جانے والے سے مراد حدودِ بندگی سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں۔یعنی جو اپنے کو اللہ کا بندہ نہیں سمجھتے بلکہ خود مختار سمجھ کر من مانی کرتے رہتے ہیں۔

۷؎ گنہگار سے مراد معصیت میں مبتلا ہونے والے لوگ ہیں۔جب انسان خدا کا بندہ بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو پھر اس کی پوری زندگی گناہ، برائی، جرم اور معصیت کی زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ایسا شخص روز جزا کو کیوں ماننے لگے؟

۸؎ یعنی قرآن میں کافر قوموں پر عذاب خداوندی کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں، ان سے سبق لینے کے بجائے یہ لوگ ان کو افسانے اور کہانیاں قرار دیتے ہیں۔موجودہ زمانہ کے منکرین بھی اسی طرح کی الزام تراشی کرتے ہیں۔ان کے نزدیک یہ سب کچھ ''دقیانوسیت'' ہے۔

۹؎ یہ تردید ہے منکرین کے اس الزام کی جو اوپر بیان ہوا۔

۱۰؎ یعنی وہ قرآن کے بارے میں اتنی غلط بات کہنے کی جسارت اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ ان کے اعمال بد نے ان کو ڈھیٹ بنا دیا ہے۔ورنہ ایک سلیم الفطرت انسان قرآن کے بارے میں ایسی نامعقول بات ہرگز نہیں کہہ سکتا۔

دل پر زنگ چڑھ جانے کی تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:

اِنَّ الْعَبْدَ اذَاخطأَ خطِیْئَۃًنُکِتَتْ فِی قَلْبِہٖ نُکْتَۃٌ سَوْدَاءُ فَاِذَا ھُوَ نَزَعَ و اِسْتَغْفَرَ وَ تَابَ صُقِلَ قَلْبُہٗ وَاِنْ عَادَ زِیْدَفِیْھَاحَتّٰی تَعْلُوَ قَلْبَہٗ وَھُوَالران ا لذی ذِکراللّٰہ کَلَّا بَل رَان عَلٰی قُلُوبِھِمْ مَا کَانُو یَکْسِبُونَ۔ (ترمذی ابواب التفسیر)

''بندہ جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبّہ لگ جاتا ہے۔اگر وہ اس سے باز آتا ہے اور استغفار اور توبہ کرتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔لیکن اگر وہ پھر گناہ کرتا ہے یہ دھبّہ بڑھ جاتا ہے۔یہاں تک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آیت کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوبِھِمْ مَا کَانُو یَکْسِبُونَ میں کیا ہے۔

۱۱؎ یعنی ان کی یہ آرزو بھی باطل ہے کہ اگر آخرت برپا ہو ہی گئی تو ہمیں، جس طرح دنیا میں ''عزت کا مقام'' حاصل ہوا ہے، خدا کے ہاں بھی شرف باریابی حاصل ہوگا۔

۱۲؎ یعنی یہ لوگ خدا کے ہاں شرف باریابی کیا حاصل کر سکیں گے۔انہیں تو اس روز اپنے رب سے دور رکھا جائے گا۔وہ اس کی عنایات سے بھی محروم ہوں گے اور اس کی شان کے جلوے دیکھنے سے بھی۔

۱۳؎ یعنی ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ اللہ کے ہاں نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں۔بلکہ اللہ تعالیٰ نے بدکاروں کا نامۂ عمل الگ محفوظ رکھنے کے لئے الگ الگ ریکارڈ آفس قائم کر رکھے ہیں۔

۱۴؎ ''علیّین'' کے لفظی معنی اعلیٰ مقامات کے ہیں۔یہاں اس لفظ کو قرآن نے اپنی خاص اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔اور اس کی تشریح خود ہی کر دی ہے کہ'' وہ کتابِ مرقوم'' ہے یعنی وہ ایک'' ریکارڈ آفس'' ہے، جہاں

باقی صفحہ ۷۰ پر

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

۲۳ شاندار تختوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہوں گے۔ ۱۶

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾

۲۴ ان کے چہروں پر تم دیکھو گے کہ خوشحالی کی بشاشت جھلک رہی ہے۔ ۱۷

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾

۲۵ ان کو ایسی شراب پلائی جائے گی جو خالص اور سربمہر ہوگی۔

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾

۲۶ یہ مہر مشک کی ہوگی۔ ۱۸ اور رغبت کرنے والوں کو چاہئے کہ بڑھ چڑھ کر اس کی رغبت کریں۔ ۱۹

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾

۲۷ اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ ۲۰

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾

۲۸ یہ ایک چشمہ ہوگا، جس میں سے مقرب (بندے) پئیں گے۔ ۲۱

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾

۲۹ جو لوگ مجرم بنے ہوئے تھے، وہ اہل ایمان پر ہنسا کرتے تھے۔ ۲۲

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾

۳۰ اور جب ان کے پاس سے گذرتے تو آنکھوں سے اشارہ کرتے۔ ۲۳

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾

۳۱ اور جب اپنے گھر والوں میں لوٹتے تو خوش خوش لوٹتے۔ ۲۴

وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾

۳۲ اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔ ۲۵

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾

۳۳ حالانکہ وہ ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ ۲۶

۱۶؎ یعنی شاہانہ انداز میں شاندار تخت پر بیٹھے، جنت کی وسیع اور پُر بہار فضاء میں اپنے رب کی نعمتوں اور اس کی شان کے جلوے دیکھ رہے ہوں گے۔

۱۷؎ نیک کردار لوگوں کو جنت میں جو زندگی میسر آئے گی وہ ایسی آسائش کی ہوگی کہ ان کے چہرے ہمیشہ تر و تازہ اور شگفتہ ہی رہیں گے۔

۱۸؎ اس میں طنز ہے دنیا کی شراب پر جو گندہ ہوتی ہے اور ڈھکن کھلتے ہی اس کی سرانڈ سے دماغ پھرنے لگتا ہے۔ اس کے برخلاف جنت کی شراب کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ ہر قسم کی آلودگی سے پاک مئے ناب ہوگی۔ اور وہ جن بوتلوں یا برتنوں میں بند ہوگی ان پر مشک کی مہر لگی ہوگی۔ اس لئے اس کی خوشبو سے دماغ معطر ہوگا اور پینے میں لذت محسوس ہوگی۔

۱۹؎ ''اس کی رغبت کریں'' سے مراد جنت کی نعمتوں کی رغبت کرنا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو ادنیٰ کے بجائے اعلیٰ چیز کا اور ختم ہونے والی چیز کے مقابلہ میں ہمیشہ باقی رہنے والی چیز کا انتخاب کرنا چاہئے۔ اور اس لحاظ سے آدمی غور کرے تو دنیا کا عیش اور اس کی لذتیں آخرت کے عیش اور اس کی لذتوں کے مقابلہ میں بالکل بے وقعت اور بے حقیقت قرار پائیں گی۔ اور دانشمندی کا تقاضہ یہی ہوگا کہ آدمی ان کا حریص بننے اور مادہ پرستی میں غرق ہونے کے بجائے اُخروی نعمتوں کا طلبگار رہنے۔ اور اس میدان میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرے۔

قرآن نے یہاں جنت کی نعمتوں کے طلب گار رہنے کی جو ترغیب دی ہے اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے، جو ''ادب برائے ادب'' کے طرز پر ''نیکی برائے نیکی'' (Virtue for the sake of virtue) کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنت اور اس کی نعمتوں کی تمنا کرتے ہوئے نیکی کرنا ایک فروتر بات ہے۔ بظاہر یہ بات اونچی سطح کی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ محض تخیل کی پرواز ہے۔ اس کو نہ انسان کی نفسیات سے کوئی مناسبت ہے۔ اور نہ ہی یہ کوئی قابل عمل بات ہے۔ نیز یہ قرآن وسنت کے نصوصِ صریحہ کے بھی خلاف ہے۔ اسلام کی تعلیم نہ تفلسف کی ہے اور نہ تخیلات کی دنیا میں پرواز کرنے کی۔ بلکہ اس کی تعلیم واقعیت پسندانہ، انسانی نفسیات کے ٹھیک ٹھیک مطابق اور اس کو عمل پر آمادہ کرنے والی ہیں۔ وہ شاعری کرنے نہیں آیا ہے بلکہ مٹی سے بنے ہوئے انسان کو جنت کا باشندہ بنانے کے لئے آیا ہے۔

۲۰؎ تسنیم کے معنیٰ بلند کرنے کے ہیں۔ یہ جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے۔ اور غالباً یہ نام اس کی اس خصوصیت کے بنا پر رکھا گیا ہے کہ اس میں سے نوش کرنے والوں کی رفعت میں مزید اضافہ ہوگا۔

۲۱؎ تسنیم اہل جنت کا سب سے اعلیٰ مشروب ہوگا۔ نیک لوگوں کو جو شراب پلائی جائے گی اس میں اس اعلیٰ مشروب کی آمیزش ہوگی، تاکہ اس کے کیف میں اضافہ ہو جائے۔ لیکن جو لوگ مقربین کے درجہ کے ہوں گے وہ براہ راست اس چشمہ سے نوش کریں گے۔ گویا لطف اندوزی اور کیف وسرور میں ان کا حصہ اتنا ہی وافر ہوگا، جتنا وافر حصہ

کہ ان کا ایمان، عمل صالح اور اللہ کے لئے قربانیاں دینے کے معاملہ میں رہا ہے۔

۲۲؎ یعنی وہ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے اور ان پر پھبتیاں کستے۔

اہل ایمان کا مذاق اڑانے کا سلسلہ تو موجودہ زمانہ میں بھی جاری ہے۔ البتہ کچھ نئے فقروں کے ساتھ۔۔ چنانچہ آج کے ''موڈرن'' لوگ اسلام کی صحیح پیروی کرنے والوں پر ملائیت Orthodoxy اور ''قدامت پسندی'' (Conservatism) کے فقرے چست کرتے ہیں۔

۲۳؎ یعنی انہوں نے اہل ایمان کی تذلیل وتحقیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ یہاں تک کہ جب ان کا گذر اہل ایمان کے پاس سے ہوتا تو وہ آپس میں ان کے خلاف کن انکھیوں سے اشارے کرتے۔

۲۴؎ ان آیات میں مخالفین کے اس رویہ کی تصویر کھینچی گئی ہے، جو اہل ایمان کے خلاف وہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد گھر واپس لوٹتے، تو بجائے اس کے کہ انہیں اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہو، وہ خوش ہوتے اور فخریہ انداز میں اس کا ذکر اپنے گھر والوں سے کرتے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ حق کو ٹھکرا دیتے ہیں ان کی نفسیات اہل حق کے بارے میں کیا ہوتی ہیں۔

۲۵؎ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اسلام کو دیگر مذاہب پر قیاس کر کے اسے بھی افیون قرار دیتے ہیں، وہ قرآن کی دعوت کو لے کر اٹھنے والوں کے بارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ عقل کے کورے ہیں۔

۲۶؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا نہ کہ دوسروں کے اعمال کا۔ لیکن یہ اپنی ذات کو بھلا کر اہل ایمان کے پیچھے پڑ گئے کہ انہیں اذیت دے دیکر اپنی بات زبردستی ان سے منوائیں۔ گویا خدا نے انہیں دنیا میں اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ وہ اپنا صالح ہونا ثابت کر دکھائیں، بلکہ اسلئے بھیجا تھا کہ داروغہ بن کر اہل ایمان کی خوب خبر لیں۔

بقیہ صفحہ ۶۷ سے آگے

نیک لوگوں کے نامۂ عمل کا اندراج ہوتا ہے۔ یہ اندراج ان کے مرنے کے بعد ہوتا ہے اور یہ عالم برزخ کا ریکارڈ آفس ہے۔

۱۵؎ مراد مقرب فرشتوں کی حضوری ہے۔ نیکوکاروں کے ریکارڈ آفس پر مقرب فرشتوں کی حضوری گویا مقرب فرشتوں کی طرف سے نیکوکاروں کے حق میں خراج تحسین ہے۔ اور یہ بہت بڑا اشرف اور بہت بڑا اعزاز ہے، جو عالم برزخ میں نیک بندوں کو حاصل ہوتا ہے۔

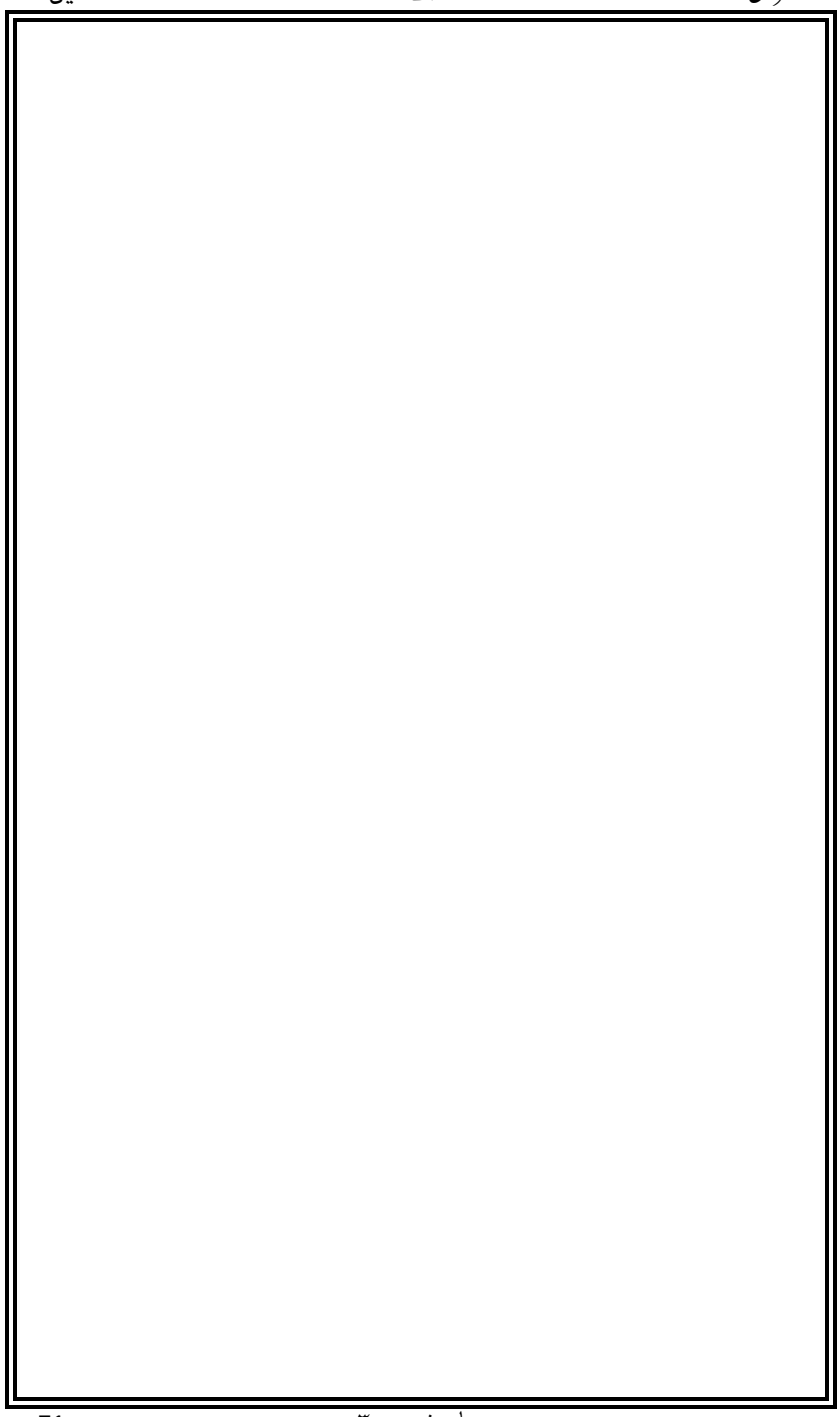

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿۳۴﴾	۳۴ تو آج اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے۔ ۲۷
عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۳۵﴾	۳۵ تختوں پر بیٹھے (ان کا حال) دیکھ رہے ہوں گے۔ ۲۸
هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾	۳۶ مل گیا نا کافروں کو ان کے کئے کا بدلہ!

۲۷ دنیا میں کفار اہل ایمان پر ہنستے رہے ہیں۔ لیکن آخرت میں اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے۔ اس طرح ان کو اپنی اس حرکت کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے گا۔ اور چونکہ کفار پر دنیا میں اللہ کی حجت قائم ہو چکی تھی، اس کے باوجود انہوں نے قبول حق کی راہ اختیار نہیں کی۔ بلکہ سرکش بنکر حق کی مخالفت کرتے رہے اور اہل ایمان کے دشمن بنکر رہے۔ اس لئے وہ آخرت میں کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہونگے۔ اگر وہ کسی ہمدردی کے مستحق ہوتے، تو اللہ تعالیٰ خود ان پر رحم فرماتا۔ اس بناء پر اہل ایمان کا ان کے حال پر ہنسنا بالکل صحیح اور برمحل ہوگا۔

۲۸ یعنی جہنم میں کفار کا جو حال ہو رہا ہوگا، اسے اہل ایمان جنت میں اپنے تخت پر بیٹھے بیٹھے ہی دیکھ رہے ہوں گے۔ قرآن کی اس بات کو بھی آج کے سائنسی دور میں سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا۔ جب کہ ہم اپنے گھروں ہی میں بیٹھے بیٹھے میلوں دور کی چیزیں ٹیلیویژن پر دیکھ لیتے ہیں۔

(۸۴) الانشقاق

نام اس سورہ کے آغاز میں قیامت کے دن آسمان کے پھٹنے کی خبر دی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام الانشقاق ہے۔یعنی وہ سورہ جس میں (آسمان) کے پھٹنے کا ذکر ہوا ہے۔

زمانۂ نزول سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز فرمایا تھا اور قیامت سے لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔

مرکزی مضمون یوم جزا اور اچھا بُرا انجام ہے۔

سابق سورہ میں بیان کیا گیا تھا کہ انسان کا نامۂ اعمال اس کے مرنے کے بعد عالم برزخ میں ایک ریکارڈ آفس (سجّین یا علّیین) میں محفوظ رکھا جاتا ہے۔اس سورہ میں اس بات سے باخبر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن پیشی سے پہلے ہر شخص کو اس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں اس انقلاب کا مجملاً ذکر ہے، جو قیامت کے ظاہر ہوتے ہی آسمان و زمین میں برپا ہوگا۔

آیت ۶ تا ۱۵ میں انسان کے عدالتِ خداوندی کی طرف بڑھنے، نامۂ اعمال ہاتھ میں دیئے جانے اور اپنے انجام کو پہنچنے کا ذکر ہے۔

آیت ۱۶ تا ۱۹ میں آثارِ کائنات سے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ انسان کو موت کے بعد مختلف مراحل سے گذرنا ہوگا۔

آیت ۲۰ تا ۲۵ میں ان لوگوں کو وعید سنائی گئی ہے، جو قرآن کو سن کر خدا کے آگے جھکتے نہیں ہیں بلکہ اس کی تکذیب کرتے ہیں۔اور ان لوگوں کو کبھی نہ ختم ہونے والے اجر کی خوشخبری دی گئی ہے، جو ایمان لا کر عملِ صالح کرتے ہیں۔

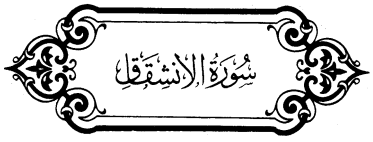

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴿۱﴾

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۲﴾

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ﴿۳﴾

وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴿۴﴾

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ﴿۵﴾

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى
رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ﴿۶﴾

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ﴿۷﴾

فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ﴿۸﴾

وَّيَنْقَلِبُ اِلٰۤى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۹﴾

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾

(۸۴) سُورۃُ الانشقاق

آیات ۲۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ جب آسمان پھٹ جائے گا۔ ۱

۲ اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ اور اس کو لازماً تعمیل کرنا چاہئے۔ ۲

۳ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ ۳

۴ اور جو کچھ اس کے اندر ہے، اُسے اُگل کر خالی ہو جائے گی۔ ۴

۵ اور اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی۔ اور اس کو لازماً تعمیل کرنا چاہئے۔ ۵

۶ اے انسان! تو کشاں کشاں اپنے رب ہی کی طرف جا رہا ہے۔ اور بالآخر اس سے ملنے والا ہے۔ ۶

۷ تو جس کا نامۂ عمل اس کے داہنے ہاتھ میں دیا گیا۔ ۷

۸ اس سے آسان حساب لیا جائے گا۔ ۸

۹ اور وہ اپنے متعلقین ۹ کے پاس خوش خوش لوٹے گا۔

۱۰ اور جس کا نامۂ عمل اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا گیا۔ ۱۰

۱ یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ آسمان محض حدِ نظر کا نام ہے اور اس کی کوئی مادّی حقیقت نہیں۔ اور جب اس کی کوئی مادّی حقیقت نہیں تو اس کے پھٹنے کا سوال پیدا ہی کہاں ہوتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کے نام پر یہ بات ذہن کو محض مرعوب کرنے کے لئے کہی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نہ کوئی سائنسی اکتشاف ہے اور نہ اس خیال کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد ہی ہے۔ جہاں تک موجودہ سائنس کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کی رسائی ابھی آسمان تک ہو ہی نہیں سکی ہے۔ وہ تو ابھی ستاروں کی دنیا ہی میں چکر لگا رہی ہے۔ وہ کائنات کی پہنائیوں کو ناپنے سے بالکل قاصر ہے۔ علم فلکیات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ سائنس داں ابھی کائنات کی وسعت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے ہیں۔ چنانچہ ماہر فلکیات W.Bartky اپنی کتاب میں کائنات کی حیرت انگیز وسعت کو بیان کرنے کے بعد صاف صاف اعتراف کرتا ہے کہ:

"What lies beyond no man knows. whether the stars continue without end or whether the universe has a difinite boundry remains, and perhaps will always remain, a topic for speculative argument "(Highlights of Astronomy p. 260)

اور جب سائنس یہ بتانے سے اپنے کو عاجز پاتی ہے کہ اس کائنات کی کوئی سرحد ہے یا نہیں؟ تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کائنات کے "حدودِ اربعہ" ابھی معلوم نہیں کر سکی ہے۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آسمان کا کوئی مادّی وجود ہے ہی نہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ فلکیات (Astronomy) کی کتابوں میں صرف ان باتوں کے بیان کرنے پر اکتفاء نہیں کیا جاتا، جو سائنسی تجربات و مشاہدات کے ذریعہ علم میں آئی ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ قیاسی باتوں کو بھی جوڑ دیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس پورے "مخلوطے" کو "سائنس" کے نام سے پیش کر کے غلط باتوں کو بھی صحیح باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

آسمان کے بارے میں قرآن کا بیان بہت واضح ہے۔ مثلاً یہ کہ اس نے آسمان کو اپنے ہاتھ سے بنایا۔ (وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ) (الذاریات۔ ۴۷) اسے بلند کیا۔ (وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا۔ (الرحمٰن: ۷) اسے محفوظ چھت بنایا۔ (سَقْفًا مَحْفُوظًا) (انبیاء۔ ۳۲) اسے ستاروں سے مزین کیا۔ (وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ) (فصلت۔ ۱۲) ساتھ ہی قرآن خبر دیتا ہے کہ قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا (إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ) (انشقاق۔ ۱) اور اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔ (فَكَانَتْ أَبْوَابًا) (النباء۔ ۱۹)

قرآن کے اس بیان سے آسمان کے ایک مادّی شئے ہونے کا ہی تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی کوئی ایسی تاویل کرنا صحیح نہ ہوگا جو اس کے ظاہری الفاظ سے متبادر ہونے والے مفہوم کے بالکل خلاف ہو۔

(مزید تشریح کیلئے ملاحظہ ہو سورۂ انفطار نوٹ ۱)

۲ یعنی یہ خیال نہ کرو کہ آسمان خدا کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہے۔ نہیں بلکہ لازماً اس کو حکم خداوندی کی تعمیل کرنا ہے۔ کیوں کہ وہ اس کا خالق و مالک ہے اور اسکی فرمانروائی اس پر پوری طرح قائم ہے۔ لہٰذا جب قیامت کے دن

وہ اسے پھٹنے کا حکم دے گا تو وہ یہ حکم سنتے ہی پاش پاش ہو جائے گا۔

۳ یعنی زمین اپنے موجودہ شکل میں باقی نہیں رہے گی۔ بلکہ اسے تان کر وسیع کر دیا جائے گا۔ تا کہ وہ بہت بڑے ہموار میدان کی شکل اختیار کر لے، جس پر خدا کے حضور پیشی کے لئے پوری نوع انسانی کے افراد کو جگہ مل جائے، جو اول روز سے قیامت تک پیدا ہوتے رہے ہیں۔

۴ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ زمین مُردوں کو اُگل کر ان کے بوجھ سے اس طرح خالی ہو جائے گی، جیسے حاملہ عورت بچہ جننے کے بعد بوجھ سے فارغ ہوتی ہے۔ گویا زمین مُردوں سے بوجھل ہو رہی ہے اور ان کے اُگلنے ہی کو ہے۔

۵ یعنی زمین بھی اپنے رب کے حکم کی تعمیل اشارہ پاتے ہی کرے گی۔ قیامت کے واقع ہونے میں کوئی چیز بھی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

۶ یعنی انسان کو اپنے سفر زندگی کا شعور ہو یا نہ ہو، وہ جا رہا ہے اپنے رب ہی کی طرف۔ تا کہ عدالت خداوندی میں حاضر ہو۔ جس طرح زمین کے ساتھ ہم بھی گردش کرتے رہتے ہیں خواہ ہم گردش کرنا چاہیں یا نہ چاہیں۔ اور خواہ ہمیں اس گردش کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح زندگی کا یہ سفینہ ہمیں لئے ہوئے رب العالمین کی عدالت کی طرف رواں ہے اور ہماری آخری منزل آخرت ہے۔ لیکن نادان لوگ دنیا ہی کو اپنی منزل سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہیں آخرت کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی۔

اربوں انسان دنیا میں پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ مگر کتنے ہیں جنہوں نے اس اہم ترین سوال پر سنجیدگی سے غور کیا ہو؟ کہ ہمارے سفر زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا ہے اور سفر کی آخری منزل کیا ہے؟ اگر ہمیں راستہ میں کوئی شخص ملے اور ہم اس سے پوچھیں کہ تم کہاں سے آ رہے ہو؟ اور وہ جواب دے کہ مجھے نہیں معلوم اور اس کے بعد ہمارے یہ سوال کرنے پر کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ وہ یہ جواب دے کہ مجھے نہیں معلوم۔ تو کیا اس کے اس جواب پر ہمیں تعجب نہ ہو گا! اور کیا ہم اسے نادان نہیں کہیں گے؟ مگر دنیا میں بے شمار انسان ایسے ہیں جن سے ان کے سفر زندگی کے بارے میں سوال کیجئے تو یہی جواب ملے گا کہ ہمیں نہ اس سفر کی ابتداء معلوم ہے اور نہ انتہا، نہ آغاز کا ہمیں کچھ پتہ ہے اور نہ انجام کا۔ اپنی منزل متعین کئے بغیر ہم اپنی زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کیسے نادان ہیں یہ لوگ جو انجام سے بے پروا ہو کر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مار رہے ہیں۔ کاش انہیں شعور ہوتا کہ وہ اسی طرح عدالت خداوندی کی طرف کھینچے چلے جا رہے ہیں جس طرح کہ سوئی مقناطیس کی طرف کھینچی جاتی ہے۔

۷ اللہ تعالیٰ نے داہنے ہاتھ کو یہ امتیاز بخشا ہے کہ وہ خیر کی علامت قرار پایا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آداب سکھائے ہیں ان میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تمام اچھے کام، مثلاً۔۔۔۔۔۔ کھانا، پینا، وضو کرنا، خیرات کرنا وغیرہ اپنے داہنے ہاتھ سے انجام دیئے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے اسی شرف کی بنا پر نیکوکاروں کا داہنا ہاتھ قیامت کے دن اس بات کا اہل ہو گا کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے اس ہاتھ میں دیا جائے۔

۸ نیوکاروں سے آسان حساب لیا جائے گا!

آسان حساب سے مراد جیسا کہ نبی ﷺ نے تشریح فرمائی ہے، خدا کے حضور جوابدہی کے لئے صرف پیشی ہے۔ اس پیشی کے موقع پر سخت باز پرس نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ درگذر فرمائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن جس سے حساب لیا گیا وہ عذاب میں پڑ گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا! اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے فَسَوفَ یُحَاسَبُ حِسَاباً یَّسِیْرًا (اس سے آسان حساب لیا جائے گا) فرمایا اس کا مطلب سخت باز پرس کرنا نہیں ہے۔ بلکہ صرف پیشی ہے۔ سخت باز پرس جس سے قیامت کے دن کی گئی وہ عذاب میں مبتلا ہوا'' (مسلم کتاب الجنۃ)

۹ اپنے متعلقین سے مراد اس کے اہل وعیال ہیں، جو صاحب ایمان ہوں گے اور جن کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ نے درگذر کا معاملہ کیا ہوگا۔ وہ جنت میں ایک ساتھ جمع ہونگے اور انہیں ایک دوسرے کی رفاقت میسر آئے گی۔ نیز اس مقصد کے لئے ان میں سے کسی کا درجہ گھٹایا نہیں جائے گا بلکہ بلند کر دیا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو سورۂ طور آیت ۲۱)

۱۰ یہ ان لوگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے جو خدا کے حضور پیشی پر یقین نہیں رکھتے۔ اور اُس سے بغاوت کی بنیاد پر زندگی گذارتے ہیں۔ ایسے لوگ عدالت خداوندی میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہوں گے۔ اس لئے ان کا نامۂ عمل پیچھے کی طرف سے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا۔ انہوں نے کتاب الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا تھا اس لئے بجا طور پر وہ اس کے مستحق ہوں گے کہ ان کا نامۂ عمل انہیں پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے۔

فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾	۱۱ وہ موت کو پکارے گا۔
وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾	۱۲ اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔
اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾	۱۳ وہ اپنے گھر والوں میں مست تھا۔ ۱۱
اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾	۱۴ اس نے سمجھ رکھا تھا کہ اس کو کبھی لوٹنا نہیں ہے۔ ۱۲
بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾	۱۵ کیوں نہیں! اس کا رب تو اس کو خوب دیکھ رہا تھا۔
فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾	۱۶ نہیں، ۱۳ میں قسم ۱۴ کھاتا ہوں شفق کی۔ ۱۵
وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾	۱۷ اور رات کی۔ اور جو کچھ وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اس کی۔ ۱۶
وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾	۱۸ اور چاند کی جب کہ وہ مہہ کامل ہو جاتا ہے۔
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾	۱۹ کہ تم کو لازماً ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں پہنچنا ہے۔ ۱۷
فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾	۲۰ پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔ ۱۸
وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾	۲۱ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔ ۱۹
بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۲﴾	۲۲ بلکہ یہ کافر اُلٹا جھٹلا رہے ہیں۔

۱۱؎ یعنی اپنی اور اپنے بال بچوں کی عاقبت سے بے پرواہو کر اپنی اور ان کی دنیا بنانے ہی میں مست تھا۔

۱۲؎ یعنی جب خدا اسے دیکھ رہا تھا تو وہ اپنے حضور پیشی کے لئے کیسے نہیں بلاتا؟ اس کے بصیر ہونے کی صفت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اپنے حضور جوابدہی کے لئے بلائے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کو مرنے کے بعد اٹھائے۔

۱۳؎ یہ تردید ہے منکرین کے اس خیال کی کہ مرنے کے بعد نہ پھر زندہ ہونا ہے اور نہ خدا کی طرف لوٹنا ہے۔

۱۴؎ قسم کھانے کا مطلب ان چیزوں کو، جن کی قسم کھائی گئی ہے بطور دلیل یا شہادت کے پیش کرنا ہے۔ مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورہ تکویر نوٹ ۱۴؎

۱۵؎ شفق اس سرخی کو کہتے ہیں جو سورج کے غروب ہونے کے بعد آسمان پر ظاہر ہوتی ہے۔

۱۶؎ سمیٹنے سے مراد رات کا اپنے دامن میں ستاروں کو سمیٹ لینا ہے۔

۱۷؎ یہ ہے وہ بات، جس کی تائید میں آثار کائنات کے کچھ احوال کو پیش کیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان کو ان احوال پر اس پہلو سے غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ ان کے مشاہدہ سے قرآن کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟ کہ انسان کو لازماً ایک ایسے مرحلہ سے دوچار ہونا ہے جہاں پہنچ کر اُسے اپنے رب کے سامنے اپنے طرز عمل کے بارے میں جوابدہی کرنا ہوگی۔

سورج کے غروب ہوتے ہی شفق کی سُرخی کا نمودار ہونا، دن کے رخصت ہوتے ہی رات کا اپنی بزم کو ستاروں سے آراستہ کرنا اور چاند کا ہلال سے بتدریج بدر کامل بن جانا اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ اس کائنات میں تدریج پائی جاتی ہے۔ اور اس کے خالق نے مرحلے مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ چاند مرحلہ بہ مرحلہ گذر کر ہی کامل بن جاتا ہے۔ پھر اس نے انسان کے لئے جس کی خاطر اس بزم کو سجایا گیا ہے آگے کے مراحل کیسے نہیں رکھے ہوں گے۔ اور دنیوی زندگی کے اس ایک مرحلہ ہی میں اس کا خاتمہ کس طرح ہو جائے گا؟ پس قرآن یہ جو خبر پیغمبر کی زبانی سنا رہا ہے کہ انسان کو موت کے بعد پھر زندگی کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے اور پھر اپنے رب کے حضور پیشی کے مرحلہ سے لازماً دوچار ہونا ہے۔ اور ان مرحلوں سے گذر کر اپنی آخری منزل جنت یا دوزخ میں پہنچ کر رہنا ہے، تو اس کی پوری پوری تائید آثار کائنات کے ان احوال سے ہوتی ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اگر انسان اس پہلو سے ان احوال کا مشاہدہ کرے تو اس کی فکر و نظر کے زاویئے بدل جائیں۔

۱۸؎ یعنی لوگوں کا حال عجیب ہے کہ ان واضح شہادتوں کے بعد بھی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ انسان کو جواب دہی کے مرحلہ سے دوچار ہونا ہے۔ بلکہ اپنے اس خیال پر مصر ہیں کہ زندگی اسی دنیا تک ہے اور مرنے کے بعد کوئی مرحلہ پیش آنا نہیں ہے۔

۱۹؎ یعنی ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ قرآن کا یہ حقیقت افروز بیان سن کر وہ اس کی صداقت کا اعتراف کرتے۔ اور اس کی عظمت سے متاثر ہو کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوتے، لیکن انہوں نے اس کے برخلاف جھٹلانے اور اکڑنے کا رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

اس مقام پر رسول اللہ ﷺ سے سجدہ کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے اس مقام پر سجدہ کیا۔ اس لئے میں مرتے دم تک یہ سجدہ کرتا رہوں گا۔ (مسلم)

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿۲۳﴾	۲۳ اور یہ لوگ جو کچھ چھپا رہے ہیں اسے اللہ خوب جانتا ہے۔ ۲۰
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۴﴾	۲۴ تو تم ان کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری سُنا دو۔ ۲۱
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۲۵﴾	۲۵ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ان کے لئے ایسا اجر ہے، جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ ۲۲

۲۰ یعنی حق سے عناد اور اسلام دشمنی کے جذبات اور بے قید اور مفاد پرستانہ زندگی گذارنے کی خواہش، جس کو وہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے ہیں، اللہ کو اس کا بخوبی علم ہے۔

۲۱ عذاب کی خبر کو خوشخبری سے تعبیر کرنے میں ایک لطیف طنز ہے۔ کہ جب تم جنت کی خوشخبری سننے اور اپنے کو اس کا مستحق بنانے کے لئے تیار نہیں ہو، تو پھر جہنم ہی کی خوشخبری سُن لو۔

۲۲ یعنی نیکوکاروں کو جو اجر آخرت میں ملے گا وہ وقتی اور عارضی نہ ہوگا۔ بلکہ مستقبل اور دائمی ہوگا، جس کا سلسلہ کبھی منقطع ہونے والا نہیں۔ گویا یہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جو ہمیشہ رواں دواں رہے گا۔

(۸۵) البُرُوج

نام پہلی آیت میں برجوں والے آسمان کا ذکر ہوا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام علامت کے طور پر'' البروج'' رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی ہوگی، جب کہ کفار ایمان لانے والوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنا رہے تھے۔تاکہ وہ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔

مرکزی مضمون قیامت اور جزا وسزا ہی ہے۔البتہ اس کے اس پہلو کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا ہے کہ وہ دن، مظلوم اہل ایمان کی دادرسی کا دن ہوگا۔جو لوگ اہل ایمان کو محض ان کے ایمان لانے کی بنا پر ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں، قیامت کے دن ان کی سخت پکڑ ہوگی۔اور جو لوگ ایمان لا کر نیک عمل کرتے ہیں وہ کامیاب اور بامراد ہوں گے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں روز جزا کے قطعی ہونے کا دعویٰ ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۴ تا ۱۱ میں ان لوگوں کو سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے، جو مسلمانوں پر محض اس لئے ظلم ڈھاتے ہیں کہ وہ ایک خدا پر ایمان لائے ہیں۔اور ان مسلمانوں کو جو ان مظالم کے باوجود اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیں گے جنت کی بشارت سنائی گئی ہے۔

آیت ۱۲ تا ۱۶ میں ظالموں کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ساتھ ہی اس کی وہ صفات بیان کی گئی ہیں، جن سے اس کا خوف بھی پیدا ہوتا ہے اور توبہ وانابت کی طرف رغبت بھی ہوتی ہے۔

آیت ۱۷ تا ۲۰ میں بعض سرکش اور ظالم قوموں کے عبرتناک انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، منکرین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ خدا تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

آیت ۲۱ اور ۲۲ خاتمۂ کلام ہے، جس میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ قرآن جو روز جزا کی آمد کی خبر دے رہا ہے کیسی بلند پایہ کتاب ہے! اور اس کا سرچشمہ کتنا پاکیزہ اور محفوظ ہے۔لہٰذا اس کی کوئی بات بھی غلط نہیں ہوسکتی۔لازماً اس کی ہر بات اٹل ہے۔

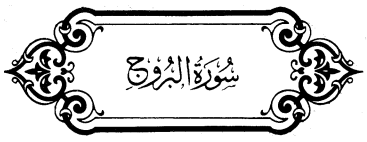

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝١

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝٢

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝٣

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝٤

النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝٥

اِذْهُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝٦

وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝٧

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا
بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝٨

الَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ ۝٩

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ
وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۝١٠

(۸۵)سُورۃُ البروج

آیات ۲۲

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ۱ برجوں ۲ والے آسمان کی۔

۲ اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ۳

۳ اور حاضر ۴ ہونے والے کی اور اس چیز کی جو حاضر ۵ کی جائے گی۔

۴ ہلاک ہوئے خندق والے۔ ۶

۵ جو خوب ایندھن والی آگ سے بھری تھی۔

۶ جب کہ وہ اس (آگ) کے پاس بیٹھے۔

۷ جو کچھ اہل ایمان کے ساتھ کر رہے تھے۔ اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ۷

۸ اور ان کے ساتھ یہ تشدد محض اس وجہ سے کیا گیا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے۔ ۸ جو زبردست ہے اور لائق ستائش بھی۔

۹ جس کی بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ ۹ اور اللہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۰

۱۰ جن لوگوں نے مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں پر ظلم ڈھایا اور پھر توبہ نہیں کی، ان کیلئے لازماً جہنم کی سزا ہے اور ان کے لئے جلنے کا عذاب ۱۱ ہے۔

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ۔ ۱۴؎

۲؎ بروج سے مراد ستاروں کی وہ بارہ فرضی شکلیں (Signs of zodiac) یا سورج کی بارہ منزلیں نہیں ہیں ، جو قدیم علم ہیئت کی مخصوص اصطلاح ہے۔ بلکہ اس سے مراد روشن ستاروں کے جھرمٹ (Constellations) ہیں، جو آسمان کی زینت بنے ہوئے ہیں ۔اور جن کی جلوہ ریزیاں انسان کو دعوت نظارہ دیتی ہیں ۔

''برج'' کے لغوی معنیٰ ظہور و نمائش اور قلعہ و محل کے ہیں ۔آسمان میں ستاروں کے جھرمٹ اس طرح درخشاں نظر آتے ہیں کہ گویا بلند محل ہیں جو سجائے گئے ہیں ۔ان کی اس طرح قلعہ بندی کی گئی ہے کہ جب شیطانی طاقتیں آسمان کی طرف پرواز کرنے لگتی ہیں تو ان قلعوں سے ان پر شہاب ثاقب (meteor) کے گولے داغے جاتے ہیں۔اسلئے ستاروں کے ان جھرمٹ (Constellations) کو ''بروج'' کہا گیا ہے۔

یہاں برجوں والے آسمان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے، کہ آسمان میں درخشاں نظر آنے والے ستاروں کے یہ جھرمٹ، اس بات کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ جس ہستی نے اس کائنات کی بزم سجائی ہے اس کے ہاں اندھیر نگری نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنی صفت جلال و جمال کے ساتھ اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے، لہٰذا ہو نہیں سکتا کہ جو لوگ اس کے وفادار بندوں پر ظلم ڈھاتے ہیں، ان سے باز پرس نہ ہو، اور اس کے وفادار مظلوم بندوں کو جو اس کی خاطر ستائے گئے انعام و اکرام سے نہ نوازا جائے۔

شیطانی طاقتوں کی آسمان پر پرواز کو روکنے کے لئے شہاب ثاقب کے گولے برسائے جاتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے خدا کے ہاں سزا کا قانون ہے۔ پھر وہ سرکشوں کو سزا کیسے نہیں دے گا؟ گویا برجوں والے آسمان پر غور کرنے سے جزا و سزا کا تقاضا اُبھرتا ہے اور اس سے روزِ جزا کی تصدیق و تائید ہوتی ہے جس کی خبر قرآن دے رہا ہے۔

۳؎ مراد قیامت کا دن ہے۔ اور اس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرمایا ہے تا کہ وہ عدالت برپا کرے۔ اور مؤمن و کافر، نیک و بد اور ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہو۔

۴؎ مراد ہر وہ شخص ہے جو قیامت کے دن حاضر ہوگا۔

۵؎ مراد وہ چیزیں ہیں جو قیامت کے دن حاضر کی جائیں گی۔ اور وہ ہولناک مناظر ہیں جن کو ہر شخص دیکھ لے گا۔

یہاں یوم موعود (جس دن کا کہ وعدہ ہے)، شاہد (حاضر ہونے والا)، اور مشہود (جو چیزیں کہ حاضر کی جائیں گی یا جو مناظر کہ سامنے لائے جائیں گے) کی قسمیں کلام کو مؤکد کرنے اور ان باتوں کا یقین پیدا کرنے کے لئے کھائی گئی ہیں۔

۶؎ اصحاب الاخدود (خندق والے) سے اشارہ ایک مخصوص واقعہ کی طرف ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

اہل ایمان کو محض ان کے ایمان لانے کی بنا پر آگ سے بھری ہوئی خندق میں جھونک دیا گیا تھا۔ اور ظالم اس خندق کے پاس بیٹھ کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا اس کی تفصیل قرآن نے نہیں بتلائی۔ کیوں کہ سبق آموزی کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے۔ رہا تاریخی ثبوت تو تاریخ اہل ایمان کے نذر آتش کئے جانے کے واقعات سے بھری پڑی ہے، جس کا آغاز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آتش نمرود میں جھونک دیئے جانے سے ہوتا ہے۔ اور مظالم کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ چنانچہ محض اس بنا پر کہ فلاں گروہ کا دین اسلام ہے اس کے افراد کو نذر آتش کیا جاتا ہے یا انہیں گھروں میں بند کر کے آگ لگا دی جاتی ہے۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اس مقصد کے لئے اب خندقیں کھودنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ لکڑیوں کا ایندھن جمع کرنا پڑتا ہے، بلکہ پٹرول اور اس قسم کی دوسری چیزیں ہی کافی ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک روایات کا تعلق ہے اتنی بات تو صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یمن کے یہودی بادشاہ ذونُو اس نے غالباً ۵۲۳ء میں نجران پر حملہ کر کے وہاں کے لوگوں کو، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ اور سچے مؤمن تھے، یہودی مذہب قبول کرنے کا حکم دیا۔ اور ان کے انکار کرنے پر انہیں خندقیں کھود کر آگ میں جھونک دیا گیا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۳۵)

اسٹینڈرڈ جیوش انسائیکلو پیڈیا میں بھی مختصراً اس کا ذکر موجود ہے: (The Standard Jewish Encyclopaedia - p. 554) نجران مکہ سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ قصہ عربوں میں مشہور رہا ہوگا۔ اور عجب نہیں کہ قرآن نے اصحاب الاخدود کہہ کر اس واقعہ کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہو۔ لیکن روایات میں غلام اور راہب وغیرہ کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے اس میں بڑی نکارت ہے۔ اس قصہ میں غلام کے تعلق سے ایسی عجیب وغریب باتیں بیان کی گئی ہیں جو ایک نبی کے معجزے سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اس روایت کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف صحیح نہیں۔ چنانچہ ابن کثیر فرماتے ہیں: **قال شیخنا الحافظ ابو الحجاج المزی فیحتمل ان یکون من کلام صهیب الرومی فانه کان عنده من اخبار النصاریٰ** ۔

''ہمارے شیخ حافظ ابوالحجاج مزی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں یہ احتمال ہے کہ یہ قصہ صہیب رومی کے کلام کا جزء ہو۔ اس لئے کہ انہیں نصاریٰ کے قصوں کا علم تھا۔'' (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۴۹۴)

اور قفال کہتے ہیں:

''اصحاب الاخدود کے سلسلہ میں (مفسرین نے) مختلف روایت بیان کی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ مؤمنین کے ایک گروہ نے اپنی قوم یا کافر بادشاہ کی، جو ان پر حکمراں تھا مخالفت کی تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے ان کو خندق میں ڈال دیا تھا۔'' (التفسیر الکبیر للرازی مطبوعہ طہران ج ۲۱ ص ۱۱۷)

افسوس کہ ایسی بے سروپا روایتیں بڑی بڑی تفسیروں میں جگہ پا گئیں۔

۷ یعنی ڈھٹائی اور سنگدلی کی حد ہے کہ اہل ایمان پر ایسا انسانیت سوز ظلم ڈھاتے ہوئے انہیں ذرا تامل نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی اخلاقی حس اتنی مردہ ہوگئی تھی کہ وہ بڑی بے شرمی کے ساتھ ان کے جلنے کا تماشا دیکھتے رہے۔

۸ یعنی اہل ایمان کا اگر کوئی قصور تھا تو وہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ پر صحیح معنیٰ میں ایمان لائے تھے۔ گویا جو سب سے بڑی نیکی تھی، وہی ان ظالموں کی نظر میں جرم قرار پائی۔

۹ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، ان سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ وہی ہستی اس کی مستحق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس سے تعلق استوار کیا جائے۔

۱۰ اس میں ظالموں کے لئے تنبیہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے تو تمہارا ظلم تا بہ کے؟ ایک دن تمہاری گرفت ہونا ہے اور تمہیں عدالت خداوندی کے کٹہرے میں کھڑا ہونا ہے۔

۱۱ یہ سخت وعید ان لوگوں کو سنائی گئی ہے، جو مؤمن مردوں اور عورتوں پر محض اس لئے ظلم ڈھائیں تا کہ ان کو اسلام سے پھیرا جا سکے۔ جلنے کے عذاب کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے، کیوں کہ ان ظالموں نے مومنین کو آگ میں زندہ جلایا تھا۔ ایسے لوگوں کو جہنم میں دوسرے عذابوں کے ساتھ خاص طور سے سخت قسم کی آگ میں جلنے کے عذاب کا مزا بھی چکھنا پڑے گا۔

اس آیت سے ضمناً یہ بھی واضح ہوا کہ اتنے بڑے جرم کا مرتکب بھی اگر توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتا ہے، تو اس کے لئے بخشش کے دروازے کھلے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡکَبِیۡرُ ؕ﴿۱۱﴾	۱۱ جولوگ ایمان لائے۔ ۱۲ اور جنہوں نے نیک عمل کئے۔ یقیناً ان کے لئے باغ ہیں، جن کے تلے نہریں رواں ہوں گی۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔ ۱۳
اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ ؕ﴿۱۲﴾	۱۲ بیشک تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ ۱۴
اِنَّہٗ ہُوَ یُبۡدِئُ وَ یُعِیۡدُ ۚ﴿۱۳﴾	۱۳ وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔ ۱۵
وَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ۙ﴿۱۴﴾	۱۴ اور وہ بخشنے والا ۱۶ ،محبت کرنے والا ہے۔ ۱۷
ذُو الۡعَرۡشِ الۡمَجِیۡدُ ۙ﴿۱۵﴾	۱۵ عرش کا مالک ۱۸ ،صاحب عظمت۔ ۱۹
فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ؕ﴿۱۶﴾	۱۶ اور جو چاہے کر ڈالنے والا۔ ۲۰
ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ الۡجُنُوۡدِ ۙ﴿۱۷﴾	۱۷ کیا تمہیں لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟
فِرۡعَوۡنَ وَ ثَمُوۡدَ ؕ﴿۱۸﴾	۱۸ فرعون ۲۱ اور ثمود ۲۲ کے لشکروں کی؟
بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ تَکۡذِیۡبٍ ۙ﴿۱۹﴾	۱۹ لیکن یہ کافر جھٹلانے ہی میں لگے ہوئے ہیں۔
وَّ اللّٰہُ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ مُّحِیۡطٌ ۚ﴿۲۰﴾	۲۰ اور اللہ ان کو آگے پیچھے سے گھیرے ۲۳ ہوئے ہے۔
بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ۙ﴿۲۱﴾	۲۱ (یہ کلام افتراء نہیں) بلکہ یہ عظیم قرآن ہے۔
فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾	۲۲ جو لوح محفوظ ۲۴ میں (ثبت) ہے۔

۱۲؎ یعنی اس ظلم وستم کے باوجود لوگ اپنے ایمان میں ثابت قدم رہے۔

۱۳؎ یعنی بڑی کامیابی دنیا حاصل کرنا نہیں بلکہ جنت حاصل کرنا ہے۔

۱۴؎ یعنی ظالم اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ وہ اللہ کی پکڑ سے بچ سکیں گے۔

۱۵؎ یعنی جزا وسزا کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس ہستی کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں جس نے پہلی بار پیدا کیا ہے۔

۱۶؎ وہ بخشنے والا ہے۔ لہٰذا اگر تم توبہ کرو اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لو تو اس بات کے مستحق ہو سکتے ہو کہ بخشے جاؤ۔

۱۷؎ یعنی وہ اپنے بندوں سے نفرت نہیں بلکہ محبت رکھتا ہے بشرطیکہ وہ اس کے وفادار بندے بن کر رہیں۔

۱۸؎ ''عرش'' کے معنیٰ تخت کے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا تخت سلطنت ہے، جس کی کیفیت ہمیں نہیں معلوم۔ یہاں عرش کا مالک کہہ کر یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ پوری کائنات پر اسی کا اقتدار قائم ہے اور تنہا وہی فرمانروائی کر رہا ہے۔ لہٰذا اس سے سرکشی کرنے والے اور اس کے وفادار بندوں پر ظلم ڈھانے والے اس کی گرفت سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔

۱۹؎ یعنی عظمت وجلالت (Majesty) اس کی صفت ہے۔ اور اس عظمت وجلالت میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ لہٰذا بندوں کو چاہئے کہ اس کی جلالتِ شان کے تصور سے لرزاں ہوں۔

۲۰؎ یعنی دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہیں جو اس کے کام اور منصوبہ میں مزاحم ہو سکے۔

۲۱؎ ملاحظہ ہو سورہ نازعات نوٹ ۱۳؎۔

۲۲؎ ''ثمود'' ایک قوم کا نام ہے جو ''حجر'' (مدینہ اور تبوک کے درمیان کا علاقہ) میں آباد تھی۔ اس کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے اور اس کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ مگر اس نے سرکشی کی جس کے نتیجہ میں اس پر سخت عذاب نازل ہوا۔ اس کے تباہ شدہ کھنڈرات آج بھی ''حجر'' کے علاقہ میں موجود ہیں اور صدا دے رہے ہیں کہ

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

فرعون اور ثمود کو دنیوی شان وشوکت اور اقتدار حاصل تھا۔ مگر وہ اقتدار کے نشہ میں سرکشی اور ظلم پر اتر آئے تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑا تو وہ بہت بُرے انجام سے دوچار ہوئے۔ ان تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن اپنے مخاطبین سے کہہ رہا ہے، کہ کیا تم بھی ان کی سی روش اختیار کر کے اسی انجام سے دوچار ہونا چاہتے ہو؟

۲۳؎ یعنی یہ جھٹلانا چاہتے ہیں تو جھٹلائیں اس سے حقیقت نہیں بدلتی۔ وہ پوری طرح اللہ کی گرفت میں ہیں۔ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

۲۴ ''لوح محفوظ'' کے معنیٰ محفوظ تختی کے ہیں۔اوراس سے ملأ اعلیٰ کی وہ مقدس تختی ہے،جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمات لکھ دیئے ہیں۔اُس کا لکھا بالکل اٹل ہے اوراس تک کسی جن وانس کی رسائی نہیں ہے۔قرآن کوئی خیالی اورنظریاتی چیز نہیں۔اور نہ کسی کاہن کا کلام ہے۔بلکہ اس منبع وہ چشمۂ صافی ہے جسے لوح محفوظ کہتے ہیں۔اس لئے اس کی ہر بات حق ہے اور پوری ہوکر رہنے والی ہے۔

(۸۶) الطارق

نام آیت ۱ میں الطارق (رات میں نمودار ہونے والے ستاروں) کا ذکر ہوا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام الطارق رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول سورہ مکی ہے اور اس وقت کی نازل شدہ ہے، جب کہ اہل مکہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچ چکی تھی۔مگر وہ اس کو مذاق قرار دے کر اسکے خلاف چالیں چلنے لگے تھے ؟

مرکزی مضمون محاسبہ کے لئے انسان کا دوبارہ پیدا کیا جانا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۴ میں آسمان اور ستاروں کی شہادت اس بات پر کہ ہر شخص کی نگرانی ہو رہی ہے۔اور ایک روز آنا ہے جب کہ اسے حساب کیلئے طلب کیا جائے گا۔

آیت ۵ تا ۸ انسان کی خلقت سے اسے دوبارہ پیدا کئے جانے پر استدلال ہے۔

آیت ۹ تا ۱۰ میں اس حقیقت کا اظہار کہ اس دن سارے راز پرکھے جائیں گے اور انسان بالکل بے بس ہوگا۔ اسے کہیں سے کوئی مدد مل نہ سکے گی۔

آیت ۱۱ تا ۱۴ میں آسمان و زمین کی شہادت اس بات پر پیش کی گئی ہے کہ قرآن یوم جزا کی، جو خبر دے رہا ہے وہ ایک فیصل شدہ اور قطعی بات ہے۔

آیت ۱۵ تا ۱۷ میں خاتمۂ کلام ہے، جس میں کفار کو متنبہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کی چالیں الٹی پڑیں گی۔البتہ انہیں تھوڑی مہلت دے دو۔ان کا انجام بس سامنے آنے ہی کو ہے۔

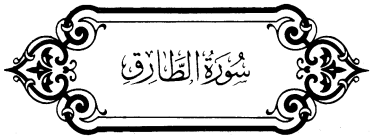

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾

النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ؕ﴿۵﴾

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾

يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾

اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۙ﴿۱۱﴾

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۙ﴿۱۲﴾

(۸۶)سُورۃُ الطارق

آیات ۱۷

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ۱ آسمان کی ۲ اور رات میں نمودار ہونے والے کی۔

۲ اور تمہیں کیا معلوم کہ رات میں نمودار ہونے والا کیا ہے ؟ ۳

۳ دمکتا ستارہ۔ ۴

۴ کوئی شخص ایسا نہیں، جس پر ایک نگہبان نہ ہو۔ ۵

۵ انسان ذرا غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ۶

۶ اُچھلتے پانی سے۔ ۷

۷ جو ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ ۸

۸ یقیناً وہ (اللہ) اسکے لوٹانے پر ۹ قادر ہے۔

۹ جس دن چھپی باتیں پرکھی جائیں گی۔ ۱۰

۱۰ اس وقت اس کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی اس کا مددگار ہوگا۔ ۱۱

۱۱ قسم ہے آسمان کی جو بارش برساتا ہے۔ ۱۲

۱۲ اور زمین کی جو پھٹ جاتی ہے۔ ۱۳

۱ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورہ تکویر نوٹ۔ ۱۴

۲ آسمان کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورہ انشقاق نوٹ۔ ۱

۳ یہ سوال ''رات میں نمودار ہونے والے'' کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ہے۔ یعنی رات میں نمودار ہونے والی چیز ایسی نہیں ہے کہ اس پر سے یونہی گذر جاؤ۔ بلکہ وہ تمہیں دعوت فکر دیتی ہے لہٰذا اس پر سنجیدگی سے غور کرو اور اس غور و فکر کا مقصد خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنا ہو، نہ کہ محض ''معلومات'' میں اضافہ کرنا۔

۴ النجم الثاقب (دمکتا ستارہ) سے مراد کوئی خاص ستارہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ستاروں کی جنس کے مفہوم میں ہے۔ یعنی وہ تمام ستارے جو خوب روشن اور درخشاں نظر آتے ہیں، جن کو ہر شخص کھلی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔

آسمان میں بکھرے ہوئے تارے اس کثرت سے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد معلوم کرنے سے موجودہ علم فلکیات (Astronomy) بھی، باوجود اپنی تمام تر سائنسی ترقیوں کے قاصر ہے۔ جدید ماہرین فلکیات کے اندازہ کے مطابق، جس کہکشاں میں ہماری زمین واقع ہے اس میں کوئی ایک بلین (One Bilion) ستارے ہوں گے۔ (The Cambridge Encyclopaedia of Astronomy p. 313) اس سے آسمان کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جس کو اس سورہ میں دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ان گنت ستاروں میں سے دمکتے ستاروں کو یہاں شہادت کے طور پر اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ یہ اپنی چمک دمک کی وجہ سے، ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ''منزل'' کا پتہ بتا دیتے ہیں۔

۵ یہ وہ بات ہے جس پر آسمان اور دمکتے ستاروں کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ یہ شہادت اس مفہوم میں ہے کہ آسمان پر ستاروں کی جگمگاہٹ انسان کو دعوت نظارہ ہی نہیں دعوت فکر بھی دیتی ہے۔ رات کے آتے ہی آسمان کو قمقموں سے سجایا جاتا ہے۔ اور قمقمے بھی ایسے روشن کہ ان کی تابناکی عقل کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اور موجودہ فلکیاتی انکشافات نے، جس کی رُو سے بعض ستارے تو اتنی دوری پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی زمین تک پہنچنے کیلئے کئی نوری سال لگ جاتے ہیں، انسان کو اور زیادہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کیا یہ مشاہدہ اپنے خالق کے کمالِ قدرت کا اور کائنات کی عظیم سلطنت کے فرمانروا ہونے کا پتہ نہیں دیتا؟ اور انسان میں یہ احساس پیدا نہیں کرتا کہ اس فرمانروائے عظیم کی سلطنت میں انسان کی یہ حیثیت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ اپنی من مانی کرنے کے لئے آزاد ہو، اور فرمانروائے کائنات کے حضور جوابدہ نہ قرار پائے؟ یہ مشاہدہ بشرطیکہ وہ غیر متعصّبانہ اور معروضی نوعیت کا ہو انسان کے اندر ذمہ داری کا احساس لازماً پیدا کرتا ہے۔ اور یہیں سے خدا کے حضور جوابدہی اور جزا و سزا کا تصور اُبھرتا ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس سے پیغمبر انسان کو خبردار کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی وہ دعوت ہے جس کو قرآن دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

اور جب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس

کی عملی زندگی کا ریکارڈ تیار کیا جائے۔ تاکہ خدا کے حضور پیشی کے دن اس کی بنیاد پر جزا یا سزا کا فیصلہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا پورا پورا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کے ساتھ نگراں فرشتے لگا دئے گئے ہیں، جو اس کے ہر قول و فعل کو ضبط تحریر میں لاتے اور اس کی عملی زندگی کا پورا ریکارڈ تیار کرتے رہتے ہیں۔

۶ منکرین آخرت کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرنا ممکن نہیں۔ ان کے اس اعتراض کا جواب قرآن نے یہ دیا کہ منکرین، خدا کو قادر مطلق نہیں سمجھتے۔ اسی لئے ان کے نزدیک انسان کو اس کے مرنے کے بعد اٹھا کھڑا کرنا ممکن نہیں۔

لیکن خدا کی قدرت کا یہ تصور سراسر باطل ہے کیوں کہ یہ کسی بھی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اور اس کی تردید کائنات کی ہر چیز کرتی ہے۔ اسی سلسلہ میں انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ ذرا وہ اپنی خلقت ہی پر غور کرے، تو اس کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آئے گی کہ، جس ہستی نے انسان کو پہلی بار پیدا کیا وہ اسے دوسری بار بھی پیدا کر سکتا ہے۔

۷ مراد مادۂ تولید ہے۔

۸ ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ریڑھ اور پسلیوں کے اندر سے مادۂ تولید خارج ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی جسم کے اس جوف میں، جس کے ایک طرف ریڑھ کی ہڈی اور دوسری طرف پسلیاں ہیں ایک رقیق مادہ تیار ہوتا ہے اور وہاں سے اس طرح خارج ہوتا ہے جیسے پچکاری کا عمل۔

مِنْ بَیْنِ (درمیان سے) کے الفاظ اس مفہوم میں قرآن میں دوسری جگہ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ سورہ نحل آیت ۶۶ میں ہے:

نُسْقِیْکُمْ مِمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَبَناً خَالِصاً سَائِغاً لِلشّٰرِبِیْنَ ۔

''ہم ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان سے تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار چیز ہے۔''

ظاہر ہے اس آیت میں بھی مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ (گوبر اور خون کے درمیان سے) کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خالص دودھ گوبر اور خون کے اندر سے نکلتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس جسم کے اندر گوبر اور خون جیسی کثافتیں پیدا ہوتی ہیں اسی جسم میں خالص دودھ، جیسی لطیف چیز بھی تیار ہوتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور اس کی عظیم حکمت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں بھی کہنے کا منشاء یہ ہے کہ انسانی ڈھانچہ کے اندر سے بڑے عجیب طریقہ سے وہ مادہ خارج ہوتا ہے، جو ہوتا تو ہے بے وقعت لیکن اس سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا ہوتی ہے۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور اس کی عظیم صناعی کی دلیل نہیں؟ پھر اس کے بارے میں یہ گمان کرنے کے لئے کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ انسان کو دوبارہ پیدا کرنا ممکن نہیں؟

واضح رہے کہ ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے مادۂ منویہ کے خارج ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ مادۂ منویہ کیسۂ منویہ (Seminal vescles) سے خارج ہوتا ہے۔ کیوں کہ کیسۂ منویہ جوفِ شکم (Abdominal) میں ہوتا ہے جو آخری پسلی کا زیریں حصہ ہے۔ اور جس کی دوسری طرف پشت یعنی ریڑھ کی ہڈیاں ہیں۔ اس لئے وسیع تر مفہوم میں یہ اس ڈھانچہ کے درمیان ہی سے خارج ہوتا ہے جس کا اگلا حصہ پسلیاں ہیں تو پچھلا حصہ ریڑھ۔

اور قرآن جب تذکیر کیلئے کوئی بات کہتا ہے تو وہ عام اور وسیع تر مفہوم میں ہوتی ہے نہ کی فنی زبان میں۔ اسلئے قرآن نے مادۂ تولید کے اخراج کے سلسلہ میں یہاں جو کچھ بیان کیا ہے اسے علم تشریح الاعضاء (Anotomy) کی اصطلاح میں سوچنا صحیح نہ ہوگا۔

انسان کی تخلیق جس مادۂ منویہ سے ہوتی ہے قرآن نے اس پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اور جب ہم جدید تحقیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اپنے خالق کے کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔ جدید تحقیقات کے رُو سے ایک وقت میں جو مادۂ منویہ (Semen) خارج ہوتا ہے اس کی مقدار ۲ تا ۵ ملی لیٹر (2 to 5 ml) ہوتی ہے۔ اور ہر ملی لیٹر (ml) میں تولید کے جراثیم (Spermetozoa) ۴۰ تا ۱۰۰ ملین (40 - 100 millions) ہوتے ہیں۔ (Text Book of Physiology by George Bell- Edinburgh p. 643) گویا مرد کے ایک وقت کے خارج شدہ مادۂ منویہ میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ پچاس کروڑ انسان پیدا کر سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے خالق نے اُن جراثیم کے بارآور (Fertilize) ہونے کا ایسا نظام بنایا ہے کہ بیک وقت ایک یا دو سے زیادہ جرثومے بارآور ہو نہیں سکتے۔ اس طرح سے انسانی پیدائش کی شرح حد سے تجاوز نہیں کر پاتی۔ خدا کے کرشمۂ قدرت کا یہ مشاہدہ کیا انسان کے اندر اس کی بے پناہ قدرت کا یقین پیدا نہیں کرتا؟ اور کیا اسے اس بات کا قائل نہیں کرتا کہ اس کے لئے مرے ہوئے انسان کو دوبارہ اٹھانا کچھ بھی مشکل نہیں؟

۹ لوٹانے سے مراد انسان کو جسم سمیت دوسری مرتبہ پیدا کرنا ہے اور یہ قیامت کے دن ہوگا۔

۱۰ یعنی اس روز کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔ انسان کی باطنی کیفیت کا حال کھل کر سامنے آجائیگا۔ اس کی نیت، اس ارادے، اس کے عمل کے محرکات اور وہ اغراض و مقاصد، جو اسکے اعمال کی پشت پر رہے ہیں سب بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں گے۔ گویا اس کے باطن کی پوری طرح اسکریننگ (Screening) کی جائے گی اور نیت کا جہاں کہیں کھوٹ ہوگا بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجائے گا۔ اس روز انسان کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ حق کو باطل قرار دینے کیلئے ایڑی چوٹی کا جو زور لگاتا رہا اس کے پیچھے اس کی کیا اغراض تھیں، جن کو اس نے اپنے دل میں چھپائے رکھا تھا۔

۱۱ مطلب یہ ہے کہ نہ وہ خود اپنی مدافعت کر سکے گا اور نہ دوسرا کوئی اس کا حمایتی بن کر کھڑا ہوگا کہ اس کی مدد کر سکے۔

۱۲ ''آسمان سے بارش کا برسنا'' اوپر سے بارش برسنے کے معنی میں ایک عام محاورہ ہے۔

۱۳ یعنی بارش کے برستے ہی زمین کے مسامات کھل جاتے ہیں اور وہ شق ہو کر نباتات اگاتی ہے۔ گویا جو زمین مُردہ پڑی تھی، بارش کے ہوتے ہی زندہ ہو کر لہلہانے لگی۔ یہ مشاہدہ جو انسان رات دن کرتا ہے اسی کو یہاں زندگی بعد موت کی تائید میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی جو خدا مردہ زمین کو زندہ کر سکتا ہے وہ مُردوں کو کیوں نہیں جلا اٹھا سکتا؟ کیا اس مشاہدہ سے یہ یقین پیدا نہیں ہوتا کہ جو زمین بارش کی صورت میں خدا کے حکم سے نباتات کو اگل دیتی ہے وہ اس کے حکم سے مُردوں کو کیوں نہیں اگل سکتی ؟

ضمناً یہاں توحید کا پہلو بھی ابھر کر سامنے آ گیا ہے۔ کیوں کہ آسمان کا بارش برسانا اور زمین کا پانی اپنے اندر جذب کر کے نباتات اُگانا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ دونوں کا نظم ایک خدا کے ہاتھ میں ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو خدا زمین کا ہے وہی آسمان کا بھی ہے۔ ورنہ آسمان و زمین میں اس درجہ توافق اور سازگاری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے اس مشرکانہ تصور کی جڑ کٹ جاتی ہے کہ آسمان کا دیوتا الگ اور زمین کا دیوتا الگ۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾	۱۳ کہ یہ ایک طے شدہ بات ہے۔ ۱۴
وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾	۱۴ ہنسی مذاق نہیں۔ ۱۵
اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾	۱۵ یہ لوگ ایک تدبیر کر رہے ہیں۔ ۱۶
وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾	۱۶ اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں۔ ۱۷
فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾	۱۷ تو ان کافروں کو مہلت دو۔ بس تھوڑی مہلت۔ ۱۸

۱۴ یعنی قرآن جس آنے والے دن کی خبر دے رہا ہے وہ ایک فیصل شدہ قطعی اور اٹل بات ہے۔

۱۵ یعنی اتنی اہم خبر اور اتنی سنجیدہ بات کو ہنسی مذاق قرار دینا ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا ہے، جو حقیقت پسند بننا نہیں چاہتے۔

۱۶ یعنی یہ منکرین، پیغمبر کی آواز کو دبانے اور حق کو شکست دینے کے لئے ایک نہ ایک چال چل رہے ہیں۔

۱۷ یعنی منکرین کی چال کا توڑ میں بھی کر رہا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ منکرین کی چالوں کو ناکام بنانے اور ان کو ان کے دام میں پھنسانے کی تدبیر ایسے طریقہ سے کر رہا ہے کہ انہیں اس کا کوئی اندازہ نہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ جن کافروں نے قرآن اور پیغمبر کے خلاف چالیں چلی تھیں وہ سب انہیں کے خلاف پڑیں۔ اور وہ بری طرح ناکامی اور ذلت سے دوچار ہوئے۔ یہ تو ہوا دنیا میں حق کے خلاف چال چلنے کا انجام! اور آخرت میں تو وہ عیاناً دیکھ لیں گے کہ انہوں نے جو کلہاڑی چلائی تھی۔ وہ اپنے ہی پاؤں پر چلائی تھی۔ اور جو قبر کھودی تھی اس میں ان ہی کو دفن ہونا ہے، اور دفن بھی آگ کے کفن کے ساتھ ہونا ہے۔

۱۸ یعنی ان کو اپنا پیمانہ بھر لینے دو۔ ان کے انجام کے سلسلہ میں جلدی نہ کرو بلکہ صبر کے ساتھ اپنا فرض انجام دیئے چلے جاؤ۔ جو مہلت ان کافروں کو دی جا رہی ہے وہ جلد ہی ختم ہو جائے گی اور عنقریب ان کی گرفت ہو گی۔

(۸۷) الاعلیٰ

نام پہلی آیت میں خدا کی صفت، الاعلیٰ بیان ہوئی ہے۔اسی مناسبت سے اس سورہ کا نام الاعلیٰ رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول یہ سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی نازل شدہ ہے جب کہ نزول وحی کا آغاز ہوئے زیادہ دن نہیں گذرے تھے۔اور آپ ﷺ قرآن کو اخذ کرنے میں یہ اندیشہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں کوئی آیت بھول نہ جائیں۔اسی طرح دعوت وتذکیر کا کام بھی بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھا۔

مرکزی مضمون فلاح آخرت ہے۔اور اس کا دارومدار ہدایت خداوندی کو قبول کرنے پر ہے، جو قرآن کی شکل میں پیغمبر پر نازل ہو رہی ہے۔

اس سورہ میں خطاب براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔اور بالواسطہ قرآن کے ہر پڑھنے والے سے، البتہ آگے چل کر خطاب کا رخ دنیا پرستوں کی طرف ہو گیا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں خدا کی پاکیزگی بیان کرنے کا حکم دیتے ہوئے اس کی صفات بیان کی گئی ہیں۔تاکہ انسان صحیح معنیٰ میں خداشناس بن جائے۔

آیت ۶ تا ۸ میں وحی الٰہی کے پیغمبر کے حافظہ میں محفوظ کئے جانے کا یقین دلایا گیا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی اور ہر طالب حق کے لئے اطمینان کا سامان ہے۔

آیت ۹ تا ۱۵ میں تذکیر کی ہدایت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس سے کس قسم کے لوگ فائدہ اٹھائیں گے اور کس قسم کے لوگ دور رہیں گے۔اور پھر ان میں سے ہر ایک کے رویہ کا نتیجہ آخرت میں کیا نکلے گا؟

آیت ۱۶ تا ۱۹ خاتمۂ کلام ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دینا وہ بنیادی غلطی ہے، جس کی بنا پر انسان وحی کی رہنمائی سے محروم رہتا ہے۔اور برے انجام سے دوچار ہوتا ہے۔قرآن ہی میں نہیں اگلے صحیفوں میں بھی یہی بات بتلائی گئی تھی۔

فضیلت یہ سورہ مختصر ہونے کے باوجود توحید، رسالت اور آخرت تینوں مضامین پر مشتمل ہے۔اور تذکیر کا پہلو بھی مؤثر انداز میں آ گیا ہے۔اس لئے جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں قرأت کے لئے زیادہ موزوں قرار پائی ہے۔چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اور ھَلْ اَتٰکَ حَدِیْثُ الْغَاشِیَۃِ (یعنی سورہ اعلیٰ اور سورہ غاشیہ) پڑھا کرتے تھے۔(مسلم کتاب الجمعہ)

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى

(۸۷) سورۃ الاعلیٰ

آیات ۱۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝١
[۱] اپنے رب[۱] اعلیٰ کے نام کی تسبیح کرو۔ [۲]

الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝٢
[۲] جس نے پیدا کیا اور متناسب بنایا۔ [۳]

وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝٣
[۳] جس نے منصوبہ بنایا۔ [۴] اور رہنمائی کی۔ [۵]

وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝٤
[۴] جس نے چارہ اگایا۔

فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝٥
[۵] پھر اس کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنایا۔ [۶]

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝٦
[۶] (اے نبی!) ہم تمہیں پڑھائیں گے پھر تم نہیں بھولو گے۔ [۷]

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝٧
[۷] مگر جو اللہ چاہے۔ [۸] وہ کھلی بات کو بھی جانتا ہے اور چھپی بات کو بھی۔ [۹]

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝٨
[۸] اور ہم تمہارے لئے آسانی کی راہ ہموار کر دیں گے۔ [۱۰]

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝٩
[۹] لہٰذا تم نصیحت کرو، اگر نصیحت کرنا مفید ہو۔ [۱۱]

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝١٠
[۱۰] نصیحت قبول کرے گا وہ، جو ڈرتا ہوگا۔ [۱۲]

وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۝١١
[۱۱] اور اس سے گریز کرے گا وہ، جو بڑا بد بخت ہوگا۔

الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝١٢
[۱۲] وہ بڑی آگ میں داخل ہوگا۔

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝١٣
[۱۳] پھر نہ اس میں مرے گا اور نہ جئے گا۔ [۱۳]

۱؎ رب کی تشریح سورہ فاتحہ نوٹ ۴ میں گذر چکی۔

یہاں رب کی صفت اعلیٰ بیان ہوئی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا، جو تمام انسانوں اور ساری مخلوقات کا پروردگار اور مالک وآقا ہے، ایک برتر اور بالاتر ہستی ہے۔ اس کی شان اور اس کا رتبہ بہت بلند ہے۔ انسان فطرۃً اس کو جانتا ہے اور عقل اس کو پہچانتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اس بلند و بالا ہستی کی کُنہ معلوم کرنے اور اس کو اپنی عقل کی گرفت میں لینے کی کوشش بالکل بے سود ہے۔

؎ جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا عقل سے جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا

جو لوگ اس کی معرفت حاصل کرنے کی بجائے اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے پیچھے پڑ گئے وہ فلسفیانہ باتوں میں الجھ کر بالکل بھٹک گئے۔ مثال کے طور پر جنہوں نے اسے ''آتما'' قرار دیا وہ ساری موجودات میں اس کے حلول کے قائل ہو گئے۔

The sage sees all beings in the Atman and the Atman in all beings.

(The Essence of Principal Upnishads. p. 5)

خدا کا یہ نہایت گھٹیا تصور ہے جو شرک کی بنیاد ہے۔ قرآن اس بنیاد ہی کو ڈھا دیتا ہے اور خدا کی ذات کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے اور فلسفیانہ بحثیں کھڑی کرنے سے یکسر روکتا ہے۔ وہ اس کی ایسی معرفت عطا کرتا ہے، جو عقل کو جلا بخشنے والی، قلب کو مطمئن کرنے والی اور انسان کو صحیح معنیٰ میں خدا شناس بنانے والی ہے۔ یہ معرفت خدا کی صفات پر غور کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے قرآن خدا کی صفات کا تفصیل سے اور بہ کثرت ذکر کرتا ہے۔

رب کے اعلیٰ ہونے کی صفت اس مشرکانہ تصور کو باطل قرار دیتی ہے کہ خداؤں میں کوئی چھوٹا ہے تو کوئی بڑا۔ اور کوئی دیو ہے تو کوئی مہادیو۔ ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ اور وہی اعلیٰ و برتر ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا ہے ہی نہیں۔ پھر کسی کے برتر ہونے کا کیا سوال؟ اور سرے سے کوئی دیو ہے ہی نہیں پھر کسی کے مہادیو ہونے کا کیا مطلب؟

۲؎ اس حکم میں تین اہم ہدایتیں مضمر ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو ان ناموں سے یاد کیا جائے، جو اپنے معنیٰ و مفہوم کے لحاظ سے پاک اور اس کی شان اور اس کے رتبہ کے لحاظ سے بالکل موزوں اور مناسب ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہ عربی زبان ہی کے الفاظ ہوں، بلکہ وہ کسی بھی زبان کے الفاظ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اس میں شرک کا تصور مضمر نہ ہو۔ نیز نقص یا بے ادبی کا بھی کوئی پہلو نکلتا نہ ہو۔ اسی بنا پر ہم اردو میں اللہ کو ''خدا'' اور ''پروردگار'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مرہٹی زبان پر مشرکانہ مذہب کا کافی اثر ہے۔ اس لئے اس زبان میں اللہ کے لئے کوئی نام تجویز کرتے ہوئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر، رام، ایک مذہبی شخصیت کا نام ہے جن کو وشنو کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔

ملاحظہ ہو:۔ (Moles Worth,s Marathi English Dictionary p. 6)

اس لئے اس لفظ کو رحیم کے ہم معنیٰ سمجھ کر اللہ کے لئے ہرگز استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح شیو مشرکانہ مذہب

میں تین خداؤں (تری مورتی) میں سے ایک خدا کا نام ہے۔ ساتھ ہی اس کے معنیٰ مرد کے عضو مخصوص کے بھی ہیں ملاحظہ ہو:۔

(Students Sanskrit English Dictionary by Apte p. 556)

شیولنگ کی پوجا بھی کی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مشرکوں نے اپنے خداؤں کا نام رکھنے میں کس ذہنیت کا ثبوت دیا ہے؟ (**نعوذ باللّٰہِ من ذٰلک**)۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ اس کی پاکیزگی بیان کرو۔ یعنی اس کو ہر قسم کے نقص، عیب اور شرک سے منزہ قرار دو۔ اور تیسری ہدایت یہ ہے کہ اس کی تنزیہ کے تصور کے ساتھ اسی کا نام جپتے رہو کہ اسی کا نام جپنے کے لائق ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی بنا پر سجدہ میں **سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی** (پاک ہے میرا رب اعلیٰ) پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ (ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ) گویا سجدہ کی یہ تسبیح اس حکم کی تعمیل میں ہے جو اس آیت میں دیا گیا ہے۔

۳ اگر انسان اتفاقی حادثہ کے طور پر وجود میں آ گیا ہوتا تو اس کے اندر تناسب، موزونیت اور حسن و جمال نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ صریح نشانی ہے اس بات کی کہ اُسے خدائے برتر نے پیدا کیا ہے۔

۴ یعنی انسان کی پیدائش بغیر کسی منصوبہ کے نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے خالق نے اس کا ایک منصوبہ بنایا ہے، جس کے مطابق اسے دنیا میں ایک مقررہ مدت تک کام کرنا ہے۔ یہ منصوبہ مختصراً یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی آزمائشی ہوگی اور ہر شخص کو آزمائش کے جن مراحل سے گذرنا ہوگا اور اس کو جو قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی جائیں گی، اور جو وسائل اور مواقع فراہم کر دیئے جائیں گے، وہ سب ایک طے شدہ فیصلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں ''تقدیر'' ہے۔ یعنی خدا کا پیشگی تیار کردہ منصوبہ۔

۵ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس منصوبہ سے انسان کو بے خبر نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اجمالاً اس کا شعور اس کی فطرت ہی میں رکھ دیا ہے، جن کی بناء پر اس کا ضمیر اسے برائی پر ٹوکتا ہے اور اچھائی پر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا اچھا انجام دیکھنا چاہتا ہے۔ اور نہیں چاہتا کہ بُرا انجام اس کے سامنے آئے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو انسان فطرۃً اپنے کو امتحان گاہ ہی میں محسوس کرتا ہے۔ اس احساس کو جو چیز تازہ کرتی ہے اور خدائی منصوبہ سے اُسے اچھی طرح باخبر کرتی ہے وہ وحیِ الٰہی ہے، جس کا ذکر آگے کی آیات میں آ رہا ہے۔ گویا انسان کے خالق نے اس کے لئے خفی اور جلی دونوں طرح کی رہنمائی کا سامان کر دیا ہے۔ اگر فطرت کی آواز ہدایت خفی ہے تو وحیِ الٰہی ہدایتِ جلی۔ اس کے بعد انسان اپنے کئے کا آپ ذمہ دار ہے اور اس کے لئے یہ کہنے کا موقع نہیں کہ میرے رب نے میری ہدایت و رہنمائی کا سامان نہیں کیا۔

۶ یعنی جب چارہ اگتا ہے تو سرسبز ہوتا ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے کہ سیاہ کوڑا کرکٹ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے خدا کے منصوبہ کی، جو اس دنیا میں کارفرما ہے۔ اور اس سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ پوری دنیا کے لئے بھی خدا کا ایک منصوبہ ہے۔ اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ اس پر خزاں کو لازماً آنا ہے تاکہ اس کے بعد آخرت کا ظہور ہو۔ لہٰذا

انسان اس دنیا کو سرسبز دیکھ کر اس خام خیالی میں مبتلا نہ رہے کہ یہ ہمیشہ پُر بہار رہے گی اور اس پر کبھی خزاں آنے والی نہیں۔

۷ اس آیت میں خطاب نبی ﷺ سے ہے۔ اور فرمایا یہ جارہا ہے کہ قرآن کی شکل میں جو وحی ہم نازل کررہے ہیں، اس کو آپ کے ذہن میں محفوظ کردینے کی ذمہ داری ہم نے لی ہے۔ لہٰذا اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی حصہ تم بھول جاؤ ۔ واضح رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شروع شروع میں اس اندیشہ سے کہ کہیں کوئی آیت یا لفظ بھول نہ جائیں، جب قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو اس کو اخذ کرنے میں جلدی فرماتے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ قرآن اور پیغمبر کی صداقت کی دلیل ہے۔ کیوں کہ پورا قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح یاد ہوگیا کہ آپ اس کا ایک لفظ بھی نہیں بھولے۔ اور آپ نے پوری صحت کیساتھ مکمل قرآن کو امت کی طرف منتقل کیا۔ اور آج ہمارے سامنے اس کے لاکھوں اور کروڑوں نسخے اپنی اصل شکل میں اس طرح موجود ہیں کہ قیامت تک کیلئے اس کے محفوظ ہونے کا سامان ہوگیا ہے۔ گویا قرآن ایک مستقل اور دائمی معجزہ ہے، جس کا مشاہدہ ہر دور کے لوگ کرسکتے ہیں۔

۸ یعنی اگر اللہ ہی بھلانا چاہے تو اور بات ہے۔

۹ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اے نبی قرآن کو یاد رکھنے کے سلسلہ میں جو اندیشہ تم اپنے دل میں محسوس کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ قرآن کا سبق تمہیں وہ ہستی دے رہی ہے، جس کا علم تمام باتوں کو محیط ہے۔ اور اس نے اسے تمہارے حافظہ میں ٹھیک ٹھیک محفوظ کردینے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

۱۰ اس آیت میں نبی ﷺ کیلئے مزید اطمینان کا سامان کیا گیا ہے کہ قرآن کا جوں کا توں لوگوں تک پہنچانا، گو دشوار ترین کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان تمام دشواریوں کے درمیان سے تمہارے لئے آسان راہ نکالے گا۔

قرآن کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ اُمّی تھے، لیکن نہ صرف پورے قرآن کو حفظ کرنا آپ کیلئے آسان ہوگیا، بلکہ اس کے ساتھ اس کو لوگوں تک پہنچانا، اس کا درس دینا، اس کے ذریعہ تذکیر کرنا، اس کی تشریح وتوضیح کرنا، اس کے غامض نکات اور اس کی پُر حکمت باتوں کو بیان کرنا، اس سے استنباط کرنا اور اس کے احکام کو نافذ کرنا بھی آسان ہوگیا۔ اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے ساتھی عطاء فرمائے، جو قرآن کی کتابت کا کام بحسن خوبی انجام دیتے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کیلئے قرآن کی حفاظت کا سامان ہو۔ اسی طرح آپ ﷺ کو کتنے ہی ایسے ساتھی مل گئے جنہوں نے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کرلیا۔ یہ حفاظ اور قرّاء کہلائے اور انہوں نے قرآن کو پھیلانے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔

۱۱ یعنی دعوت وتبلیغ اور تذکیر ونصیحت کا کام، نہ لٹھ چلانے کا کام ہے اور نہ اندھے کے ریوڑی بانٹنے جیسا کام، بلکہ یہ ایک حکیمانہ کام ہے۔ جس کے لئے موقع ومحل کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ بے موقع وعظ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور نہ اندھوں اور بہروں کو نصیحت کرنے کا کچھ فائدہ ہے۔ اس لئے جہاں داعی یہ محسوس کرے کہ لوگ نصیحت

کے سننے کے موڈ میں نہیں ہیں، وہاں زبردستی انہیں سُنانے کی کوشش نہ کرے۔

اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عام بگاڑ کو دیکھ کر آدمی پیشگی یہ فیصلہ کر کے بیٹھ جائے کہ دعوت وتبلیغ یا تذکیر ونصیحت کچھ سودمند ہونے والی نہیں۔ لہٰذا یہ کام سرے سے کیا ہی نہ جائے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ڈاکٹر لوگوں کی بدپرہیزیوں کو دیکھ کر اپنا مطب بند کر دے اور گھر میں بیٹھ جائے۔ یا محکمہ حفظانِ صحت یہ دیکھ کر کہ صحت کے معاملہ میں عام طور سے لوگ بے پرواواقع ہوئے ہیں اور مضرِ صحت اشیاء کا استعمال بڑھتا جارہا ہے، سرے سے اپنے فرائض ہی ترک کر دے۔ جن لوگوں کی نظر انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ دعوت پر ہو وہ اس طرح کا فیصلہ ہرگز نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ دعوت میں حکمت اور موقع محل کی رعایت کی نشاندہی تو ضرور کی جاسکتی ہے، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا کہ عام بگاڑ کے پیشِ نظر انہوں نے دعوت واصلاح کا کام ہی موقوف کر دیا ہو۔ بلکہ وہ ہمیشہ مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے رہے ہیں۔ اور اصلاح کا جو کام بھی انجام پاسکا ہے، موجوں کے تھپیڑے کھا کر ہی انجام دیا جاسکا ہے۔

یہاں سیاق کلام سے بھی واضح ہے کہ تذکیر عام تو ہونی چاہئے۔ اسی صورت میں اس کو قبول کرنے والے بھی نکل آئیں گے اور اس سے گریز کرنے والے بھی۔

۱۲ یعنی جس شخص کے دل میں خدا کا خوف ہوگا وہ پیغمبر کی بات ضرور توجہ سے سنے گا۔ اور اس نصیحت کو قبول کرے گا، جو پیغمبر پر خدا کی طرف سے قرآن کی شکل میں نازل ہوئی ہے۔

۱۳ یعنی جہنم میں نہ وہ جینے کا لطف اٹھا سکے گا۔ اور نہ موت ہی آئے گی کہ ساری کلفتوں کا خاتمہ کر دے۔ بلکہ وہ زندگی وموت کی کشمکش میں مبتلا رہے گا، جس کا انسان تصور ہی کرے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور وہ اس سے اللہ کی پناہ مانگنے لگے۔

واضح رہے کہ یہاں ان لوگوں کی سزا کا حال بیان ہوا ہے، جو پیغمبر کی نصیحت سے گریز کریں، اور آخر وقت تک اس ''تذکیر'' کو قبول نہ کریں، جو پیغمبر پر نازل ہوئی ہے۔

صفحہ نمبر ۱۰۷ سے آگے

واضح رہے کہ متن میں لفظ ''ضریع'' استعمال ہوا ہے جو ایک خاردار اور زہریلی جھاڑی کا نام ہے۔

۱۰ اب ان لوگوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے جو آخرت پر ایمان لائے اور خدا کے حضور جواب دہی کے اندیشہ سے ذمہ دارانہ زندگی گذارتے رہے۔

۱۱ یعنی اپنی کوششوں کے بہترین نتائج دیکھ کر وہ خوش ہوں گے کہ اچھا ہوا انہوں نے آخرت کو مقصود بنا کر زندگی بسر کی۔ اور دنیا پرستی میں مبتلا نہیں ہوئے۔

۱۲ یعنی وہ ایسے باغ میں ہوں گے جو بلندی پر بھی ہوگا اور اعلیٰ درجہ کا بھی۔

۱۳ یعنی جنت کی سوسائٹی اس قدر پاکیزہ اور وہاں کی مجلسیں اتنی شائستہ ہوں گی کہ نہ تو کوئی شخص ناشائستہ بات اپنی زبان سے نکالے گا اور نہ کسی کو بیہودہ بات سننے کے لئے سمع خراشی کرنا ہوگی۔ دنیا کے موجودہ ماحول سے جہاں فحش باتوں اور لغو گانوں سے اپنے کانوں کو محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا ہے، جنت کا ماحول بالکل مختلف اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل ہوگا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوگی جو پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو نصیب ہوگی۔

۱۴ جنت میں چشموں کا رواں ہونا ایک تو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کی سرسبزی و شادابی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ اور دوسرے اس بات کی طرف کہ پانی اور دوسرے اعلیٰ قسم کے مشروبات وہاں وافر مقدار میں مہیا ہوں گے۔

۱۵ اونچے اور شاندار تخت شاہانہ زندگی کی علامت ہیں۔ اور اہل جنت کو ایسی ہی زندگی نصیب ہوگی۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۴﴾	۱۴ کامیاب ہوا وہ، جس نے پاکیزگی اختیار کی۔۱۴
وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿۱۵﴾	۱۵ اور اپنے رب کا نام لیا۔۱۵ اور نماز پڑھی۔۱۶
بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾	۱۶ مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔۱۷
وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾	۱۷ حالانکہ آخرت بدرجہا بہتر اور پائدار ہے۔۱۸
اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾	۱۸ یہ (تعلیم) اگلے صحیفوں میں بھی دی گئی تھی۔
صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾	۱۹ ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔۱۹

۱۴؎ پاکیزگی اختیار کرنے سے مراد قلب وذہن کی پاکیزگی بھی ہے اور اخلاق واعمال کی پاکیزگی بھی۔ قلب و ذہن کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی شرک اور کفر والحاد کی آلودگی سے اپنے کو پاک کرلے۔ اور خدا و آخرت پر ایمان لے آئے۔ اور اخلاق وعمل کی پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی برائیوں کو چھوڑ دے اور نیک کام کرے۔

۱۵؎ اپنے رب کا نام لینے سے مراد محض رسماً نام لینا نہیں۔ کیونکہ اس طرح کا نام تو مشرک بھی لیتے ہیں اور کافر بھی۔ بلکہ نام لینے سے مراد خدا کو دل سے اور حقیقی طور سے یاد کرنا ہے۔ نیز زبان سے صحیح نام کے ساتھ اس کا ذکر کرنا ہے۔

۱۶؎ ''اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی'' سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ نماز کا اصل محرک اللہ کی یاد ہے۔ یہ یاد ہی بندہ کو اس کی عبادت کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ یہیں سے حقیقی نماز اور رسمی نماز کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ حقیقی نماز اللہ کی یاد کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس کے اندر روح کی طرح سموئی ہوتی ہے۔ گویا اپنے رب کی یاد اسے عبادت کے لئے بے چین کرتی ہے اور وہ نماز ہی میں سکون پاتا ہے۔ بخلاف اس کے رسمی نماز ایک بوجھ اتارنے کا کام ہے۔ اسی لئے اس میں دل نہیں لگتا۔

نماز کا ذکر یہاں جس انداز سے ہوا ہے۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں نماز کا کیا مقام ہے۔ یہ سورہ مکہ کے ابتدائی دور کی تنزیل ہے اور اس میں آخرت کی کامیابی کے لے جو اوصاف ضروری قرار دیئے گئے ہیں ان میں نماز بھی شامل ہے۔ اور شرعی احکام میں اسے اوّلیت حاصل ہے۔

واضح رہے کہ نماز (صلوٰۃ) کو یوگا (yoga) سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ کیوں کہ نماز خالصۃً اللہ کی عبادت ہے جب کہ یوگا مشرکانہ طرز کی ریاضت۔

۱۷؎ یعنی فلاح آخرت کی یہ راہ، جس پر چل کر آدمی اپنے ظاہر و باطن کو سنوارتا ہے، محض اس لئے تم لوگ اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں ہو کہ اصل اہمیت تمہاری نگاہ میں دنیا کی ہے نہ کہ آخرت کی۔ تم کو فکر ہے تو دنیا کی اور آسائش چاہتے ہو تو دنیا ہی میں۔ دنیا کا کوئی مفاد قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہو اور سمجھتے ہو کہ یہاں کے ''نقد'' فائدے حاصل کرنا ہی عقلمندی ہے۔

۱۸؎ یعنی دنیا کے مقابلہ میں آخرت اس لئے قابل ترجیح ہے کہ وہاں کی زندگی ہر لحاظ سے بہتر اور وہاں کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ مزید برآں آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے جب کہ دنیا فانی ہے۔

۱۹؎ یعنی توحید و آخرت کی یہ تعلیم جو قرآن پیش کر رہا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے، جو پہلی مرتبہ پیش ہوئی ہو۔ بلکہ اللہ کی طرف سے ہمیشہ یہی ہدایت نازل ہوتی رہی ہے۔ اور قدیم سے قدیم صحیفوں (آسمانی کتابوں) میں بے کم و کاست یہی تعلیم موجود رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے پیرو اس تعلیم کو یا تو بھلا چکے یا اس میں انہوں نے بڑی حد تک تحریف کی۔ اس لئے قرآن کے ذریعہ پھر اس تعلیم کی تجدید کی جا رہی ہے۔

آسمانی کتابوں میں سب سے قدیم صحیفہ ابراہیم علیہ السلام کا ہے، لیکن وہ محفوظ نہیں رہا ہے۔ رہے موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے تو ان سے مراد تورات ہے، جو اپنی اصل شکل میں تو موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کے کچھ اجزاء عہد نامہ عتیق (Oldtestament) کی پانچ کتابوں میں، جو پیدائش، خروج اور احبار، گنتی اور استثناء کے نام سے پائی جاتی ہیں، دیکھے جاسکتے ہیں۔ خاص طور سے توحید کی تعلیم اب بھی ان میں واضح طور پر موجود ہے۔ مثلاً: ''میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا، تو اپنے لئے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا۔'' (خروج ۲۰، ۳، ۴)

پھر خداوند تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا، بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہہ کہ تم پاک رہو۔ کیوں کہ میں جو خداوند تمہارا خدا ہوں پاک ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم بتوں کی طرف رجوع نہ ہونا اور نہ اپنے ڈھالے ہوئے دیوتا بنانا۔'' (احبار ۱۹: ۱ تا ۴)

'' تو خداوند اپنے خدا کا خوف ماننا۔ اس کی بندگی کرنا اور اس سے لپٹے رہنا اور اُسی کے نام کی قسم کھانا۔ وہی تیری حمد کا سزاوار ہے اور وہی تیرا خدا ہے۔ (استثناء ۱۰، ۲۰، ۲۱)

اور موسیٰ علیہ السلام نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت بنی اسرائیل کو جمع کر کے جو گیت سنایا اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

'' کان لگاؤ اے آسمانو! اور میں بولوں گا۔ اور زمین میرے منھ کی باتیں سنے۔ میری تعلیم مینہ کی طرح برسے گی۔ میری تقریر شبنم کے مانند ٹپکے گی، جیسے نرم گھاس پر پھوار پڑتی ہو اور سبزی پر جھڑیاں۔ کیوں کہ میں خداوند کے نام اشتہار دوں گا تم ہمارے خدا کی تعظیم کرو۔۔۔۔۔۔ وہ وہی چٹان ہے۔ اس کی صنعت کامل ہے۔ کیونکہ اس کی سب راہیں انصاف کی ہیں۔ وہ وفادار خدا اور بدی سے مبّرا ہے۔ وہ منصف اور برحق ہے۔'' (استثناء ۳۲: ۱ تا ۴)

(۸۸) الغاشیۃ

نام اس سورہ کی پہلی آیت میں قیامت کی عام اور ہمہ گیر مصیبت کے لئے غاشیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کی مناسبت سے اس کا نام ''الغاشیہ'' ہے۔

زمانۂ نزول سورہ مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی ہوگی جب کہ دعوت وتبلیغ کا کام ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھا۔

مرکزی مضمون جزا وسزا ہی ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے فقروں میں جنت ودوزخ کی تصویر کشی ایسے مؤثر پیرایہ میں کی گئی ہے کہ پڑھنے والا، بشرطیکہ آنکھیں رکھتا ہو اسی دنیا میں انکا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔

یہ سورہ سابق سورہ کا تکملہ ہے۔ اس میں جنت ودوزخ کا ذکر اجمالاً تھا لیکن اس سورہ میں دونوں کا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے۔ اس لئے نماز میں سورۂ الاعلیٰ کے ساتھ سورۂ الغاشیہ بھی پڑھی جاتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ اور عیدین کی پہلی رکعت میں سورۂ اعلیٰ پڑھتے تو دوسری رکعت میں سورۂ الغاشیہ۔ (مسلم کتاب الجمعہ)

نظم کلام آیت ۱ میں قیامت کی ہمہ گیر آفت کی خبر دی گئی ہے تا کہ غفلت میں پڑے ہوئے انسان چونک جائیں۔

آیت ۲ تا ۷ میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے جو قیامت کے منکر ہیں۔ اور خدا کے حضور جوابدہی کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔

آیت ۸ تا ۱۶ میں ان لوگوں کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ جو قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور خدا کے حضور جوابدہی کے تصور کے تحت زندگی گذارتے ہیں۔

آیت ۱۷ تا ۲۰ میں آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ جو خدا کی قدرت وحکمت پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان پر غور کرنے سے قرآن کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ وہ خدا قیامت کے برپا کرنے اور جنت و دوزخ والی دنیا پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اور ضروری ہے کہ جزا وسزا کا معاملہ پیش آئے۔

آیت ۲۱ تا ۲۶ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ آپ کا کام صرف یاددہانی اور نصیحت کرنا ہے۔ حق کو زبردستی منوانے کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی ہے، لہٰذا جو لوگ آپ کی نصیحت سننے کے لئے تیار نہیں ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ آخر کار ان کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ اس وقت وہ ان سے حساب لے لے گا۔

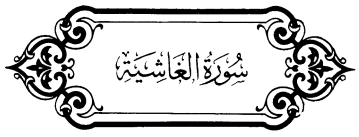

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۸۸) سورۃُ الغاشية

آیات ۲۶

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱

۱ کیا تمہیں ۱ چھا جانے والی آفت کی خبر پہنچی ہے؟ ۲

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲

۲ کتنے چہرے ۳ اس روز رُسوا ہوں گے۔ ۴

عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳

۳ مشقت کرنے والے تھکے ماندے ہوں گے۔ ۵

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴

۴ دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔ ۶

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵

۵ کھولتے چشمہ کا پانی انہیں پلایا جائے گا۔ ۷

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝۶

۶ ان کے لئے جھاڑ کانٹے کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا۔ ۸

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝۷

۷ جو نہ موٹا کرے گا اور نہ بھوک ہی کو دفع کرے گا۔ ۹

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ ۝۸

۸ کتنے چہرے اس روز بارونق ہوں گے۔ ۱۰

لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝۹

۹ اپنی کوششوں پر شاداں۔ ۱۱

فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۱۰

۱۰ بلند پایہ جنت میں۔ ۱۲

لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۝۱۱

۱۱ جہاں کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔ ۱۳

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ۝۱۲

۱۲ اس میں چشمے بہہ رہے ہوں گے۔ ۱۴

فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ۝۱۳

۱۳ اس کے اندر اونچے تخت ہوں گے۔ ۱۵

۱؎ خطاب گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن مقصود عام انسانوں کو آگاہ کرنا ہے۔

۲؎ چھا جانے والی آفت (الغاشیہ) سے مراد قیامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کا ظہور ایک ہمہ گیر آفت کی شکل میں ہوگا جو سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ یہاں اس بات کو سوالیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے تا کہ سننے والے چونک جائیں۔ اور آگے جو احوال قیامت پیش کئے جا رہے ہیں ان کو بغور سنیں۔

۳؎ چہرے (وجوہ) سے مراد اشخاص ہیں۔ چونکہ انسان کی اندرونی کیفیت کا اظہار چہرے سے ہوتا ہے اور اس کی شخصیت بھی اسی سے پہچانی جاتی ہے اس لئے یہاں اشخاص کے چہروں (وجوہ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

۴؎ یہ ان لوگوں کے حال کا بیان ہے جو جزا و سزا کا انکار کرتے رہے۔ اور اس تصور کے تحت زندگی گذارتے رہے کہ نہ انہیں خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور نہ اپنے کئے کا حساب پیش کرنا ہے۔

۵؎ یعنی قیامت کے دن منکرین کو سخت مشقت کے کام کرنا پڑیں گے، جن سے تھک کر وہ نڈھال ہو جائیں گے۔ مثلاً قبروں سے اٹھتے ہی اپنے موقف تک دوڑنے، پیشی کے انتظار میں سالہا سال تک سخت گرمی میں بھوکے پیاسے کھڑے ہونے، طوق پہننے اور زنجیریں گھسیٹنے جیسے کام۔ جن لوگوں نے دنیا میں شرعی پابندیوں سے اپنے کو آزاد کر رکھا تھا اور نماز جیسی عبادت کو وہ بوجھل خیال کرتے رہے۔ ان کی اس سہولت پسندی اور تن آسانی کا ٹھیک ٹھیک بدلہ یہی ہوگا کہ وہ قیامت کے دن تھکا دینے والے کام کریں اور ''قید بامشقت'' کی سزا بھگتیں۔

۶؎ یعنی قیامت کے موقف سے، جب یہ منکرین لوٹیں گے تو سیدھے جہنم رسید ہوں گے، جس کی آگ بھڑک رہی ہوگی۔

۷؎ کھولتا ہوا پانی اس لئے کہ جب انہوں نے خدا اور آخرت سے بے نیاز ہو کر زندگی گذاری۔ اور اس کے انعام کا اپنے کو امیدوار نہیں بنایا تو وہ بجا طور پر اس بات کے مستحق ہوئے کہ ان کی تواضع آخرت میں کھولتے ہوئے پانی سے کی جائے۔

۸؎ یعنی کھانے کے لئے انہیں غذائیت رکھنے والی اور ذائقہ دار کوئی چیز نہیں ملے گی البتہ جھاڑ کانٹے۔ اور اسی طرح زقوم اور پیپ وغیرہ انہیں ضرور کھانا پڑیں گے۔ جو ظاہر ہے غذا کا کام نہیں دے سکتے۔

یہ بدلہ بھی ٹھیک ان کے عمل کے مطابق ہوگا۔ کیوں کہ انہوں نے خدا سے ملنے کا انکار کر کے دنیا میں کانٹے ہی بوئے تھے، اس لئے انہوں نے جو بویا تھا وہی انہیں کھانے کے لئے ملے گا۔

۹؎ یعنی ان جھاڑ کانٹوں میں سرے سے غذائیت ہی نہیں ہوگی۔ اس لئے جسم کو نہ توانائی حاصل ہو سکے گی اور نہ بھوک ہی مٹ سکے گی۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جسم کو تقویت پہنچانے اور بھوک کو مٹانے کے لئے طرح طرح کی ذائقہ دار غذائیں بخشی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے ان نعمتوں کو پانے کے بعد بھی اپنے رب کی ناشکری کی تو وہ اسی لائق ٹھہرے کہ جھاڑ کانٹے کھائیں۔ (دیکھئے بقیہ صفحہ ۱۰۱ پر)

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿۱۴﴾	۱۴ اور پیالے ہوں گے قرینے سے رکھے ہوئے۔۱۶
وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿۱۵﴾	۱۵ اور گاؤ تکیے قطار کی شکل میں لگے ہوئے۔
وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿۱۶﴾	۱۶ اور قالین بچھے ہوئے۔۱۷
اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾	۱۷ کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے پیدا کئے گئے ہیں؟
وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾	۱۸ اور آسمان کو کہ کیسا بلند کیا گیا ہے؟
وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿۱۹﴾	۱۹ اور پہاڑوں کو کہ کس طرح کھڑے کر دئے گئے ہیں؟
وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿۲۰﴾	۲۰ اور زمین کو کس طرح بچھائی گئی ہے؟۱۸
فَذَكِّرْ ۗ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾	۲۱ تو (اے پیغمبر!) تم نصیحت کرو کہ تمہارا کام بس نصیحت کرنا ہے۔
لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴿۲۲﴾	۲۲ ان پر جبر کرنا نہیں ہے۔۱۹
اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾	۲۳ مگر جو منہ موڑے گا ۲۰ اور کفر کریگا۔۲۱
فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ ﴿۲۴﴾	۲۴ تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔۲۲
اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾	۲۵ بے شک ہماری ہی طرف ہے ان کی واپسی۔۲۳
ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾	۲۶ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے ان سے حساب لینا۔۲۴

۱۶؎ یعنی پیالے یا گلاس سامنے رکھے ہوئے ہوں گے۔ انہیں جنت کے مشروبات پینے کے لئے کوئی زحمت کرنا نہیں ہوگی۔

۱۷؎ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل جنت کی زندگی کیسی آسائش کی زندگی ہوگی۔ اور ان کے لئے کیسا وافر اور نفیس سامان آرائش وہاں موجود ہوگا۔

اوپر کی آیات میں جنت کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس سے جنت کا صحیح اور صاف ستھرا تصور قائم ہوتا ہے اور اتنی بات اس کی اُمنگ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ رہی اس کی اصل حقیقت تو عالم آخرت کی چیزوں کو ہم مادی پیمانوں سے ناپ نہیں سکتے اس لئے اس پر بحثیں کھڑی کرنا بالکل بے سود ہے۔

۱۸؎ اوپر قیامت اور جنت و دوزخ کا جو ذکر ہوا اس کا انکار کرنے والوں کو یہاں دعوت فکر دی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں گرد و پیش کی چیزوں کی طرف انہیں متوجہ کیا گیا ہے۔ صحرائے عرب میں دوران سفر ان کی نگاہ سب سے پہلے اونٹ پر پڑتی تھی۔ اس لئے انہیں سب سے پہلے اس پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ کیا یہ دیکھتے نہیں کہ یہ جانور کن خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے؟ جن خصوصیات کی صحرائی زندگی کے لئے ضرورت تھی ٹھیک ان خصوصیات کے ساتھ اونٹوں کا پیدا کیا جانا، کیا اللہ کی صفت قدرت، ربوبیت اور حکمت پر دلالت نہیں کرتا؟

صحرا میں اونٹ پر سفر کرنے والوں کو آسمان، پہاڑ، اور زمین نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان سے کہا گیا کہ انہی چیزوں پر غور کریں کہ کیا یہ بلند آسمان اللہ کی عظیم قدرت کی شہادت نہیں دیتا؟ اور کیا یہ پہاڑ جو زمین پر کھڑے کر دئے گئے ہیں اس کی محکم کاریگری اور صناعی کا نشان نہیں ہیں؟ اور کیا یہ زمین جسے اس طرح بچھا دیا گیا ہے کہ وہ اربوں انسانوں کے بسنے کے قابل ہوگئی اس کی ربوبیت اور حکمت پر دلالت نہیں کرتی؟ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے ۔۔۔۔۔ اور عقل کہتی ہے کہ یہی بات صحیح ہے۔ تو پھر اس خدا کے لئے قیامت کو برپا کرنا، انسان کو دوبارہ پیدا کرنا اور جنت و دوزخ والی دنیا بنا دینا کیا مشکل ہے؟ اور کیا اس کی ربوبیت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ وہ ایک دن ایسا لائے؟ جس میں وہ اپنے بندوں سے حساب لے کہ انہوں نے اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی شکر گذاری کی یا ناشکری؟ اور کیا یہ بات اس کی حکمت کے خلاف نہ ہوگی کہ انسان جیسی اعلیٰ مخلوق کی کوئی غایت نہ ہو؟ اور اس کی تخلیق کے پیچھے سرے سے کوئی منصوبہ اور کوئی اسکیم ہی نہ ہو؟

۱۹؎ یعنی پیغمبر کا کام تذکیر و دعوت اور انذار و تبلیغ ہے۔ لوگوں سے زبردستی بات منوا لینے کا کام پیغمبر کے سپرد نہیں کیا گیا ہے۔

۲۰؎ منہ موڑنا یہ ہے کہ آدمی نصیحت کی بات سننا پسند نہ کرے، قرآن کی تذکیر اس پر گراں ہو اور جب یاددہانی کی کوئی بات اس کے سامنے آجائے تو وہ اس سے عدم دلچسپی کا اظہار کرے یا کترا کر نکل جائے۔

۲۱؎ کفر یہ ہے کہ آدمی قرآن کی تذکیر کو قبول نہ کرے اور اس کی ہدایت اور تعلیمات کو ماننے سے انکار کر دے۔

۲۲؎ یعنی منکرین پر آخرت میں اللہ کا عذاب ایسا زبردست ہوگا کہ اس کا مقابلہ دنیا کی بڑی سے بڑی سزا سے

نہیں کیا جاسکتا۔ مگر قرآن کی اس واضح تنبیہ کے باوجود جو لوگ کفر کی راہ اختیار کریں انہیں اس انجام کو پہنچنے سے کون بچا سکتا ہے!

۲۳؎ اللہ کی طرف واپسی کا مطلب یہ ہے کہ سب کو ایک دن اسی کے حضور حاضر ہونا ہے کسی اور کے حضور نہیں۔ پھر یہ کہاں کہ دانشمندی ہے کہ آدمی اس فکر ہی سے بے نیاز ہو جائے کہ اسے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔

۲۴؎ یعنی قیامت کے دن جب اللہ کے حضور تمام لوگوں کی حاضری ہوگی تو وہ ہر ایک سے حساب لے گا۔ اس وقت ان لوگوں کو جنہوں نے پیغمبر کی نصیحت پر کان نہیں دھرا اور قرآن کی رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے سخت جواب دہی کرنا ہوگی۔

(۸۹) الفجر

نام سورہ کا آغاز وَالفَجرِ (قسم ہے فجر کی) سے ہوا ہے۔اسی مناسبت سے اس کا نام ''الفجر'' ہے۔

زمانہ نزول مکی ہے اور مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کی تنزیل ہے، جب کہ اہل مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تذکیر کا اثر قبول کرنے کے بجائے، سرکشی اور ظلم وفساد کا رویہ اختیار کیا تھا۔

مرکزی مضمون جزا وسزا ہے۔خاص طور سے سزا کے پہلو کو نمایاں طور سے پیش کیا گیا ہے تا کہ جو لوگ دنیا پرستی میں مگن ہیں وہ ہوش میں آئیں۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں رات اور دن کے طبعی احوال کو روز جزا کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۶ تا ۱۴ میں تاریخ کی بعض عظیم قوموں کے عبرت ناک انجام کو، اس بات کی تائید میں پیش کیا گیا ہے کہ اس کائنات کا فرمانروا، افراد اور قوموں پر نظر رکھے ہوئے ہے۔اور وہ ایک دن ضرور ان سے محاسبہ کرے گا۔

آیت ۱۵ تا ۲۰ میں انسان کی غلط طرز عمل خاص طور سے کمزوروں کے حقوق غصب کرنے پر سخت گرفت کی گئی ہے۔اور واضح کیا گیا ہے کہ یہ طرز عمل نتیجہ ہے انکار آخرت کا۔

آیت ۲۱ تا ۳۰ میں عدالت خداوندی کی تصویر پیش کرتے ہوئے منکرین ومؤمنین کا انجام بیان کیا گیا ہے۔

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ ۙ﴿۱﴾

وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۙ﴿۲﴾

وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۙ﴿۳﴾

وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ۚ﴿۴﴾

هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ؕ﴿۵﴾

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۙ﴿۶﴾

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۙ﴿۷﴾

الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۙ﴿۸﴾

وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۙ﴿۹﴾

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْاَوْتَادِ ۙ﴿۱۰﴾

الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ۙ﴿۱۱﴾

فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ۙ﴿۱۲﴾

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۚ﴿۱۳﴾

(۸۹) سُورۃُ الفجر

آیات ۳۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ۱ فجر کی۔ ۲

۲ اور دس راتوں کی۔ ۳

۳ اور جفت اور طاق کی۔ ۴

۴ اور رات کی جب کہ وہ رخصت ہو رہی ہو۔ ۵

۵ کیا اس میں ایک عقلمند کے لئے کوئی قسم نہیں ہے؟ ۶

۶ تم نے نہیں دیکھا ۷ کہ تمہارے رب نے کیا معاملہ کیا عاد کے ساتھ! ۸

۷ بلند عمارتوں والے ۹ ارم کے ساتھ! ۱۰

۸ جن کے مانند کوئی (قوم) کسی ملک میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔ ۱۱

۹ اور ثمود کے ساتھ ۱۲ جو وادی ۱۳ میں چٹانیں تراشا کرتے تھے۔ ۱۴

۱۰ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ! ۱۵

۱۱ ان لوگوں نے ملکوں میں سر اٹھا رکھا تھا۔

۱۲ اور ان میں بہت فساد مچا رکھا تھا۔ ۱۶

۱۳ تو تمہارے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ ۱۷

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ ۱۴؎۔

۲؎ فجر سے مراد وہ وقت ہے جب رات کی تاریکی میں دن کی روشنی مشرقی افق پر نمودار ہوتی ہے۔اس کا دوسرا نام صبح صادق ہے جسے اردو میں ہم پَو پھٹنا کہتے ہیں۔فجر کا وقت طلوع آفتاب تک رہتا ہے جب کہ صبح کا اطلاق طلوع آفتاب کے بعد کے وقت پر بھی ہوتا ہے۔

۳؎ دس راتوں سے مراد قمری ماہ کی دس راتیں ہیں۔اور فجر کی مناسبت سے درمیانی دس راتیں یعنی گیارہویں تا بیسویں شب مراد لینا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔کیوں کہ یہ راتیں چاند سے روشن رہتی ہیں۔

۴؎ سلسلہ کلام کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہاں جفت اور طاق سے مراد جفت اور طاق راتیں ہی لی جاسکتی ہیں۔کیوں کہ رات کا ذکر اس سے پہلے بھی ہوا ہے اور اس کے بعد بھی۔راتیں کسی مہینہ میں جفت عدد ہوتی ہیں اور کسی میں طاق عدد۔یعنی کوئی مہینہ ۳۰ راتوں کا ہوتا ہے اور کوئی ۲۹ راتوں کا۔

۵؎ رات کے رخصت ہونے سے مراد وہ وقت ہے جب تاریکی ختم ہونے اور پَو پھٹنے کو ہوتی ہے۔

۶؎ یعنی کیا ان چیزوں میں رہنمائی کا کوئی سامان موجود نہیں ہے؟ اور کیا ایک آدمی پر جو عقل و ہوش سے کام لے آسمان پر ظاہر ہونے والے ان آثار سے قرآن کے بیان کی صداقت روشن نہیں ہوتی؟ یہ سوال اثبات کے لئے اور بات کو مؤکد کرنے کیلئے ہے۔یہاں شب و روز کے نظام پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے،جس کا مشاہدہ انسان روزانہ کرتا ہے۔اس کا آغاز فجر سے ہوتا ہے اور اختتام رات کے رخصت ہو جانے پر۔فجر رات کی تاریکی کو چاک کر کے نمودار ہوتی ہے،جس وقت صبح کی سفید دھاری افق پر نمایاں ہو جاتی ہے تو وہ منظر بہت عجیب ہوتا ہے۔اسی طرح ہر ماہ کی درمیانی دس راتیں جو چاند کے نور سے روشن ہوتی ہیں انسان کے قلب و ذہن پر خاص اثر ڈالتی ہیں۔پھر ہر مہینہ کا اختتام یا تو ۳۰ راتوں پر ہوتا ہے یا انتیس راتوں پر۔اس میں کبھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔اور رات کے جب رخصت ہونے کا وقت آجاتا ہے تو وہ خاموشی کے ساتھ اپنی بساط لپیٹ دیتی ہے۔اور اس طرح رخصت ہو جاتی ہے کہ گویا وہ رخصت ہونے ہی کے لئے آئی تھی۔اور اس کے رخصت ہوتے ہی وہ بزم بھی بے رونق ہو جاتی ہے جو اس نے سجائی تھی۔

رات دن مشاہدہ میں آنے والے یہ آثار کیا کسی مدبّر ہستی کا پتہ نہیں دیتے؟ شب و روز کا یہ عجیب و غریب نظام اور اس میں کمال درجہ کی باقاعدگی کس طرح پیدا ہو سکتی تھی،اگر اس کے پیچھے ایک زبردست قدرت اور حکمت رکھنے والی ہستی کا ہاتھ نہ ہوتا؟ پس یہ مشاہدہ انسان کو جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے وہ یہ ہے کہ یقیناً ایک مدبّر ہستی ہے،جس کے اشارہ پر کائنات کا یہ سارا نظام کمال درجہ کی باقاعدگی کے ساتھ نہایت محکم طریقہ پر چل رہا ہے۔اور جب وہ ہستی مدبّر ہے تو اس کی بنائی ہوئی دنیا بے غایت کیسے ہو سکتی ہے؟ اور اس کا پیدا کردہ انسان شتر بے مہار کس طرح ہو سکتا ہے؟ ضروری ہے کہ اس دنیا کی ایک غایت ہو اور انسان کی تخلیق کے پیچھے کوئی منصوبہ ہو۔قرآن اس غایت کی نشاندہی کرتا ہے۔اور خدائی منصوبہ کو کھول کر بیان کرتا ہے۔اس کے بیان کے مطابق دنیا کی عافیت آخرت ہے۔اور انسانی زندگی

کیلئے خدائی منصوبہ یہ ہے کہ اسے امتحان سے گذارا جائے۔اور جو اس امتحان میں کھرا ثابت ہواُسے آخرت کی لازوال نعمتوں سے نوازا جائے۔اور جو کھوٹا ثابت ہوا سے آگ میں جھونک دیا جائے۔قرآن کا یہ بیان دراصل اس حقیقت کی شرح ہے جو شب وروز کے نظام میں اور پوری کائنات میں اشارے کنایہ کی زبان میں بول رہی ہے۔اور قرآن کے بیان کا اس حقیقت سے جو کائنات میں کارفرما ہے اس درجہ ہم آہنگ ہونا اس کی صداقت کا بین ثبوت ہے۔

فجر کی قسم کا ایک اور پہلو بھی ہے۔فجر کا وقت روزانہ ظہور قیامت کی یاددہانی کراتا ہے۔جس طرح رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے فجر نمودار ہوتی ہے اسی طرح دنیا پر چھائی ہوئی تاریکی کا پردہ چاک کر کے قیامت کی فجر نمودار ہو گی۔اور جس طرح انسان صبح نیند سے بیدار ہوتا ہے اسی طرح قیامت کی صبح ظہور ہوتے ہی اٹھ بیٹھے گا۔اور محسوس کرے گا کہ ابھی سویا تھا اور ابھی جاگ گیا۔اسی حقیقت کی طرف وہ مسنون دعا متوجہ کرتی ہے جس کو صبح بیدار ہوتے ہی پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَمَااَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ (مسلم کتاب الذکر)

''شکر اللہ کا جس نے موت کے بعد ہمیں زندگی بخشی اور اسی کی طرف اٹھ کھڑے ہونا ہے''

۷ ''تم نے نہیں دیکھا'' کیا تم نے غور نہیں کیا؟'' کے مفہوم میں ہے۔جس طرح ہم بولتے ہیں'' تم نے نہیں دیکھا ہٹلر کا کیا انجام ہوا'' جب کہ ہٹلر کے انجام کے ہم عینی شاہد نہیں ہوتے بلکہ اس کو ایک تاریخی واقعہ کے طور پر جانتے ہیں۔ایسے موقع پر کہنے والے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ جو تاریخی طور پر ثابت ہے تمہارے لئے لائق غور ہے اور اس سے تمہیں سبق حاصل کرنا چاہئے۔

۸ عاد ایک قوم کا نام ہے جو جنوبی عرب کے ریگستانی صحرا ربع خالی میں احقاف کے علاقہ میں جو یمن اور حضر موت کے درمیان ہے آباد تھی۔اس کا زمانہ نوح علیہ السلام کے بعد اور ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔یعنی تقریباً ۳ ہزار سال قبل مسیح کا۔

۹ ''ذات العماد'' اس لئے کہا گیا کہ وہ بڑی بڑی بلند عمارتیں تیار کرتے تھے۔اور یہ طریقہ انہوں نے کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے نہیں، بلکہ محض قومی یادگار کھڑی کرنے اور شوق نمائش پورا کرنے کی غرض سے اختیار کیا تھا۔ان کے اس آرٹ میں اسراف بھی تھا اور دنیا پرستی کی جڑیں مضبوط کرنے کا سامان بھی۔

۱۰ عاد کو اِرم کی طرف اس لئے منسوب کیا گیا ہے کہ یہ لوگ سامی نسل (semetic race) کی اس شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو اِرم بن سام بن نوح سے چلی۔اِرم کا ذکر بائبل میں موجود ہے:

''بنی سم (سام) یہ ہیں۔۔۔اور اِرام ۔ اور بنی اِرام یہ ہیں عُوض۔۔۔'' (پیدائش : ۱۰ : ۲۲) بائبل کے اس بیان میں لفظ اِرام اِرم ہی کا تلفظ ہے۔

۱۱ یعنی زور وقوت اور شان وشوکت کے لحاظ سے ان کے زمانہ میں کوئی قوم ان کی برابر کی نہیں تھی۔اور ان سے

پہلے بھی اس شان کی کوئی قوم نہیں گذری تھی۔

عاد سرزمین عرب کی سب سے قدیم قوم ہے جو طوفانِ نوح کے بعد اپنی تعمیری ترقی اور قوت و اقتدار کے ساتھ اُبھری تھی۔ اور اپنی ان مادی خصوصیات کی بنا پر دنیا کی ایک ممتاز اور بے نظیر قوم تھی۔

۱۲؎ عاد کے بعد مادی ترقی اور دنیوی شان و شوکت کے لحاظ سے جو قوم اُبھری اس قوم کا نام ثمود تھا۔ اس کا بھی زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔

۱۳؎ وادی سے مراد وادی القریٰ ہے جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے۔ اس وادی کا اہم ترین مقام ''حجر'' تھا جس کو اب مدائن صالح کہتے ہیں۔ اور جو مدینہ سے شمال میں تقریباً ۱۸۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ علاقہ ثمود کا مسکن تھا۔

۱۴؎ ثمود چٹانوں کو تراش کر گھر بنا لیتے تھے۔ اس فن تعمیر میں انہیں بڑی مہارت تھی اور اس میں ان کا انہاک شوقِ تعمیر کو پورا کرنے کے لئے تھا۔ اس طرح انہوں نے تعمیرات کے میدان میں شاندار ترقی کی تھی اور اس ترقی کے زیر اثر یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ دنیا میں ہر طرح سے محفوظ ہیں۔

۱۵؎ میخوں والا سے مراد لاؤ لشکر والا ہے۔ فرعون نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے مستقل فوج قائم کی تھی۔ جب کہ اُس زمانہ میں مستقل طور سے فوج رکھنے کا رواج نہ تھا، بلکہ جب جنگ کی ضرورت پیش آجاتی، وقتی طور سے اس کا انتظام کر لیا جاتا۔ فوج چونکہ خیموں میں رہتی تھی اور خیمہ میخیں ٹھونک کر قائم کیا جاتا ہے اس لئے اس مناسبت سے یہ الفاظ لاؤ لشکر والا کے معنیٰ میں کنایۃً استعمال ہوئے ہیں۔

۱۶؎ یعنی ان قوموں نے ایک شاندار تمدن کے وسائل اور اقتدار پا کر بہت غلط روش اختیار کی۔ خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے پروا ہو کر وہ گھمنڈ میں مبتلا ہو گئیں اور انہوں نے سرکشی کا رویّہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں ان میں ہر طرح کا بگاڑ پیدا ہوا۔

۱۷؎ یعنی جب یہ قومیں سرکشی اور بگاڑ کی راہ پر چل پڑیں اور پیغمبروں کی تنبیہات کے باوجود اصلاح کے لئے آمادہ نہیں ہوئیں تو اللہ تعالیٰ کا قانون تعذیب حرکت میں آیا۔ اور اس نے اس طرح ان کو گرفت میں لیا کہ ان کی ساری مادی ترقی اور ان کی ساری شان و شوکت مٹی میں مل گئی۔ نہ بلند عمارتیں انہیں ذلت کی موت مَرنے سے بچا سکیں اور نہ چٹانوں میں تراشے ہوئے مکانات ان کی حفاظت کر سکے۔ اسی طرح فرعون کا لاؤ لشکر اس کو سمندر میں غرق ہونے سے نہیں بچا سکا بلکہ وہ لشکر سمیت ڈوب مرا ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔ ؎

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے

ان قوموں پر جو عذاب آیا اس کی تفصیلات سورۂ اعراف، سورۂ یونس، سورۂ ہود، سورۂ حجر اور دیگر صورتوں میں بیان ہوئی ہیں۔

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾	۱۴ واقعی تمہارا رب گھات میں رہتا ہے۔۱۸
فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾	۱۵ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کی آزمائش اس طرح کرتا ہے کہ اس کو عزت و نعمت بخشتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی۔۱۹
وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾	۱۶ اور جب اس کی آزمائش اس طور سے کرتا ہے کہ اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے، تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا۔۲۰
كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾	۱۷ نہیں۔۲۱ بلکہ تم لوگ یتیموں کی قدر نہیں کرتے۔۲۲
وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾	۱۸ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب دیتے ہو۔۲۳
وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾	۱۹ اور میراث کا مال سمیٹ کر ہڑپ کر جاتے ہو۔۲۴
كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿۲۱﴾	۲۰ اور مال کی محبت میں مست رہتے ہو۔۲۵
وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾	۲۱ نہیں ۲۶ ! جب زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کر دی جائے گی۔۲۷
وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَىِٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿۲۳﴾	۲۲ اور تمہارا رب آئے گا صف در صف فرشتوں کے جلو میں۔۲۸
	۲۳ اور جہنم اس روز حاضر کر دی جائے گی۔۲۹ اس روز انسان ہوش میں آئے گا، مگر اس وقت اس کے ہوش میں آنے کا کیا فائدہ؟ ۳۰

۱۸؎ اوپر جن تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا وہ شہادت دیتے ہیں کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ اور انسان کا خالق اس کو پیدا کر کے اس سے بے تعلق نہیں ہوا ہے، بلکہ وہ ہر شخص اور ہر قوم کی نگرانی کر رہا ہے اور ان سب کی باگ اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ سرکش اور مفسد قوموں کو ڈھیل ضرور دیتا ہے تاکہ وہ سنبھلنا چاہیں تو سنبھلیں، لیکن یہ ڈھیل ایک وقت خاص تک کے لئے ہی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اچانک خدا کے عذاب کا کوڑا اُن پر برستا ہے اور وہ بُرے انجام سے دوچار ہو جاتی ہیں۔

تاریخ کی یہ شہادت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ دنیا کھیل تماشا نہیں، بلکہ ایک امتحان گاہ ہے، جس میں افراد کا بھی۔ امتحان ہو رہا ہے اور قوموں کا بھی۔ اور ان کا رب ان کے ساتھ عدل و حکمت کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے۔ اور وہ مجرموں کو سزا دینے پر پوری طرح قادر ہے۔ اور جب دنیا امتحان گاہ قرار پائی تو لازم آتا ہے کہ ایک روز جزا و سزا کا آئے۔ پس قرآن کا یہ دعویٰ کہ قیامت کا ظہور اور جزا و سزا کا وقوع ایک ناقابل انکار حقیقت ہے تاریخ کی شہادت سے بھی ثابت ہے۔

۱۹؎ یہاں انسان کا جو حال بیان کیا گیا ہے اس سے اس مغالطہ کو دور کرنا مقصود ہے، جس میں دنیا پرست لوگ مبتلا ہوتے ہیں۔ مال و دولت، جاہ و اقتدار اور مادی نعمتوں کا ملنا ان کے نزدیک معیار عزت ہے۔ اور جس کو مادی نعمتوں کی فراخی حاصل ہوتی ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ خدا کی نظر میں وہ اچھا ہے۔ اسی لئے وہ اس کی عزت افزائی کا سامان کر رہا ہے اور یہ خام خیالی اسے سرکشی پر آمادہ کرتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی یہ چیزیں عطا کرتا ہے آزمائش کے لئے عطا کرتا ہے کہ دیکھے وہ ان نعمتوں کو پا کر اپنے رب کا شکر گذار اور فرمانبردار بندہ بنتا ہے اور بندوں کے حقوق کو ادا کرتا ہے یا اس کا ناشکرا، مغرور اور بندوں کے حقوق کو ٹھکرانے والا بنتا ہے۔ رہی حقیقی عزت و سرفرازی تو وہ امتحان میں کامیابی کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

۲۰؎ دنیا پرستانہ نقطۂ نظر کو اختیار کرنے والوں کے نزدیک تنگ حال ہونا باعث ذلت ہے۔ گویا جن کو مال و دولت کی فراوانی نصیب نہیں ہوئی وہ اللہ کی نظر میں حقیر ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس حالت سے انسان کو اس لئے گذارتا ہے تاکہ اس کی آزمائش ہو کہ وہ اپنے کو صابر ثابت کر دکھاتا ہے یا نہیں؟ اور اپنے رب کے فیصلہ پر مطمئن ہوتا ہے یا اس کے خلاف شکوہ شکایت کرنے لگتا ہے؟ تنگ حالی انسان کے اندر حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرتی ہے اور اس کے کردار کو مضبوط بناتی ہے۔ اور انسان اس مرحلہ سے گذر کر عزت و سرفرازی کا مقام حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دے۔ خدا کی یہ عظیم حکمت ہے جو تنگ حالی کے پیچھے کارفرما ہوتی ہے لیکن سطح بیں نگاہیں اس کو نہیں پاتیں اور مغالطہ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس آیت نے صراحت کے ساتھ مغالطہ کو دور کرنے کا سامان کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر انسان اس مغالطہ میں رہتا ہے تو اس کے لئے اس امتحان میں ناکامی مقدر ہے۔

۲۱؎ یعنی عزت و ذلت کا یہ معیار صحیح نہیں جو دنیا پرستوں نے قائم کر رکھا ہے۔

۲۲؎ یہاں دنیا پرستوں، بالخصوص مالداروں کو براہ راست خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس

آزمائشی زندگی میں دولت پا کر تم بندگان خدا کے حقوق ادا کرتے، بے سہارا بچوں اور محتاجوں کی مدد کرتے لیکن تمہارے اندر دولت کا ایسا گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ یتیموں کی مدد کرتے ان کی ناقدری کرنے لگتے ہو اور ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ قرآن یتیموں کی نہ صرف مدد کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ ان کی قدر کرنے کا بھی۔ بالفاظ دیگر قرآن غریب اور کمزور طبقہ کو سماج میں عزت کا مقام دلوانا چاہتا ہے اور ایک صحیح مسلم سوسائٹی وہ ہے جس میں ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

۲۳؎ غریبوں کو کھانا کھلانا اور اس کی ایک دوسرے کو ترغیب دینا بنیادی اخلاقیات میں سے ہے، جس کی ذمہ داری انسان پر فطرۃً عائد ہوتی ہے۔ شریعت نے اس کو مزید مؤکد کر دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں تفصیلی احکام بھی دیئے ہیں۔

یہاں قرآن نے جاہلیت کے اس سماج پر سخت گرفت کی ہے، جس میں لوگ نہ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی فکر کرتے اور نہ دوسروں کے اندر جذبۂ خیر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ اس سے واضح ہے کہ قرآن انسانی سوسائٹی کو، جس وصف کا حامل دیکھنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے افراد خود بھی غریبوں کی مدد کریں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں۔ اس طرز عمل سے بخیلی اور زر پرستی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اور ہمدردی اور فیاضی کے جذبات پرورش پانے لگتے ہیں۔ فقر و فاقہ کے خاتمہ کے لئے یہ وصف بمنزلہ بنیاد کے ہے۔

۲۴؎ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں اور بچوں کو وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا اور زور آور مرد میراث پر قابض ہو جاتے تھے، جس کے نتیجہ میں یتیم بچے اور بچیاں تک اپنے باپ کے ترکہ میں حصہ پانے سے محروم رہ جاتیں۔ اس آیت میں اہل جاہلیت کے اسی رویہ کو باطل اور مذموم قرار دیا گیا ہے۔ (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ نساء نوٹ ۱۹؎)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وراثت کی تقسیم کا قرآنی ضابطہ تو مدینہ میں اواخر ۳ھ میں نازل ہوا جو سورۂ نساء میں شامل ہے، جب کہ سورۂ فجر مکی ہے جس میں میراث کا مال سمیٹ کر کھانے کی مذمت کی گئی ہے، تو پھر یہ گرفت میراث کے کس حکم کی خلاف ورزی کرنے پر کی گئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وراثت کا قرآنی ضابطہ گو بعد میں نازل ہوا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک یہ ضابطہ نازل نہیں ہوا تھا، اس وقت تک یہ لوگ سرے سے جانتے ہی نہیں تھے کہ وراثت کا حقدار کون ہے۔ کم از کم یہ بات تو بدیہی ہے کہ باپ کی میراث کی حقدار اس کی اولاد ہے اور خاص طور سے جب وہ یتیم ہو تو اس کے حق کی حرمت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اتنی موٹی بات سمجھنے کے لئے عقل عام کافی ہے۔ اور عقل و انصاف کے اس صریح تقاضے کو رد کر کے زور آور رشتہ داروں کا میراث پر قابض ہو جانا قابل مواخذہ کیوں نہ ہوگا؟ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مکہ کے عرب شریعت الٰہی سے بالکل نا آشنا نہیں تھے، بلکہ وہ ابراہیمی شریعت کے وارث تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے کچھ اجزاء ہی ان کے پاس باقی رہ گئے تھے۔ مثلاً حج کے مناسک وغیرہ۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ میراث کے سلسلہ میں اتنی بات بھی نہیں جانتے تھے کہ اولاد باپ کی میراث کی حقدار ہے۔ مگر یتیم بچوں اور بچیوں کو ان کے باپ کی میراث سے محروم رکھ کر ان کا چچا پوری میراث پر

قابض ہو جاتا تھا۔ آخر اس صریح حق تلفی کے لئے کیا وجہِ جواز تھی؟ اور جہاں تک تورات کا تعلق ہے اس میں میراث کا ضابطہ موجود تھا۔ بائبل میں ہے'' اور بنی اسرائیل سے کہہ کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کا کوئی بیٹا نہ ہو تو اس کی میراث اس کی بیٹی کو دینا ۔ اگر اس کی کوئی بیٹی بھی نہ ہو تو اس کے بھائیوں کو اس کی میراث دینا۔'' اگر اس کی کوئی بیٹی بھی نہ ہو تو اس کے بھائیوں کو اس کی میراث دینا۔'' (گنتی ۲۷: ۸، ۹)

۲۵ یہ چوٹ ہے ان کی زر پرستی پر جس نے ان کے اندر اخلاقی گراوٹ پیدا کی تھی۔

مال و دولت کو جہاں اللہ تعالیٰ نے معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، وہاں اس میں انسان کا بہت بڑا امتحان بھی رکھا ہے۔ یہ امتحان ایک تو اس پہلو سے ہے کہ انسان آخرت کو مقصود بناتا ہے یا دنیوی مال و دولت کو؟ دوسرے اس پہلو سے کہ مال جائز طریقہ سے حاصل کر کے جائز راہوں میں صرف کرتا ہے یا ناجائز طریقہ سے حاصل کر کے ناجائز راہوں میں صرف کرتا ہے ؟ تیسرے اس پہلو سے کہ وہ اللہ کی خاطر مالی قربانیاں دیتا اور بندگان خدا کے حقوق ادا کرتا ہے یا بخل سے کام لیتا ہے اور بندگان خدا کے حقوق غصب کرتا ہے؟

۲۶ یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ تمہارے اس طرزِ عمل پر گرفت نہیں ہوگی۔

۲۷ قیامت کے دن جو زلزلہ آئے گا اور جو دھماکے ہونگے وہ پوری زمین کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیں گے۔ عمارتیں اور محلات تو کیا پہاڑ تک ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور زمین ایک صاف میدان کی شکل اختیار کرے گی، جس میں تمام انسانوں کو خدا کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ہوگا۔

۲۸ یعنی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن خود عدالت برپا کرے گا اور وہ بنفس نفیس باز پرس بھی کرے گا۔ اور فیصلہ بھی فرمائے گا۔ اور اس کے حکم کی تعمیل اور اس کے فیصلہ کے نفاذ کے لئے فرشتے موجود ہوں گے۔

اس سے عدالت خداوندی کی پر ہیبت تصویر سامنے آتی ہے۔ اور یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ پس پردہ انسان کا امتحان لے رہا ہے، لیکن قیامت کے دن یہ پردہ اٹھا دیا جائے گا اور حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آجائے گی۔

۲۹ یعنی جب عدالت خداوندی برپا ہوگی تو جہنم بالکل سامنے موجود ہوگی۔

۳۰ یعنی عدالت خداوندی میں اپنے کو محصور اور جہنم کو سامنے موجود پا کر انسان کو ہوش آئے گا، کہ آخرت سے بے پروا ہو کر وہ کتنے زبردست گھاٹے میں پڑا ہے۔ اس وقت اسے یاد آئے گا کہ اللہ کے پیغمبروں کا اس دن سے متنبہ کرنا بالکل بجا تھا۔ اور جو راستہ وہ بتاتے تھے وہی صحیح تھا۔ ان کی نصیحت کو نہ مان کر اس نے بڑی حماقت کی۔ مگر اس روز ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا اسلئے کہ امتحان کا وقت گذر چکا ہوگا۔ قیامت کے دن تو ظہور نتائج کا دن ہوگا۔ اس دن ہوش میں آنا اور نصیحت پکڑنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی طالب علم امتحان گاہ میں تو پرچہ حل کرنے کے بجائے ہنسی دل لگی میں وقت گذار دے۔ اور جب نتیجہ کا اعلان ہو اور وہ ناکام ہو جائے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ ظاہر ہے بعد از وقت اس کا احساس اس کی ناکامی کو کامیابی میں تبدیل نہیں کر سکتا، البتہ اس کو یاس اور حسرت کے حوالہ ضرور کر دیتا ہے۔

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿۲۴﴾	۲۴ وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی زندگی کے لئے پہلے سے کچھ کر رکھا ہوتا! ۳۱
فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۵﴾	۲۵ اس دن اس کے عذاب جیسا کوئی عذاب دینے والا نہ ہوگا۔ ۳۲
وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿۲۶﴾	۲۶ اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھنے والا ہوگا۔
يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿۲۷﴾	۲۷ اے نفس مطمئنہ! ۳۳
ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿۲۸﴾	۲۸ چل اپنے رب کی طرف، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ ۳۴
فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿۲۹﴾	۲۹ شامل ہو جا میرے بندوں میں۔ ۳۵
وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿۳۰﴾	۳۰ اور داخل ہو جا میری جنت میں ۔ ۳۶

۳۱؎ یعنی اس روز انسان محسوس کرے گا کہ حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ اور میں دنیا کی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا رہا۔ کاش کہ میں نے اپنی اس زندگی کے لئے دنیا میں کچھ سامان کرلیا ہوتا!

۳۲؎ یعنی آخرت کی سزا کو ان سزاؤں پر قیاس نہ کرو جو دنیا کی حکومتیں مجرمین کو دیتی ہیں۔ اللہ کا عذاب ایسا شدید ہوگا کہ اس طرح کا عذاب نہ کبھی کسی نے دیا ہوگا اور نہ کوئی دے سکتا ہے۔

اس سے آگاہ کرنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے عذاب کی پرواہ نہ کریں اور مجرم اور سرکش بنے رہیں، ان کو اس کے عذاب کا اندازہ اسی وقت ہوگا جب کہ وہ اس کا مزہ چکھیں گے۔

عذاب کی یہ شدت جرم کی شدت کی وجہ سے ہوگی۔ جو لوگ اپنے خالق و مالک اور فرمانروائے کائنات کے خلاف سرکشانہ رویہ اختیار کرتے ہیں، وہ زبردست ڈھٹائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس لئے وہ شدید ترین عذاب کے مستحق ہیں۔

۳۳؎ نفس مطمئنہ سے مراد وہ انسان ہے، جس نے اطمینان قلب کے ساتھ توحید کا اقرار کیا تھا، جس کو آخرت پر یقین تھا اور فراخی اور تنگی ہر طرح کے حالات میں وہ اپنے رب سے راضی و مطمئن رہا کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

جس شخص نے دنیا میں اطمینان قلب کی یہ صفت پیدا کرلی، وہ خدا کے ہاں اس کا مستحق ہوگا کہ اسے ہمیشہ کے لئے چین اور راحت و سکون نصیب ہو۔

۳۴؎ یہ بڑے پیارے اور رحمت بھرے الفاظ ہیں، جن میں نفس مطمئنہ کو فیصلہ کے دن کامیابی کا مژدۂ جاں فزا سنایا جائے گا۔ اور کامیابی بھی ایسی کہ آدمی خدا کو پالے، جس کے بعد پانے کے لئے کیا چیز باقی رہ جاتی ہے؟ بندہ اپنے خدا سے خوش اور خدا اپنے بندے سے خوش۔ عزت و سرفرازی کے اس مقام کو پہنچنے کے بعد کون سی بلندی باقی رہ جاتی ہے جہاں پہنچنے کا انسان تصور کرسکتا ہے؟

۳۵؎ ''میرے بندے'' سے مراد خدا کے نیک بندے ہیں۔ جنت کی سوسائٹی ان نیک بندوں ہی پر مشتمل ہوگی۔

نیک لوگوں کے زمرہ میں شمولیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہوگی، لیکن یہ نعمت ان ہی لوگوں کو میسر آئے گی جو واقعی اس کے قدرداں ہیں۔ جو نیک لوگوں سے ملنا پسند کرتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں نیک لوگوں سے نفرت کرتے اور ان سے دور بھاگتے رہے اور ان کی ساری دلچسپی خدا بیزار لوگوں سے رہی ان کا حشر بھی خدا بیزار لوگوں ہی کے ساتھ ہوگا۔

۳۶؎ جنت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے (میری جنت)۔ یہ نسبت جنت کے شرف کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے اور اس بات کی طرف بھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا مظہر ہوگی۔

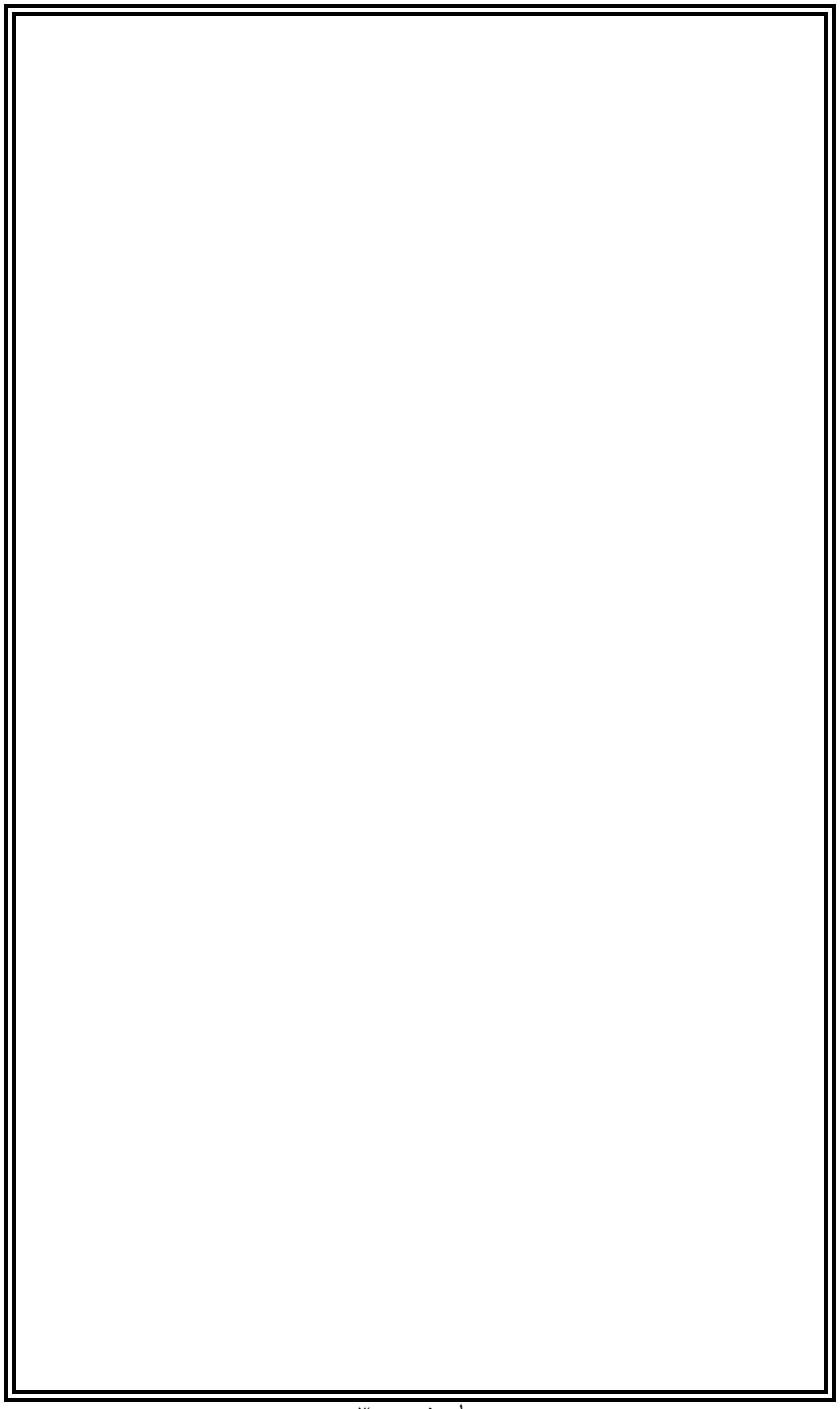

(۹۰) البلد

نام پہلی آیت میں البلد (شہر) کا لفظ آیا ہے، جس سے مراد شہر مکہ ہے۔ اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''البلد'' قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور کی تنزیل ہے۔

مرکزی مضمون یہ سورہ سابق سورہ کا تکملہ ہے، جس میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود رکھنے والی مخلوق ہے، جسے دارالامتحان میں کھڑا کر دیا گیا ہے، لہٰذا اس کا یہ سمجھنا کہ میں من مانی کرنے کے لئے آزاد ہوں اور مجھے خدا کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہونا نہیں ہے۔ وہ بنیادی غلطی ہے جو انسان کے پورے رویہ کو غلط بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے بعد نہ اس میں فرض شناسی پیدا ہوتی ہے اور نہ حقوق کی ادائیگی کا احساس اُبھرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ انسان جہنم کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۴ میں جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں ان سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ یہ دنیا عشرت کدہ نہیں ہے۔ اور نہ انسان کو یہاں عیش و عشرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے، بلکہ اس کی تخلیق ایک خاص مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ اس لئے اسے پیدا ہی مشقت کی حالت میں کیا گیا ہے۔

آیت ۵ تا ۷ میں انسان کے غیر ذمہ دارانہ طرز عمل پر گرفت کرتے ہوئے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ کیا وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے، جو اس کے طرز عمل کی نگرانی کرنے والی ہو؟

آیت ۸ تا ۱۷ میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے اخلاق و عمل کی بلندی کی راہ بھی کھول دی گئی ہے اور پستی کی راہ بھی۔ بلندی کی راہ کٹھن ضرور ہے مگر اس چڑھائی پر چڑھ کر آدمی اخلاقی ارتقاء کی منزلیں طے کر لیتا ہے اور بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

آیت ۱۸ تا ۲۰ میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کے ساتھ اخلاقی بلندی کی راہ اختیار کرنے کا انجام یہ ہے کہ آدمی خوش بختی اور سعادت کی منزل کو پہنچ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے کفر کی راہ اختیار کرنے والے جہنم کے گڑھے میں جا گرتے ہیں، جس سے نکلنے کی پھر کوئی صورت نہ ہوگی۔

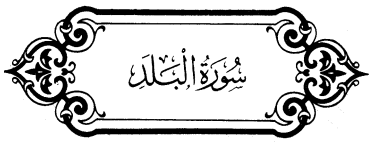

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۱﴾

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۙ﴿۲﴾

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ؕ﴿۴﴾

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ؕ﴿۶﴾

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ ۘ﴿۷﴾

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ﴿۸﴾

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۙ﴿۹﴾

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۚ﴿۱۰﴾

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۖ﴿۱۱﴾

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ؕ﴿۱۲﴾

فَكُّ رَقَبَةٍ ۙ﴿۱۳﴾

(۹۰) سُورۃُ البلد

آیات ۲۰

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ نہیں! ۱ میں قسم کھاتا ہوں ۲ اس شہر کی۔ ۳

۲ اور تم اس کے رہنے والے ہو۔ ۴

۳ اور جننے والے کی ۵ اور اس کی جسے اس نے جنا۔ ۶

۴ فی الواقع ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے۔ ۷

۵ کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا؟ ۸

۶ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ ۹

۷ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس کو کسی نے دیکھا نہیں ! ۱۰

۸ کیا ہم نے اس کو نہیں دیں دو آنکھیں؟ ۱۱

۹ اور زبان اور دو ہونٹ ؟ ۱۲

۱۰ اور اسے دونوں راستے نہیں دکھائے؟ ۱۳

۱۱ مگر اس نے گھاٹی عبور نہیں کی۔ ۱۴

۱۲ اور تم نے کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ ۱۵

۱۳ گردن چھڑانا ۔ ۱۶

۱؎ یعنی تمہارا یہ خیال صحیح نہیں کہ دنیا کی زندگی مزے اڑانے کے لئے ہے۔ یہاں نہ کوئی آزمائش ہو رہی ہے اور نہ کبھی جزا و سزا سے سابقہ پیش آئے گا۔

۲؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ۔ ۱۴؎

۳؎ اس شہر سے مراد مکہ ہے جہاں یہ سورہ نازل ہوئی۔

۴؎ خطاب اہل مکہ سے ہے جو اس سورہ کے اولین مخاطب تھے۔ ضمیر مخاطب واحد (اَنْتَ) استعمال ہوئی ہے۔ کیوں کہ یہاں مخاطب مکہ کا ہر فرد ہے۔ گویا مکہ کے رہنے والوں کو فرداً فرداً دعوت فکر دی گئی ہے۔

۵؎ مراد ماں ہے جو بچہ کو تکلیف سے جنتی ہے۔

والد کا لفظ مذکر استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ لفظ جس طرح باپ کے لئے بولا جاتا، اسی طرح ماں کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو لسان العرب لفظ وَلَدٌ) اس کی نظیر لفظ حامل ہے، جو حاملہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان مذکر الفاظ کا استعمال مؤنث کے لئے اس وقت کیا جاتا ہے جب کہ بات مبہم انداز سے کہنا ہو۔ اور مرد یا عورت کی صراحت بلاغت کی رو سے نامناسب ہو۔

موقع کلام کے لحاظ سے یہاں ماں مراد لینا ہی صحیح ہے، کیوں کہ بعد والی آیت میں انسان کے مشقت میں پیدا کئے جانے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے جننے کی مشقت ماں کو ہوتی ہے نہ کہ باپ کو۔

۶؎ مراد ہر وہ بچہ ہے جو ماں کے پیٹ سے جنم لیتا ہے۔ اور بچہ کا جنم لینا تکلیف کے ساتھ ہوتا ہے۔

۷؎ یہ وہ دعویٰ ہے، جس پر مذکورہ قسمیں بطور شہادت کے کھائی گئی ہیں۔ انسان کا مشقت کی حالت میں پیدا ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ اس حقیقت کی تائید میں چند باتوں کو پیش کر کے اسے مزید مؤکد کر دیا گیا ہے۔ مکہ کی سرزمین پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک بے آب و گیاہ وادی ہے۔ ریگستان ہونے کی وجہ سے یہاں کا موسم بڑا سخت ہوتا ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں یہاں کی زندگی عام طور سے جفاکشی کی زندگی تھی۔ مکہ کے اس قدرتی ماحول کی طرف قرآن نے اس کے باشندگان کی توجہ مبذول کرائی کہ تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ یہ ماحول پر مشقت کیوں بنایا گیا ہے؟ اگر یہ دنیا عشرت کدہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جو شہر ام القریٰ قرار پایا وہ مشقتوں سے گھرا ہوا ہوتا۔ تم نہ صرف یہ کہ اس کے ماحول کا مشاہدہ کرتے ہو، بلکہ اس کی تاریخ سے بھی خوب واقف ہو کہ کن دشواریوں سے گذر کر حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے بیت اللہ کی تعمیر کا تاریخی کارنامہ انجام دیا تھا۔ الغرض اس شہر کے جغرافیائی اور تاریخی حالات دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دنیا تفریح گاہ نہیں ہے، بلکہ محنت و مشقت کی جگہ ہے، اور اس میں انسان کا امتحان ہے۔ اس طرح انسان کی اپنی پیدائش بھی اس حقیقت کا ناقابل انکار ثبوت ہے۔ بچہ جب ماں کے پیٹ سے جنم لیتا ہے تو یہ مرحلہ ماں کے لئے کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے؟ اور جب وہ اس دنیا میں آتا ہے، تو مشقتوں سے گھرا ہوا، اور روتے ہوئے ہی آتا ہے، جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ انسان دنیا میں مزے اڑانے کیلئے نہیں آیا ہے۔ بلکہ تکلیف اور مشقت کو ساتھ لے کر آزمائش کی بھٹی سے گذرنے کے لئے آیا ہے، پس

انسان کے مشقت کی حالت میں پیدا ہونے کی حقیقت ایک دوسری بہت بڑی حقیقت کا پتہ دیتی ہے۔اور وہ ہے جزا و سزا کا معاملہ جس سے انسان کو لازماً سابقہ پیش آنا ہے۔کیوں کہ یہ زندگی جب ابتلاء و آزمائش کی زندگی ٹھہری تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ یوم حساب برپا ہو اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کے نتائج سامنے آئیں۔

یہ ہے وہ استدلال جو ان آیات میں مضمر ہے۔ساتھ ہی ایک اہم پہلو کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔اور وہ یہ ہے کہ مشقتوں اور تکلیفوں میں انسان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔شہر مکہ کو جس شخص نے بسایا اسے کیسی کیسی مشقتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اور اس کی زندگی کس قدر صبر آزما رہی۔لیکن ان حالات سے گذر کر ہی اس کے ہاتھوں خانۂ کعبہ کی تعمیر کا عظیم اور تاریخی کارنامہ انجام پا سکا۔اور اس کے بعد ہی وہ امامت کے منصب پر فائز ہوا۔معلوم ہوا کہ اس دنیا میں جو تکلیفیں اور مشقتیں انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ درحقیقت انسان کو تکلیف میں ڈالنے کے لئے نہیں، بلکہ اس کو اوپر اٹھانے کے لئے ہیں۔انسان اگر اپنا حوصلہ پست نہ رکھے اور خدائی رہنمائی کو قبول کر کے پیش آمدہ تکلیفوں میں فرض شناسی کا ثبوت دے،تو اس کے اندر انسانیت کا جو جوہر ہے وہ کھلنے لگتا ہے اور وہ بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ ؎

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد آدمی بنتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی تعمیر کے لئے کسی ایسے خطہ کا انتخاب نہیں فرمایا جہاں باغ و بہار ہو، بلکہ پہاڑوں سے گھری ہوئی ریگستانی زمین کا انتخاب فرمایا۔اس انتخاب کے پیچھے یہ عظیم حکمت کارفرما ہے کہ اس کے گھر کی زیارت کرنے والوں کے لئے باطنی کشش کا۔سامان ہو نہ کہ ظاہری کشش کا۔اور اس سے انسان کو یہ رہنمائی ملے کہ خدا تک پہنچنے کی راہ آسائشوں سے ہو کر نہیں بلکہ دشواری اور کٹھنائیوں سے ہو کر گذرتی ہے۔

اس واضح حقیقت کے بعد اور ان روشن دلائل کی موجودگی میں انسان تکلیف پہنچنے پر کیوں بلبلا اٹھتا ہے؟ اور پست ہمتی کا کیوں شکار ہو جاتا ہے؟اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور اس دنیا کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اختیار نہیں کرتا۔وہ دنیا کو آرام گاہ خیال کرتا ہے اور اس سے آسائش ہی کی امیدیں رکھتا ہے۔لیکن جب اس کے ان جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے اور تکلیف اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے۔اور پھر فرض شناسی کا ثبوت دینے اور حوصلے کے کام کرنے سے قاصر رہتا ہے۔اس طرح انسان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے اور امتحان میں ناکام ہو جانے کی بنا پر وہ سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۸ یعنی انسان جو مشقتوں میں گھرا ہوا پیدا ہوتا ہے۔اور اس کے بعد اسے زندگی کی پُر خطر راہوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ معلوم نہیں کس وقت اُسے کس حادثہ سے دوچار ہونا پڑے اور کس مصیبت کا اس پر نزول ہو؟ وہ اس غرور نفس میں کس طرح مبتلا ہو جاتا ہے کہ کوئی بالاتر طاقت اس کو پکڑنے والی نہیں ہے۔اور وہ جو چاہے کرے اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا؟ انسان کا مشقت سے گھرا ہونا تو اس کی اپنی بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس پر ایک بالاتر ہستی کا اقتدار قائم ہے جس کے فیصلے اس پر نافذ ہو کر رہتے ہیں۔

۹؎ یہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ دنیا کو تفریح گاہ خیال کرنے کے نتیجہ میں انسان کا رویہ کتنا غیر ذمہ دارانہ ہو کر رہ جاتا ہے؟ یہ مثال ان مالداروں کی ہے جو دولت کو بے جا خرچ کرتے ہیں اور پھر اپنے ان نمائشی اخراجات پر فخر کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مال اس لئے عطا کیا تھا کہ وہ اس کو جائز اور خیر کی راہوں میں خرچ کرتے، اپنی جائز ضرورتیں بھی پوری کرتے اور بندگان خدا کے حقوق بھی ادا کرتے۔ مگر انہوں نے اسے نمائشی اور مسرفانہ اخراجات کا ذریعہ بنالیا اس طرح امتحان کے اس اہم پرچے کو حل کرنے میں وہ بُری طرح ناکام رہے۔

مال کو اڑانا، خواہ وہ مشرکانہ مراسم ادا کرنے کے لئے ہو، خواہ جاہلی رسومات کو پورا کرنے کے لئے، دعوتوں اور تقریبات کی شان بڑھانے کے لئے یا آرٹ اور فن کے نام پر نمائشی یادگاریں تعمیر کرنے کے لئے، نام ونمود حاصل کرنے کے لئے ہو یا شان وشوکت کے اظہار کے لئے، نہ صرف کھلے گناہ کا کام ہے۔ بلکہ اس سے غریبوں اور محتاجوں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے۔

۱۰؎ یعنی کیا فضول خرچی کر کے اس پر فخر کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ کوئی طاقت اس کی نگرانی نہیں کر رہی ہے؟ اور اس کو دولت اس لئے ملی ہے کہ وہ گل چھرے اڑائے یا اپنے لئے عیش پرستی کا سامان کرے؟ اگر ایسا ہے تو یہ سب سے بڑی حماقت ہے۔ خدا تو انسان کی ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور جب دیکھ رہا ہے تو باز پرس بھی کرے گا۔

۱۱؎ یعنی خدا نے اسے دیکھنے کی صلاحیت بخشی تھی تاکہ وہ کائنات کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ ابھری ہوئی حقیقت کا مشاہدہ کرے۔ مگر اس نے اسی کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سب کچھ دیکھتا رہا مگر اسے ایک قدیر ہستی کا ہاتھ کہیں نظر نہیں آیا۔

۱۲؎ اللہ تعالیٰ نے زبان اور دو ہونٹ دے کر انسان کو گویائی کی صلاحیت بخشی ہے۔ اور یہ صلاحیت اس لئے بخشی ہے تاکہ وہ اپنے رب کے گن گائے اور حق وانصاف کی باتیں کرے، مگر انسان کا حال عجیب ہے۔ اس نعمت کو پالینے کے باوجود اس میں شکر کا جذبہ نہیں اُبھرتا۔ وہ باتیں خوب بناتا ہے مگر اس کی زبان نہیں کھلتی تو اپنے رب کے گن گانے کے لئے۔ اور وہ لفاظی سے خوب کام لیتا ہے مگر حق وانصاف کے لئے اس کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔

۱۳؎ یعنی بھلائی اور برائی، نیکی اور بدی اور خیر اور شر کے دونوں راستے اسے دکھادئے۔ یہ فطرت کی رہنمائی ہے، جو انسان کو عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ بھلائی اور برائی میں انسان فطرۃً تمیز کرتا ہے۔ (مزید تشریح سورۂ الشمس میں آرہی ہے۔ انشاءاللہ)

خیر وشر کی دونوں راہیں اس لئے دکھائیں تاکہ انسان اپنی ذمہ داری پر جس راستہ کو چاہے اختیار کر لے۔

۱۴؎ متن میں لفظ ''عقبۃ'' استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ گھاٹی کے ہیں۔ یعنی وہ دشوار گذار راستہ جو پہاڑوں کے درمیان سے گذرتا ہے اور جس کو طے کرنے کیلئے آدمی کو چڑھائی چڑھنا پڑتی ہے۔ یہاں اس سے مراد نیکی کا راستہ، جو دشوار گذار اور مشقت طلب ہے۔ لیکن یہ چڑھائی چڑھ کر آدمی بلندی پر پہنچ جاتا ہے۔

نیکی کے کاموں میں چونکہ لذت محسوس نہیں ہوتی، اور خواہشات کے علی الرغم یہ کام انجام دینا پڑتا ہے، اس لئے

باقی صفحہ ۱۳۰؎ پر

اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾	۱۴ یا فاقہ کے دن کھانا کھلانا۔ ۱۷
یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾	۱۵ قرابت دار یتیم کو۔ ۱۸
اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾	۱۶ یا خاک نشین مسکین کو۔ ۱۹
ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾	۱۷ پھر وہ شامل ہوتا ان لوگوں میں جو ایمان لائے۔ ۲۰ اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور ہمدردی کی تلقین کی۔ ۲۱
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ﴿۱۸﴾	۱۸ یہی لوگ ہیں سعادت مند۔ ۲۲
وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾	۱۹ اور جنہوں نے ہماری آیت کا انکار کیا وہ بد بخت لوگ ہیں۔
عَلَیْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾	۲۰ ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی جس کو بند کر دیا جائے گا۔ ۲۳

۱۷؎ محتاجوں کو کھانا کھلانا ہر حال میں نیکی کا کام ہے۔ لیکن بھوک کی حالت میں اور قحط کے زمانہ میں اس کی ضرورت اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

۱۸؎ ہر یتیم مدد کا مستحق ہے لیکن اگر وہ قرابت دار ہو تو اور زیادہ مدد کا مستحق ہو جاتا ہے۔

۱۹؎ مسکین بھی ہر حال میں مدد کا مستحق ہے۔ لیکن جب اسے غربت نے خاک آلود کر دیا ہو یا افلاس اور بدحالی نے اسے زمین پر پڑے رہنے (اور موجودہ زمانہ میں یوں کہئے کہ فٹ پاتھ پر گذر بسر کرنے) کے لئے مجبور کر دیا ہو تو وہ اور زیادہ مدد کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ان آیتوں میں نیکی کے کاموں کی چند مثالیں بیان کی گئیں ہیں۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ مال کا صحیح اور بہترین مصرف یہ ہے۔ اور اس قسم کے کام کر کے ہی آدمی اخلاق و کردار کی بلندی کی طرف جا سکتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو شہرت کی خاطر فضول خرچی کرتے ہیں تو ان کے حصہ میں سوائے محرومی کے کچھ نہیں آتا۔

۲۰؎ یعنی ان نیک کاموں کو انجام دینے کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ آدمی ایمان لا کر زمرۂ مومنین میں شامل ہو۔ کیوں کہ ایمان کے بغیر کوئی نیکی بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہیں ہوگی۔ قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی اس کی صراحت کی ہے۔ اور ایمان معتبر نہیں ہے جب تک کہ آدمی قرآن اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان نہ لے آئے۔

۲۱؎ یہاں اہل ایمان کی دو اہم صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں، اور دوسری یہ کہ ایک دوسرے کو ہمدردی کی نصیحت کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مومن کا اپنے طور سے صبر کرنا اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنا کافی نہیں۔ بلکہ ضروری ہے کہ ان دونوں باتوں کی دوسروں کو تلقین کی جائے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اہل ایمان کو باہم مربوط اور ایک دوسرے کا ہمدرد اور بہی خواہ ہونا چاہئے۔ اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اہل ایمان کے زمرہ میں شامل ہو جانے کے بعد ان پر معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داریاں بھی عائد ہو گئی ہیں۔

۲۲؎ یعنی یہ کامیاب و بامراد ہونے والے لوگ ہیں۔ کیوں کہ یہ امتحان میں پورے اترے اور انہوں نے وہ صفات اپنے اندر پیدا کر لیں جو کامیابی کی ضمانت تھیں۔ یہ سعید روحیں ہیں جو ابدی سعادت سے بہرہ مند ہوں گی۔

۲۳؎ یعنی ان کو آگ میں ڈالنے کے بعد اوپر سے دروازے بند کر دئے جائیں گے۔ اور وہ آگ میں اس طرح گھرے رہیں گے کہ اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ پا سکیں گے۔

صفحہ نمبر ۱۲۷ سے آگے

وہ نفس پر شاق گذرتے ہیں۔ بخلاف اس کے بدی اور گناہ کے کام لذت بخش ہوتے ہیں اور خواہشات بھی ان پر اُبھارتی ہیں۔ اس لئے نفس اس کی طرف آسانی سے چل پڑتا ہے۔ اس حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَ حُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ ۔'' جہنم خواہشات نفس سے ڈھانپ دی گئی ہے اور جنت ایسی باتوں سے جو نفس کو ناگوار ہیں۔'' (بخاری کتاب الرقاق)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اس کو تمثیلی انداز میں بیان فرمایا ہے چنانچہ انجیل متی میں ہے: '' تنگ دروازہ سے داخل ہو۔ کیونکہ وہ دروازہ چوڑا ہے اور وہ راستہ کشادہ ہے جو ہلاکت کو پہنچتا ہے۔ اور اس سے داخل ہونے والے بہت ہیں۔ کیوں کہ وہ دروازہ تنگ ہے اور وہ راستہ سکڑا ہے۔ جو زندگی کو پہنچتا ہے اور اس کے پانے والے تھوڑے ہیں۔'' (متی ۷: ۱۳، ۱۴)

۱۵ یہ سوال گھاٹی کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اچھی طرح سمجھ لو۔ نیکی کی راہ کٹھن راہ ہے، جس سے گذرے بغیر آدمی کامیابی کی منزل کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس راہ میں مال کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں نے مال کو عیش پرستی کا ذریعہ بنایا ہو وہ اس راہ میں کیا قدم رکھ سکیں گے۔

۱۶ یعنی غلام کو آزاد کرنا یا اس کو آزاد کرانے میں مالی تعاون کرنا۔ اس سورہ میں جو ایک مکی سورہ ہے اور ابتدائی دور کی نازل شدہ ہے، غلاموں کو آزاد کرنے کی اس حد تک تاکید، کہ نیکی کے دشوار گذار راستہ کی پہلی سیڑھی ہی یہ عمل قرار پائے، نہ صرف اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے، بلکہ اس سے غلامی کے مسئلہ میں قرآن کا اصل نقطۂ نظر بھی نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ جب غلام کو آزاد کرنا سب سے بڑی نیکی قرار پائی تو کسی آزاد کو غلام بنانے کے لئے اسلام میں کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص سے سخت باز پرس کرے گا، جس نے کسی آزاد کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی (رَجُلٌ بَاعَ حُرّاً ثُمَّ اَكَلَ ثَمَنَهُ۔ بخاری)

(مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ نساء نوٹ ۶۴)

(۹۱) الشمس

نام پہلی آیت میں الشَّمس (سورج) کی قسم کھائی گئی ہے ۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام الشّمس ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی جب کہ نبی ﷺ کی تکذیب اور آپ ﷺ کی مخالفت کا آغاز ہو چکا تھا۔

مرکزی مضمون انسان کو سرکشی کے انجام بد سے آگاہ کرنا ہے۔اور اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور اس کی صحیح نشو ونما کامیابی کی ضمانت ہے۔بخلاف اس کے نفس کو برائیوں سے آلودہ کرنا ناکامی و نامرادی کا موجب ہے۔کیونکہ برائیاں سرکشی پر آمادہ کرتی ہیں اور سرکشی کا انجام ہلاکت ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۱۰ میں آفتاب و ماہتاب،شب و روز اور زمین و آسمان کی ان عظیم نشانیوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، جو اس کائنات کے خالق کے کمال قدرت و حکمت پر دلالت کرتی ہیں۔مزید برآں نفسِ انسانی کی شہادت کو جزا و سزا کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۱۱ تا ۱۵ میں تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے۔اس سلسلہ میں قومِ ثمود کا واقعہ مختصراً بیان کیا گیا ہے۔تاکہ ان کی سرکشی کا جو انجام ہوا اس سے لوگ عبرت حاصل کریں اور قرآن اور پیغمبر اسلام کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کرنے سے باز رہیں۔

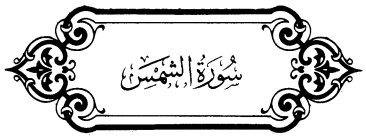

سُوْرَةُ الشَّمْسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ وَضُحٰىهَا ۝١

وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝٢

وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝٣

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝٤

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝٥

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝٦

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝٧

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝٨

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝٩

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝١٠

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝١١

اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝١٢

(۹۱) سُورۃُالشمس

آیات ۱۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے ۱ سورج اور اس کی روشنی کی۔ ۲

۲ اور چاند کی جب کہ اس کے پیچھے آئے ۔ ۳

۳ اور دن کی جب اسے بے نقاب کرے ۔ ۴

۴ اور رات کی جب اس کو ڈھانک لے۔ ۵

۵ اور آسمان کی اور اس ہستی کی، جس نے اسے بنایا۔ ۶

۶ اور زمین کی اور اس ہستی کی، جس نے اسے بچھایا۔

۷ اور نفس کی اور اس ہستی کی، جس نے اسے درست بنایا۔ ۷

۸ پھر اس کی بدی اور پرہیزگاری اس پر الہام کردی۔ ۸

۹ یقیناً کامیاب ہوا وہ، جس نے اس کا تزکیہ کیا۔ ۹

۱۰ اور نامراد ہوا وہ، جس نے اس کو آلودہ کیا۔ ۱۰

۱۱ ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے جھٹلایا ۔ ۱۱

۱۲ جب انکا سب سے بڑا بدبخت اٹھ کھڑا ہوا۔ ۱۲

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے دیکھئے سورۂ تکویر نوٹ۔ ۱۴؎

۲؎ یعنی جب سورج طلوع ہوتا ہے تو چار دانگ عالم میں روشنی پھیل جاتی ہے۔اور جوں جوں سورج چڑھنے لگتا ہے اس کی تمازت بڑھنے لگتی ہے۔ یہ کیفیت اس بات کی روشن دلیل ہے کہ سورج کی باگ ڈور اس کے خالق کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے مقرر کردہ وقت ہی پر طلوع ہوتا اور اوپر چڑھتا ہے۔

۳؎ یعنی اگر سورج کی ضیاء پاشیاں دن میں ہوتی ہیں تو چاند کی جلوہ افرینیاں رات میں۔سورج دن کا بادشاہ ہے تو چاند، رات کی ملکہ۔ چنانچہ وہ اپنی بزم رات ہی میں سجاتا ہے۔اس حقیقت کے پیش نظر چاند کو سورج کے پیچھے آنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر اس لحاظ سے بھی صحیح ہے کہ چاند سورج ہی سے روشنی حاصل کرتا ہے۔اس طرح چاند کا سورج کے تابع ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سورج کی طرح چاند کی باگ ڈور بھی اس کے خالق ہی کے ہاتھ میں ہے۔

۴؎ سورج کی ساری چمک دمک دن کے اوقات میں ہوتی ہے۔گویا وہ دن ہی ہے جو سورج کو بے نقاب کرتا ہے۔اور سورج کی مجال نہیں کہ وہ وقت سے پہلے نمودار ہو۔

گو سورج کا طلوع زمین کی گردش کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔لیکن یہاں صورت واقعہ کا جغرافیائی یا فلکیاتی پہلو زیر بحث لانا مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود اس اہم حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ جو کیفیات دنیا پر طاری ہوتی ہیں وہ ایک باقاعدہ نظام کے تحت ظہور میں آتی ہیں۔قدرت کے اس نظام میں ہر چیز حتیٰ کہ سورج بھی جس سے یہ دنیا چمک اٹھتی ہے، ایسی جکڑی ہوئی ہے کہ کسی کے لئے سرِ مو انحراف کی گنجائش نہیں، ورنہ عالم کا سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

۵؎ زمین کے جس حصہ پر رات طاری ہوتی ہے وہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا رات نے آ کر سورج کو ڈھانک لیا ہے یہ اندازِ بیان مشاہدہ کے اعتبار سے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں کہنے کا منشاء یہ ہے کہ دنیا کے جس حصہ پر رات طاری ہو جاتی ہے وہاں سورج نمودار نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر وہ رات کے وقت اپنا چہرہ چھپانے کے لئے مجبور ہے۔اور اس کی یہ مجبوری اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس قانون کی پابندی سے سرِ مو تجاوز نہیں کر سکتا۔ جو اس کے خالق نے اس کے لئے مقرر کر رکھا ہے۔اس سے ضمناً نظریۂ الحاد کی بھی تردید ہوتی ہے اور مشرکانہ عقیدہ کی بھی۔ کیونکہ اگر سورج اتفاقی حادثہ پر وجود میں آ گیا ہوتا تو وہ ایک محکم نظام کا پابند نہیں ہو سکتا تھا اور اگر وہ دیوتا ہوتا تو قانون قدرت میں جکڑ کر نہیں رہتا، اور رات کے بس کی بات نہیں تھی کہ اس کے چہرہ کو چھپا لیتی بلکہ وہ اپنے زور پر رات کو بھی نمودار ہوتا۔مگر اس پورے نظام شمسی میں جو جکڑ بندیاں پائی جاتی ہیں وہ ''سوریہ دیوتا'' کے مشرکانہ تصور کی سراسر نفی کرتی ہیں۔

۶؎ آسمان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی عظیم الشان بناوٹ اور اس کی بلندی انسان کو اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس کی چوٹی بھی اس کے خالق ہی کے ہاتھ میں ہے۔

''اس ہستی کی قسم جس نے اسے بنایا'' سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ آسمان کا خالق ایک قادر مطلق ہستی ہے۔اور

اس کا وجود ایک ایسی حقیقت ہے جو شبہ سے بالاتر ہے۔ قسم جہاں شہادت کے مفہوم میں آتی ہے وہاں وہ کسی بات کے محقق، اور یقینی ہونے کے پہلو کو واضح کرنے کے لئے بھی آتی ہے۔ چنانچہ یہاں اور بعد کی دو آیتوں میں ''اس ہستی کی قسم'' جو کھائی گئی ہے وہ اسی مفہوم میں ہے یعنی یہ قسم بطور تاکید کے ہے۔

۷ نفس کو درست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس میں اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں۔ اسے پیدائشی گنہگار نہیں بنایا اور نہ اسے جبلی طور پر مفسد اور شر پسند بنایا کہ خدا سے سرکشی کرنے اور شیطانی خصلتیں اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ اس نے اسے صحیح الفطرت بنایا ہے اور اس کے باطن میں فساد کا کوئی عنصر نہیں رکھا کہ وہ راہِ راست کو اختیار کرنا چاہے اور نہ کر سکے اور گمراہی کو اختیار کرنے پر مجبور ہو۔ اس حقیقت کو قرآن نے دوسری جگہ کھول کر بیان فرمایا ہے:-

فِطرَةَ اللّٰهِ الَّتِیۡ فَطَرَالنَّاسَ عَلَیۡهَا (سورۂ روم ۳۰)

''اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا''

اور اس کی وضاحت نبی ﷺ نے حدیث میں اس طرح فرمائی ہے:

مامن مولودٍ الّا یولد علی الفطرة ۔ فاَبواه یهودانه وینصرانه ویشرکانِهِ (مسلم کتاب القدر)

''کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مشرک بنا دیتے ہیں''

۸ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کا شعور عطاء کیا ہے، جس کی بناء پر خیر و شر میں امتیاز کرتا ہے۔ اور یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کام اچھے ہیں اور وہ کام بُرے۔ چنانچہ انسان جھوٹ، ظلم و زیادتی اور بے حیائی کو فطرۃً برا سمجھتا ہے اور اس قسم کے اخلاق و اعمال سے نفرت کرتا ہے۔ اور سچائی، انصاف، انسانی ہمدردی اور شرم و حیا کی پاسداری کو اچھا سمجھتا ہے اور اس قسم کے اخلاق و اعمال کو پسند کرتا ہے۔ یہ شعور درحقیقت فطرت کی رہنمائی ہے۔ اور یہ رہنمائی اللہ تعالیٰ ہی نے ہر نفس کے اندر ودیعت فرمائی ہے، جسے یہاں الہام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ شعور انسان کے اپنے نفس کی شہادت ہے کہ وہ اخلاقی وجود رکھنے والی ذمہ دار مخلوق ہے۔ اور جب اس کی حیثیت یہ ہے تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں اپنے رب کے حضور جواب دہ قرار پائے اور اس کے عمل کے نتائج اس کے سامنے آئیں۔ نفس کی اس شہادت کو تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کی فطرت غلط، اس کا شعور باطل اور اس کا وجود عبث ہے لیکن یہ بات کوئی شخص بھی کہنے کے لئے تیار نہیں ہے مگر کروڑہا انسان پھر بھی اپنے نفس کی شہادت کے خلاف زندگی گذارتے ہیں اور اس خام خیالی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ من مانی کرنے کے لئے آزاد ہیں اور اس کے نتائج کا کبھی انہیں سامنا کرنا نہیں پڑے گا۔

واضح رہے کہ بدکرداری اور پرہیز گاری کا یہ الہام ایک درجہ میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی ہے۔ رہی مکمل رہنمائی تو اس کا سامان اللہ تعالیٰ نے آسمانی ہدایت کے ذریعہ کیا ہے۔ یہ آسمانی ہدایت، جو اب قرآن کی شکل میں موجود ہے، اس فطری شعور کو جو انسان کے نفس میں ودیعت ہوا ہے پختہ کرتی ہے اور جلا بخشتی ہے۔ اور یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح

ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں تک آسمانی ہدایت نہ پہنچی ہو وہ بھی اپنے فطری شعور کی حد تک اپنے اچھے اور برے اعمال کے ضرور ذمہ دار ہیں۔ اور اس سلسلہ میں انہیں بھی خدا کے حضور جوابدہی کرنا ہوگی۔

۹ متن میں لفظ زَکّٰھَا استعمال ہوا ہے جو تزکیہ سے ہے اور جس کے معنیٰ پاک کرنے اور نشوونما دینے کے ہیں۔ اوپر کی آیت میں نفس پر فجور اور تقویٰ کے الہام کئے جانے کا جو ذکر ہوا ہے اس سے تزکیۂ نفس کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے۔ یعنی نفس کو فجور (برائیوں) سے پاک کرنا اور تقویٰ (خدا خوفی اور پرہیزگاری کی باتوں) سے اس کو نشوونما دینا۔ بالفاظ دیگر اس کی اس طرح تربیت یا پرورش کرنا کہ اس میں خیر اُبھرے اور نیکیاں پروان چڑھیں۔

نفس کا حقیقی ارتقاء اور روح کی بالیدگی اسی وصف کے پیدا کرنے میں ہے۔ اس حقیقت کو اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک پودا اسی صورت میں نشوونما پاتا ہے جب کہ اسے سازگار ماحول مل جائے اور اس کی آبیاری کی جاتی رہے۔ ورنہ تیز ہوا کا ایک جھونکا ہی اس کو خاک میں ملا دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس سورہ میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس سے تزکیۂ نفس کا جو اہم ترین پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی سب سے پہلے اپنے آپ کو کفر اور سرکشی سے پاک کرلے اور ہدایت خداوندی کو قبول کر کے اپنے کو اطاعت کی راہ پر ڈال دے۔ یہ اطاعت کی راہ شریعت کی راہ ہے جس پر چل کر آدمی نیک کردار اور صالح بن جاتا ہے۔

یہ ہے تزکیۂ نفس کا صاف، سیدھا سادہ اور قرآنی مفہوم۔ اس میں نہ کوئی اشکال ہے اور نہ ابہام۔ اور اس کیلئے نہ کسی فلسفیانہ بحث کی ضرورت ہے اور نہ غیر ضروری باتوں میں الجھنے کی۔ قرآن نے تزکیۂ نفس کے لئے جو بہترین اور نہایت مؤثر نسخہ تجویز کیا ہے وہ ہے خدا کی اعلیٰ و اکمل شریعت، جس پر نہ ''طریقت'' کے اضافہ کی ضرورت ہے اور نہ ریاضتوں کی۔ نہ مراقبوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے اور نہ سلوک کی منزلوں سے گذرنے کی۔ بلکہ ایمان و یقین اور خلوص وللّٰہیت کے ساتھ شریعت پر کاربند ہو جانا کافی ہے۔

تزکیۂ نفس کے اس صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی کر کے قرآن نے انسان کو ان تمام غیر فطری اور بوجھل طور طریقوں سے نجات دلائی ہے، جو مذاہب کے پرستاروں نے روح اور آتما کو پاک کرنے (Purification) کے لئے ایجاد کر رکھے ہیں مثلاً یوگا، تپسیا، نفس کشی، رہبانیت وغیرہ۔

اور اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ تزکیۂ نفس کا کام اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر نہیں ہوسکتا اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعا کی تعلیم دی ہے۔

اَللّٰھُمَّ ! آتِ نَفْسِیْ تَقْوَاھَا وَ زَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا ۔ اَنْتَ وَلِیُّھَا وَ مَوْلَاھَا (مسلم کتاب الذکر)

'' خدایا میرے نفس کو اس کا تقویٰ عطاء فرما اور اس کا تزکیہ کر کہ تو بہترین تزکیہ کرنے والا ہے اور اس کا سرپرست اور مددگار ہے۔''

۱۰ یعنی بجائے اس کے کہ تقویٰ اختیار کر کے نفس کا تزکیہ کرتا۔ اس نے فجور (بدی) کی راہ اختیار کر کے نفس کو برائیوں اور گناہوں سے آلودہ کر دیا۔ اس طرح نیکی کے رجحانات کو دبانے اور بدی کے رجحانات کو اپنے اُوپر غالب

کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ نفس کا یہ غنچہ جو کھل کر پھول بن سکتا تھا اور جس کی مہک اس کے پورے وجود کو مہکا سکتی تھی، دب کر اندر ہی اندر مُرجھا گیا۔ اور بقول کسی شاعر کے: ؎

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے

آیت ۱ تا ۷ میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں اور اس کے بعد جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورج سے لے کر نفسِ انسانی تک سب کی باگ ڈور اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ان سب چیزوں کا وجود اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیات زبان حال سے اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ان کا خالق زبردست قدرت کا مالک اور بڑا حکیم و دانا ہے۔ اور جب اس کی قدرت کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں اور اس کی حکمت نے انسان کو ایک باشعور اور نیکی و بدی میں تمیز کرنے والی مخلوق بنا کر اٹھایا ہے تو اس کے لئے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کرے۔ اور اس احساس کے ساتھ ذمہ دارانہ زندگی گذارے کہ اُسے اپنے رب کے حضور جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ہے اور پھر اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پانا ہے۔ قرآن اسی حقیقت پر انسان کی نگاہوں کو مرکوز کرنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کو سنوارے۔ اور جب دنیا کے اس امتحان گاہ سے لوٹے تو کامیابی کی منزل اس کے سامنے ہو۔

اس حقیقت کی تائید اگرچہ کہ زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز سے ہو رہی ہے اور خود نفس انسانی کی بھی شہادت یہی ہے۔ تاہم انسان مشکل ہی سے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوتا ہے۔ وہ خدائی ہدایت سے بے نیاز رہنا چاہتا ہے اس لئے وہ نافرمانی اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کے اندر غیر ذمہ دارانہ پن پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہ نیکی و بدی میں کوئی تمیز نہیں کر پاتا۔

یہ نہایت ہی اہم اور وسیع مضمون ہے اور جو اوپر کی آیات کے اندر سمو دیا گیا ہے۔

۱۱ اوپر جو دعویٰ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی تائید میں یہ تاریخی شہادت پیش کی جا رہی ہے کہ سرکشی کا کیسا عبرتناک انجام دنیا کے سامنے آتا رہا ہے۔

قوم ثمود کا واقعہ قرآن میں متعدد مقامات پر تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ اس سورہ میں اس کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے۔ جھٹلانے سے مراد پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلانا ہے جو ان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ثمود کے مسکن وغیرہ کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو، سورہ فجر نوٹ ۱۳۔

۱۲ یہ بدبخت قوم ثمود کا سردار تھا اور اس کا نام قِدار تھا۔ چنانچہ عرب جاہلیت کے اشعار میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس کو سب سے بڑا بدبخت اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ نہایت سرکش تھا اور اس نے اپنی قوم کو گمراہ کر کے سرکشی کی بہت بڑی مثال قائم کی۔ اور نتیجۃً خود بھی تباہ ہوا اور قوم کو بھی تباہی کے گھاٹ اتار دیا۔

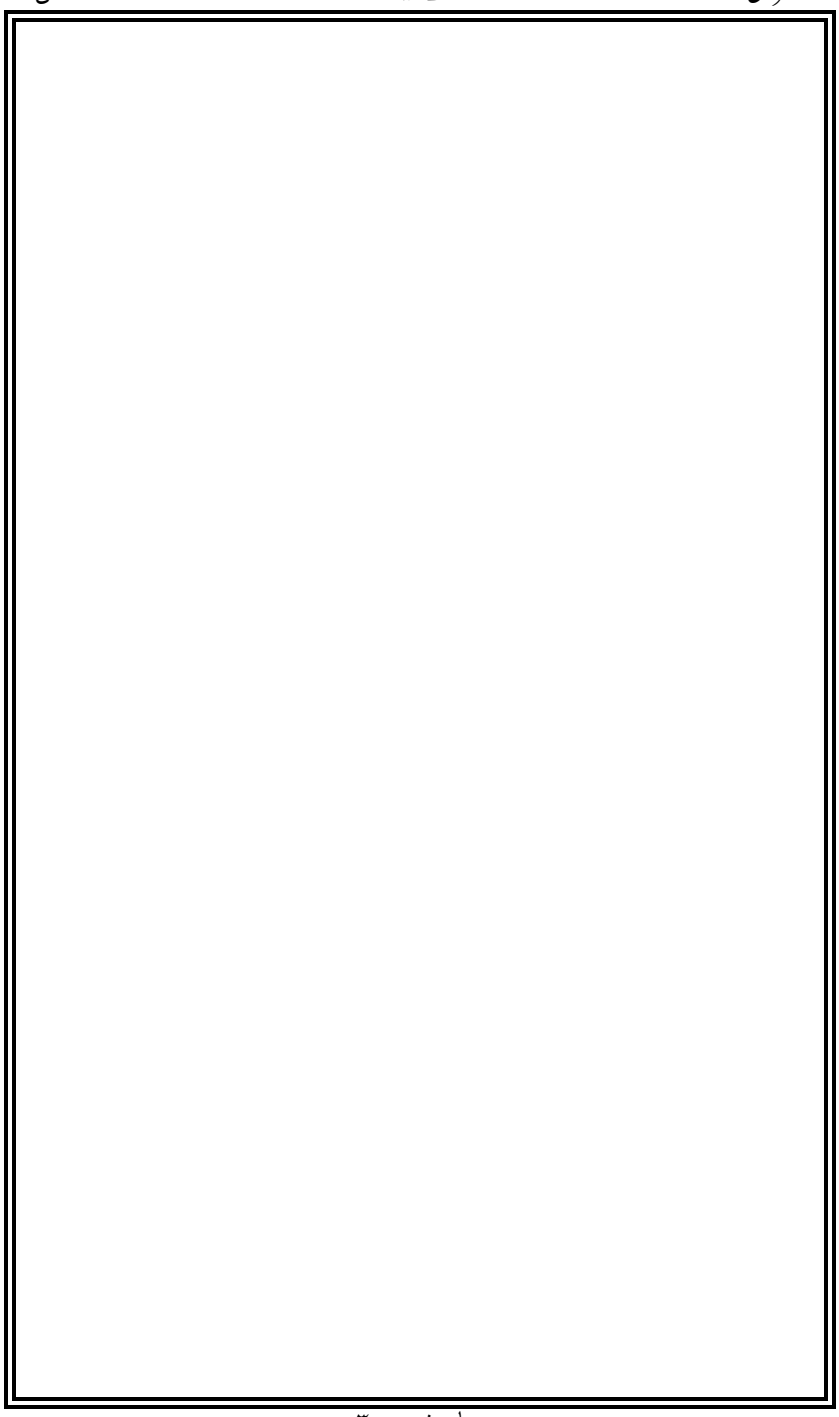

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ﴿۱۳﴾	[۱۳] تو اللہ کے رسول ۱۳؎ نے ان لوگوں سے کہا کہ خبردار اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی پینے کی باری (سے تعرض نہ کرنا)۔ ۱۴؎
فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۫ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ﴿۱۴﴾	[۱۴] مگر انہوں نے اس کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ دیں۔ ۱۵؎ بالآخر اللہ نے ان کے گناہ کی پاداش میں ان پر عذاب نازل کیا اور ان کو (زمین کے) برابر کردیا۔ ۱۶؎
وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ﴿۱۵﴾	[۱۵] اور اس کو اس کے انجام سے کوئی اندیشہ نہیں۔ ۱۷؎

۱۳؎ مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں، جو اس قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔

۱۴؎ قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ اگر واقعی وہ خدا کے رسول ہیں تو کوئی معجزہ (نشانی) پیش کریں۔ ان کے اس مطالبہ پر اللہ تعالیٰ نے اونٹنی کو معجزہ کے طور پر پیش کردیا۔ چونکہ یہ اونٹنی معجزہ کے طور پر پیش کی گئی تھی اس لئے اسے ''ناقۃ اللّٰہ'' اللہ کی اونٹنی کہا گیا۔

اس معجزے نے جہاں ان کا مطالبہ پورا کردیا وہاں ان کو آزمائش میں بھی ڈال دیا۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت صالح نے کہا ایک دن اس کے پانی پینے کے لئے مخصوص ہوگا اور دوسرا دن تمہارے لئے اور تمہارے جانوروں کے پانی پینے کے لئے ہوگا۔ اور متنبہ کیا کہ اونٹنی کو گزند نہ پہونچانا ورنہ اللہ کا عذاب تمہیں آلے گا۔ لیکن قوم نے اپنے سرکش سردار کو اس بات پر اُکسایا کہ وہ اس اونٹنی کا قصہ تمام کردے۔

۱۵؎ اونٹ کو جب مارنا ہوتا تو اس کی کوچیں کاٹ ڈالی جاتی تھیں، جس کے بعد وہ مرجاتا تھا۔ یہی طریقہ ثمود کے لوگوں نے اللہ کی اونٹنی کو مارنے کے لئے اختیار کیا اور اس غرض کے لئے سب نے مل کر اپنے بدترین سردار کو آگے کیا تھا۔ اس لئے پوری قوم اس کی مجرم قرار پائی۔

۱۶؎ یعنی ان کو اس طرح تباہ کردیا کہ وہ خاک میں مل گئے اور ملیامیٹ ہوگئے۔

۱۷؎ یعنی اللہ کو دنیا کے حکمرانوں پر قیاس نہ کرو جو کسی مجرم گروہ کو سزا دیتے وقت اندیشہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اور اس سے کہیں ان کا اقتدار تو خطرہ میں نہیں پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ کا اقتدار سب سے بالاتر ہے اور وہ سب پر غالب ہے۔ اس لئے جب وہ کسی قوم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اسے کسی قسم کا اندیشہ لاحق نہیں ہوتا۔

(۹۲) الیل

نام پہلی آیات میں لیل (رات) کی قسم کھائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام الّیل ہے۔

زمانہ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں نازل ہوئی۔

مرکزی مضمون یہ واضح کرنا ہے کہ انسان کی کوششوں کے دو مختلف رخ ہیں، جس کا تقاضا ہے کہ دونوں کے اثرات و نتائج بھی مختلف ہوں اور منزلیں بھی الگ الگ ہوں۔اس سورہ کا مضمون سورۂ الشّمس کے مضمون سے گہری مناسبت رکھتا ہے۔اس میں نفس کو پاک کرنے اور آلودہ کرنے کا انجام بیان کیا گیا تھا۔اس سورہ میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ نفس کو پاک کرنے والی چیزیں کیا ہیں اور آلودہ کرنے والی چیزیں کیا۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۴ میں چند شہادتوں کو پیش کر کے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ انسان کی سعی و عمل جب مختلف ہے تو ضروری ہے کہ اس کے نتائج بھی مختلف ہوں۔

آیت ۵ تا ۱۱ میں اچھے اور برے کردار کی چند خصوصیات پیش کر کے واضح کیا گیا ہے کہ اچھی خصوصیات نیکی کی راہ ہموار کرتی ہیں اور بُری خصوصیات بدی کی راہ کو۔

آیت ۱۲ تا ۱۴ میں واضح کیا گیا ہے کہ اللہ کا کام ہدایت کی راہ دکھا دینا ہے۔اور اس نے یہ راہ تمہیں دکھا دی ہے۔دنیا اور آخرت کا مالک وہی ہے۔اس لئے اس نے تمہیں خبردار کر دیا ہے کہ آخرت میں کیا کچھ پیش آنے والا ہے۔

آیت ۱۵ تا ۲۱ میں بتایا گیا ہے کہ بدکردار لوگ کس طرح برے انجام سے دوچار ہوں گے اور نیک کردار لوگوں کا انجام کتنا خوشگوار ہوگا۔

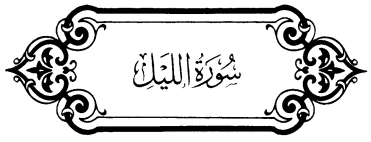

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۹۲) سُورۃُ الیل

آیات ۲۱

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾	۱ قسم ہے ۱ رات کی جب کہ وہ چھا جائے۔ ۲
وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾	۲ اور دن کی جب کہ وہ روشن ہو۔ ۳
وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۙ﴿۳﴾	۳ اور اس ذات کی ۴ جس نے نر اور مادہ پیدا کئے۔ ۵
اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ؕ﴿۴﴾	۴ یقیناً تمہاری کوششیں مختلف ہیں۔ ۶
فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾	۵ تو ۷ جس نے (مال) دیا ۸ اور پرہیزگاری اختیار کی۔ ۹
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۶﴾	۶ اور بہترین بات کو سچ مانا۔ ۱۰
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ﴿۷﴾	۷ اس کے لئے ہم آسانی کو پہنچنے والی راہ ہموار کردیں گے۔ ۱۱
وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ﴿۸﴾ وَ	۸ اور جس نے بخل کیا ۱۲ اور بے نیازی برتی۔ ۱۳
كَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ﴿۹﴾	۹ اور بہترین ۱۴ بات کو جھٹلایا۔
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ؕ﴿۱۰﴾	۱۰ اس کے لئے ہم سختی کو پہنچنے والی راہ ہموار کردیں گے۔ ۱۵
وَمَا يُغْنِىْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ؕ﴿۱۱﴾	۱۱ اور جب وہ گڑھے میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔ ۱۶
اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۖ﴿۱۲﴾	۱۲ بلاشبہہ راہ دکھانا ہمارے ذمہ ہے۔ ۱۷

۱ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ۔ ۱۴

۲ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ رات کی خصوصیت تاریکی ہے۔ جب وہ آجاتی ہے تو سب پر تاریکی چھا جاتی ہے۔

۳ یعنی رات کے بالمقابل دن کی خصوصیت روشنی ہے۔ جب وہ نمودار ہوتا ہے تو سب چیزیں روشن ہو جاتی ہیں۔

۴ مراد خالق کی قسم ہے۔ اور خالق کی قسم یہاں بات کو مؤکد کرنے اور دعوے کو قطعیت کے ساتھ پیش کرنے کیلئے ہے۔

۵ نر و مادہ جانوروں میں بھی پیدا کئے اور انسانوں میں بھی یہ جنسی اختلاف اپنی خصوصیات رکھتا ہے۔ جو خصوصیت مرد کی ہے وہ عورت کی نہیں اور جو عورت کی ہے وہ مرد کی نہیں۔

۶ یہ ہے وہ حقیقت جس پر مذکورہ قسمیں کھائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں چیزیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور الگ الگ خصوصیات کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر رات اور دن باہم مختلف ہیں اور اگر ایک کی خصوصیت تاریکی پھیلانا ہے تو دوسرے کی خصوصیت روشنی پھیلانا۔ مرد اور عورت بھی جنسی اعتبار سے باہم مختلف ہیں۔ اور اگر ایک میں فعالیت کی خصوصیت پائی جاتی ہے تو دوسرے میں انفعالیت کی۔ اگر ایک صنف میں باپ بننے کی خصوصیت پائی جاتی ہے تو دوسری صنف میں ماں بننے کی۔ یہی حال انسان کی کوششوں کا ہے کہ کوئی نیکی اور بھلائی کا طرز عمل اختیار کرتا ہے، تو کوئی بدی اور شر کا۔ کوئی خدا کا وفادار بندہ بنکر رہتا ہے تو کوئی نافرمان اور سرکش بنکر، کوئی ایک سچے خدا کو مانتا ہے اور کسی نے ہزاروں جھوٹے خدا بنا رکھے ہیں۔ کسی کی تگ و دو خیر کی راہ میں ہوتی ہے اور کسی کی شر کی راہ میں۔ کوئی مفسد اور ظالم بن کر اٹھتا ہے اور کوئی مصلح بنتا اور انصاف کی ترازو قائم کرتا ہے۔ کوئی دنیا میں مزے اڑاتا ہے اور کوئی فرض شناسی کا ثبوت دیتا ہے۔ میدان کار میں انسان کی کوششوں کا یہ تفاوت بھی اپنے اندر مختلف خصوصیات اور اپنے الگ الگ اثرات رکھتا ہے۔ اور یہ صورتحال اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کے الگ الگ نتائج رونما ہوں۔ اور جب دنیا کی حیثیت دار العمل اور دار الامتحان کی ٹھہری تو ایک دار الجزاء کی ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ پس قرآن کا یہ دعویٰ کہ آخرت دار الجزاء ہے۔ جہاں نیکی اور بدی کے الگ الگ نتائج رونما ہوں گے اور انسان اپنی سعی و عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ ٹھیک اسی حقیقت کے مطابق ہے جو مظاہر کائنات پر غور کرنے سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔

جو لوگ اتنی بڑی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ انتہائی غیر معقولیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے نزدیک ہر چیز اپنی ایک خصوصیت رکھتی ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز اپنی خصوصیت نہیں رکھتی۔ تو وہ اخلاقی اور غیر اخلاقی رویّہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز اپنا اثر رکھتی ہے لیکن اگر کوئی چیز اثر نہیں رکھتی تو وہ نیکی اور بدی ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر کام کا ایک نتیجہ ہے لیکن ان کے نزدیک اگر کوئی کام بے نتیجہ ہے تو وہ خدا کی اطاعت اور اس کی نافرمانی کے کام ہیں کہ دونوں طرز عمل یکساں ہیں اور ان کا کوئی اچھا اور بُرا نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ انسان خدا پر ایمان لائے یا کفر کرے۔ اس کی ہدایت کو تسلیم کرے یا نہ کرے نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بتایئے اس سے بڑھ کر نادانی

کی بات اور کیا ہو سکتی ہے ؟

۷ یہاں اچھے اور بُرے طرزِ عمل کا فرق واضح کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے چند ان اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کو سنوارتے اور اس کے کردار کی تعمیر کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خصلتیں بیان کی گئی ہیں جو انسان کو بگاڑتے اور اس کو بدکردار بناتے ہیں۔

۸ مراد بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا ہے۔

۹ یعنی اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ جو کام اس کی ناراضگی کے ہیں ان سے پرہیز کرے۔

۱۰ بہترین بات (اَلْحُسْنٰی) سے مراد وہ بات ہے، جس کی قرآن دعوت دے رہا ہے۔ یعنی کلمۂ توحید کو قبول کرنے اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت۔

۱۱ یعنی نیکی کی راہ پر چلنا اس کے لئے آسان ہوگا اور اس پر چل کر وہ اس منزل تک پہنچ جائے گا جہاں آسانیاں ہی آسانیاں اور راحت ہی راحت ہے۔ نیکی کی راہ گو سخت دشوار گذار راہ ہے۔ لیکن اس پر چلنا ان لوگوں کے لئے آسان ہو جاتا ہے، جو خدا اور آخرت پر ایمان لا کر تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ اور اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ گویا یہ توفیق اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بخشتا ہے جو راہِ حق پر چلنے کی ہمت کرتے ہیں اور اس کی بنیادی شرطیں پوری کر دیتے ہیں۔

۱۲ بخل سے مراد نیکی اور بھلائی کے کاموں میں مال خرچ نہ کرنا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ شخص بھی بخیل ہے جو اپنے عیش و آرام اور دوسرے نمائشی کاموں پر تو خوب خرچ کرتا ہے۔ لیکن خدا اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی اس پر گراں گذرتی ہے۔

موقع کلام کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ بخل اور زر پرستی، وہ اخلاقی برائیاں ہیں جو نفس کو آلودہ کر دیتی ہیں۔ اور پاکیزگی اختیار کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی راہِ خدا میں خرچ کرے۔

۱۳ بے نیازی برتنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی، خدا اور اس کی ہدایت سے بالکل بے تعلق ہو جائے۔ اور اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہ ہو کہ خدا کی خوشنودی کن کاموں کے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس کا غضب کس طرح کے کام کرنے سے ٹوٹ پڑتا ہے۔

استغناء (بے نیازی برتنے) کا لفظ تقویٰ (خدا خوفی اور پرہیزگاری) کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ اس لئے اگر تقویٰ خدا خوفی کے زیر اثر ذمہ دارانہ زندگی گذارنے اور فرض شناسی کا ثبوت دینے کا نام ہے تو استغناء یہ ہے کہ آدمی خدا سے بے پروا ہو کر غیر ذمہ دارانہ زندگی گذارے اور نافرض شناسی کا ثبوت دے۔

۱۴ بہترین بات کی تشریح اوپر نوٹ ۱۰ میں گذر چکی ہے۔

۱۵ یعنی بدی کی راہ چلنا اس کے لئے آسان ہوگا اور اس پر چل کر وہ اس کٹھن منزل تک پہنچ جائے گا جہاں سختیاں ہی سختیاں ہیں۔ بدی کی راہ اس لحاظ سے آسان ہے کہ اس پر چلنے والا اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ اور

اس میں اسے مادی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں اور دنیوی لذتیں بھی جو شخص ان جلد ملنے والے فائدوں کے لالچ میں آ کر اس غلط راہ کا انتخاب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اس پر چلنے کے لئے ڈھیل دیتا ہے۔ اور اس کے لئے وہ وسائل فراہم کر دیتا ہے جو برائیوں کے ارتکاب کو اس کے لئے آسان بنا دیتے ہیں۔ لیکن بالآخر آسانیاں اسے نہایت کٹھن منزل پر لیجا کر چھوڑ دیتی ہیں۔

۱۶ گڑھے میں گرنے سے مراد ہلاکت کے گڑھے میں گرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مال جسے آدمی جمع کرتا ہے اور بھلائی کے کاموں میں صرف نہیں کرتا اس کیلئے کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ بلکہ موجب ہلاکت ہوگا۔ اگر وہ خدا کی خاطر بھلائی کے کاموں میں صرف کرتا تو یہ اس کی اخروی زندگی کے لئے محفوظ سرمایہ بن جاتا۔

۱۷ یعنی جہاں تک انسان کو راہ راست دکھانے کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ ضرور لیا ہے۔ اور یہ کام اس نے اپنے پیغمبر کو بھیج کر اور اپنی اس کتاب کو نازل کر کے پورا کر دیا ہے۔ رہا راہ راست کو اختیار کرنا تو یہ انسان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ کرے گا تو کامیاب ہوگا اور نہیں کرے گا تو نامراد ہوگا۔

وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴿۱۳﴾

۱۳ اور آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی اختیار میں ہیں۔ ۱۸

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ﴿۱۴﴾

۱۴ تو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے خبردار کر دیا ہے۔

لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ﴿۱۵﴾

۱۵ اس میں وہی پڑے گا جو بڑا بد بخت ہو گا۔ ۱۹

الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۶﴾

۱۶ جس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ﴿۱۷﴾

۱۷ اور اس سے ایسے شخص کو بچا لیا جائے گا جو نہایت پرہیزگار ہے۔ ۲۰

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾

۱۸ جو اپنا مال پاکیزگی حاصل کرنے کی خاطر دیتا ہے۔ ۲۱

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ﴿۱۹﴾

۱۹ اور اس کے نزدیک کسی کے حق میں کوئی احسان بدلہ کے لئے نہیں ہے۔ ۲۲

اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ﴿۲۰﴾

۲۰ بلکہ وہ صرف اپنے ربِّ برتر کی رضا جوئی کے لئے دیتا ہے۔ ۲۳

وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴿۲۱﴾

۲۱ اور وہ ضرور خوش ہوگا۔ ۲۴

۱۸؎ یعنی دنیا و آخرت دونوں جہانوں کے مالک ہم ہی ہیں۔ اور دونوں کا نفع نقصان ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا جو شخص دنیا کے مادی فائدوں کی خاطر راہ راست کو اختیار نہیں کرتا اسے سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا میں وہ اتنے ہی فائدے حاصل کر سکے گا جتنے کہ اس کی گمراہی کے باوجود اس کا خدا سے پہنچانا چاہے۔ اس سے زیادہ وہ دنیا میں کچھ حاصل نہیں کر سکے گا۔ رہی آخرت تو وہاں ایسے لوگوں کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

۱۹؎ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کم درجہ کا بد بخت ہوگا وہ آگ میں نہیں پڑے گا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سورہ کے نزول کے وقت جو دو کردار کے لوگ سامنے تھے، ایک وہ جو پیغمبر کو جھٹلا رہے تھے اور وہ جس ہدایت کو لے کر آیا ہے اس سے منہ موڑ رہے تھے۔ اور دوسرے وہ جو پیغمبر کی تصدیق کر رہے تھے اور اس کی لائی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنا مال راہ خدا میں خرچ کر رہے تھے۔ ان میں سے پہلے کردار کے لوگ ہی یعنی پیغمبر کو جھٹلانے والے، بھڑکتی آگ میں پڑیں گے نہ کہ دوسرے کردار کے لوگ جو پیغمبر کی تصدیق کر رہے تھے۔ ان جھٹلانے والوں کو انتہائی بد بخت (اَشْقٰی) اس لئے فرمایا کہ جب پیغمبر نے براہِ راست ان لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا، جس کی وجہ سے اللہ کی حجت ان پر پوری طرح قائم ہوگئی پھر بھی وہ انکار کرتے رہے تو ان سے زیادہ بد بخت اور کون ہو سکتا ہے۔

قرآنی آیات کا مفہوم متعین کرتے وقت موقع و محل اور ان حالات کو جن میں وہ آیات نازل ہوئی ہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ نیز کسی آیت کا ایسا مطلب لینا بھی صحیح نہ ہوگا جو قرآن کے دوسرے بیانات سے ہم آہنگ نہ ہو۔

۲۰؎ یہاں بھی کہنے کا منشاء یہ نہیں ہے کہ صرف بڑے متقی ہی آگ سے بچائے جائیں گے۔ اور عام متقی نہیں بچائے جائیں گے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو دو کردار اُبھر کر سامنے آگئے ہیں۔ اور یہ اس سورہ کے نزول کے وقت اور پیغمبر کی موجودگی میں اُبھر کر سامنے آگئے تھے۔ ان میں سے صرف دوسرے کردار کے لوگ ہی آگ سے بچا لئے جائیں گے، جنہوں نے اپنے متقی (پرہیزگار) ہی نہیں بلکہ اتقیٰ (نہایت پرہیزگار) ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ رہے اشقیٰ تو وہ لازماً آگ میں پڑیں گے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ واضح رہے کہ جن لوگوں نے ابتداء ہی میں رسول کی دعوت قبول کر لی تھی اور اللہ سے ڈرتے ہوئے اپنے اندر پاکیزگی پیدا کر رہے تھے انہوں نے بہت بڑے حوصلہ کا ثبوت دیا تھا۔ اس لئے ان کا درجہ بہت بڑا ہے اور تقویٰ کے اعلیٰ معیار پر ہونے کی وجہ سے وہ سب اتقیٰ (نہایت پرہیزگار) ہیں۔

۲۱؎ معلوم ہوا کہ راہ خدا میں مال خرچ کرنا تزکیۂ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ اس سے زر پرستی اور دنیا پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور خدا پرستی اور آخرت پسندی کا جذبہ پرورش پانے لگتا ہے۔

۲۲؎ یعنی وہ جو کچھ کسی کو دیتا ہے بدلہ کی غرض سے نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک کسی کی مدد کرنا اس کو ممون احسان کرنے کے لئے نہیں ہے کہ اس سے کسی نہ کسی شکل میں اس کا بدلہ مطلوب ہو۔ بلکہ وہ خلوص کے ساتھ اور بے لوث ہو کر مدد کرتا ہے۔

۲۳؎ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انفاق وہی مقبول ہے جو خالصۃً اس کی رضا جوئی کے لئے کیا جائے۔ اور ایسے ہی انفاق سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو انفاق کسی پر احسان دھرنے یا شہرت و ناموری حاصل کرنے کی

غرض سے کیا جائے اس سے نہ اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور نہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

۲۴ یعنی جس شخص کا کردار یہ ہے اُسے اس کا رب اس طرح نوازے گا کہ وہ خوش ہو جائے گا۔ یہ آیت صرف دو لفظوں پر مشتمل ہے لیکن اس کے اندر مذکورہ اوصاف کے حاملین کے لئے بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔

(۹۳) الضحیٰ

نام آغاز ہی میں ضُحیٰ (روز روشن) کی قسم کھائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام اَلضُحیٰ ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ آغاز نبوت کے کچھ ہی عرصہ بعد نازل ہوئی تھی، جب کہ آپ کے سامنے دعوتِ حق کی مشکلات پہاڑ بن کر کھڑی تھیں۔اور منکرین رسالت کے طنز و تشنیع سے آپ کبیدہ خاطر ہو رہے تھے۔

مرکزی مضمون خطاب براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔اور آپ ﷺ کو شاندار مستقبل اور عظیم عنایات سے نوازے جانے کی خوشخبری دیتے ہوئے آپ ﷺ کی تسلی کا پورا پورا سامان کیا گیا ہے۔یہ تو ہے اس سورہ کا خاص پہلو لیکن اس خاص پہلو کے ساتھ اس کا ایک عام پہلو بھی ہے، جو فحوائے کلام سے واضح ہے۔اور وہ یہ ہے کہ کارزار حیات میں انسان کو جن مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا راہ حق میں جن دشواریوں سے گذرنا پڑتا ہے، ان کو اللہ کی ناراضگی پر محمول کرنا صحیح نہیں۔بلکہ یہ ابتلا و آزمائش کے لئے ہوتی ہیں اور وہ انسان کیلئے حقیقی ترقی کے مدارج طے کرنے کا ذریعہ ہیں۔یہی اس سورہ کا مرکزی مضمون ہے۔

نظم کلام آیت ۱ اور ۲ میں دن اور رات کی شہادت پیش کر کے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنائی ہی اس طرح ہے کہ یہاں نور بھی ہے اور ظلمت بھی۔اسی طرح تکلیفیں بھی ہیں اور راحت بھی اور یہ دونوں حالتیں آزمائش کے لئے ضروری ہیں۔

آیت ۳ میں مذکورہ بالا حقیقت کے پیش نظر یہ واضح کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو راہ حق کی، جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اس کا یہ مطلب لینا ہرگز صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف سے نظر عنایت پھیر لی ہے یا وہ آپ ﷺ سے ناراض ہوا ہے۔

آیت ۴ اور ۵ میں آپ ﷺ کو عظیم کامرانیوں کی بشارتیں دی گئی ہیں۔

آیت ۶ تا ۸ میں ان مشکلات کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے نبی ﷺ بعثت سے پہلے دوچار ہوئے۔نیز خدا کے ان احسانات کا بھی، جن کے نتیجہ میں آپ ﷺ کے لئے راہیں کھلیں۔

آیت ۹ تا ۱۱ میں بتایا گیا ہے کہ ان احسانات کا تقاضا کیا ہے؟ یعنی اس کے نتیجہ میں تمہارا رویہ کمزوروں اور بے بسوں کے ساتھ ہمدردانہ ہونا چاہئے اور خدا کی نعمت کا اعتراف و اظہار کرنا چاہئے۔

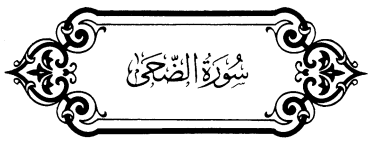

سُوْرَةُ الضُّحٰى

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى ﴿۱﴾

وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ﴿۲﴾

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ﴿۳﴾

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ﴿۴﴾

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴿۵﴾

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ﴿۶﴾

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿۷﴾

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴿۸﴾

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ﴿۹﴾

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ﴿۱۰﴾

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾

(۹۳) سُورۃ الضحیٰ

آیات ۱۱

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ہے روز روشن کی۔ ۱

۲ اور رات کی جب کہ وہ طاری ہوجائے ۔ ۲

۳ (اے پیغمبر!) تمہارے رب نے نہ تمہیں چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا۔ ۳

۴ اور آخرت تمہارے لئے دنیا سے کہیں بہتر ہے۔ ۴

۵ اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہوجاؤ گے۔ ۵

۶ کیا یہ واقعہ نہیں کہ اس نے تم کو یتیم پایا تو ٹھکانا دیا ؟ ۶

۷ اور راہ سے بے خبر پایا ۷ تو ہدایت دی؟ ۸

۸ اور نادار پایا تو غنی کردیا ۹ ؟

۹ لہٰذا تم یتیم کو مت دباؤ۔ ۱۰

۱۰ اور سائل کو نہ جھڑکو۔ ۱۱

۱۱ اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔ ۱۲

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ۔ ۱۴؎

۲؎ یہاں جو قسمیں کھائی گئی ہیں ان سے مقصود اس اصولی حقیقت کو ذہن نشین کرانا ہے، کہ اس دنیا کا نظام اللہ تعالیٰ نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہمیشہ ایک ہی حالت اور ایک ہی کیفیت طاری نہیں رہتی۔ یہاں دن کی روشنی بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی۔

ومهما استطال الليل فاالصبح واصل

اور رات خواہ کتنی ہی طویل ہو صبح نمودار ہو کر رہتی ہے۔

اس لئے جس طرح رات کی تاریکی کو دیکھ کر کسی کا روشنی سے مایوس ہو جانا صحیح نہیں۔ اسی طرح تکلیف اور مصیبت کے امڈتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر یہ خیال کرنا بھی صحیح نہیں کہ یہ بادل کبھی چھٹنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح ہے کہ دنیا کی تکلیف لازماً اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ بلکہ جس طرح آزمائش کے لئے رات اور دن دونوں کا وجود ضروری ہے اسی طرح تکلیف اور راحت دونوں ابتلاء کے لئے ضروری ہیں۔ نیز تکلیفیں انسان کو تربیت اور اس کی مخفی صلاحیتوں کو ابھارنے کا اہم ذریعہ بھی ہیں۔

۳؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت حق کا آغاز فرمایا تو مشکلات اور دشواریاں پہاڑ بن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ اور آپ ﷺ کے اس دعوے پر کہ آسمان سے آپ پر وحی نازل ہوتی ہے مخالفتوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ منکرین آپ کا مزاق اڑانے اور طنز و تشنیع کرنے لگے۔ ایک نبی کو ان حالات میں گھرا ہوا دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اگر نبی واقعی خدا کا منظور نظر ہے تو اس کی راہ میں یہ مشکلات کیسی؟ اور پھر جب وحی کچھ دنوں کے رک جاتی تو مخالفین یہ طنز کرتے کہ اللہ نے آپ ﷺ کو چھوڑ دیا ہے اور آپ سے ناراض ہے۔ مخالفین کے ان شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان اور تسلی دی جا رہی ہے کہ جن حالات میں آپ ﷺ اپنے کو گھرا ہوا پا رہے ہیں وہ کارِ نبوت کا اقتضاء اور اللہ کی اس عظیم حکمت کے تحت ہیں۔ جس کے مطابق اس دنیا کا پورا نظام چلایا جا رہا ہے۔ اور وہ حکمت یہ ہے کہ انسان کی آزمائش ہو۔ جس سے انبیاء علیہم السلام بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نرم گرم ہر طرح کے حالات سے سابقہ پیش آئے۔ ایک پیغمبر جب راہ حق کی مشکلات اور مخالفتوں کے طوفان سے گذرتا ہے تو اس سے عظیم فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً پیغمبر کے اخلاقی محاسن نکھر کر سامنے آجاتے ہیں اور اس کے کردار کی بلندی آسمان کو چھونے لگتی ہے۔ جن دلوں میں انسانیت جاگ رہی ہوتی ہے ان میں پیغمبر سے محبت و عقیدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس پر اپنی جانیں نچھاور کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبر کے عزم اور حوصلہ کو دیکھ کر اس کے پیروؤں میں بھی استقامت اور پامردی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ رہی وحی الٰہی کے نزول میں تاخیر تو یہ بھی اس بنا پر نہیں ہے کہ اللہ پیغمبر سے ناراض ہو گیا ہے۔ بلکہ وحی کا پورا معاملہ اللہ کی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس کی حکمت جس وقت اور جتنی وحی کی متقاضی ہوتی ہے وہ نازل کر دیتا ہے۔

۴؎ یہ خوشخبری اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس وقت سنائی جبکہ آپ ﷺ کو انتہائی نامساعد حالات سے گذرنا پڑ رہا

تھا۔اور سخت مشکلات آپ کی راہ میں حائل تھیں۔ان حالات میں آپ کے لئے اخروی فیروزمندی کی بشارت نہ صرف تسلی بلکہ حوصلہ افزائی کا بھی باعث تھی۔

معلوم ہوا کہ اگر آدمی آخرت کی کامیابی پر نظر رکھے تو اس سے عزم وحوصلہ پیدا ہوتا ہے اور راہ حق کی مشکلات آسان ہوجاتی ہیں۔

واضح رہے کہ متن میں ''الآخرۃ '' اور ''الاولیٰ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو'' آخرت''اور'' دنیا'' کیلئے قرآن کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔اور قرآن میں جہاں بھی یہ الفاظ مطلق طور پر آتے ہیں اسی مفہوم میں آئے ہیں۔ ماقبل سورۃ اللیل آیت ۱۳ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (بے شک آخرت اور دنیا دونوں ہمارے اختیار میں ہیں) میں بھی یہ الفاظ اسی مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔

۵ اشارہ ہے آخرت کے ان ابدی انعامات کی طرف، جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازا جائے گا۔وہاں آپؐ عزت وسرفرازی کے جس مقام پر فائز ہوں گے اور عطاء اور بخشش کی آپ پر جو بارش ہوگی اس کی ایک جھلک ان آیات و احادیث میں دیکھی جاسکتی ہیں، جن میں آپ کے رب کی طرف سے آپ پر کی جانے والی عنایات کا ذکر ہوا ہے ورنہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جو کچھ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اس کی وسعت وعظمت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

۶ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یتیم پیدا ہوئے تھے۔آپ ابھی بطن مادری میں تھے کہ آپ کے والد عبداللہ کا انتقال ہوگیا اور جب چھ سال کے ہوئے تو آپ کی والدہ آمنہ دنیا سے رخصت ہوگئیں۔آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش کی۔لیکن ابھی آپ آٹھ ہی سال کے تھے کہ دادا کا بھی انتقال ہوگیا۔ان کے بعد آپ کے چچا ابوطالب نے آپ کی کفالت کی اور آپ کے ساتھ بڑا اچھا برتاؤ کیا۔یہاں تک کہ ان کی شفقت آپ کی بعثت کے بعد بھی برقرار رہی (سیرۃ النبی ابن ہشام ج۱ ص ۱۷۱ ، ۱۷۹ ، ۱۸۰، ۱۹۳)

آپ ﷺ کی پرورش کا یہ بہترین انتظام اور وہ بھی ایک ایسے ماحول میں، جہاں یتیموں کی ناقدری کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ کے فضل ہی کا نتیجہ تھا۔یہاں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ یتیمی کی حالت میں گو تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔لیکن باپ کے سہارے سے محروم ہونے کی وجہ سے آدمی کے اندر ایک طرح کی خوداعتمادی پیدا ہونے لگتی ہے اور اس سے بڑھ کر خدا اعتمادی کا جذبہ پرورش پانے لگتا ہے۔غور کیجئے یتیمی کی حالت میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ کس طرح تربیت کا سامان کرتا ہے۔

۷ متن میں لفظ'' ضالاً '' استعمال ہوا ہے جو ضلالت سے ہے۔یہ لفظ ہدایت کے مقابلہ میں متعدد معنیٰ میں بولا جاتا ہے۔اس کے ایک معنیٰ بے خبر اور ناواقف ہونے کے بھی ہیں۔چنانچہ عربی کی سب سے بڑی اور مستند لغت ''لسان العرب''میں ہے۔وضللت المسجد و الدار اذا لم تعرف موضعهما یعنی اگر تم مسجد اور گھر کی جگہ سے واقف نہ ہو تو کہو گے، میں مسجد اور گھر سے ضلالت میں (ناواقف) رہا۔(ملاحظہ ہو لسان العرب لفظ ضلل) یہاں یہ لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

بعثت سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فطرتِ سلیمہ پر قائم تھے۔اور تمام انبیاء علیہم السلام کا بعثت سے پہلے یہی حال ہوتا ہے کہ وہ فطرتِ سلیمہ سے کبھی انحراف نہیں کرتے۔اور انسان کی فطرتِ سلیمہ اپنے رب کو پہچانتی اور اسی کو معبود قرار دیتی ہے۔نیز خیر وشر میں تمیز بھی کرتی ہے۔اور یہ دونوں ہی وصف نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں پائے جاتے تھے۔ چنانچہ بعثت سے پہلے آپ کا غار حراء میں یکسوئی کے ساتھ اللہ کی عبادت میں منہمک ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ توحید پر قائم تھے۔اسی طرح آپ کا پاکیزہ زندگی گذارنا یہاں تک کہ آپ قوم کی نظر میں معتمد ٹھہرے اور امین کے لقب سے پکارے گئے، آپ ﷺ کی اخلاقی برتری کی روشن دلیل ہے۔مزید برآں حضرت ابراہیمؑ کے دین حنیف کے جو اجزاء اس وقت تک باقی رہ گئے تھے مثلاً بیت اللہ کی تعظیم، حج وغیرہ ان پر آپ ﷺ عمل پیرا تھے۔چنانچہ یہ واقعات تاریخ سے ثابت ہیں۔(سیرۃ النبی ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹۷ اور ص ۲۲۱) گویا جس حد تک فطرت اور دین ابراہیمی کی روشنی آپ ﷺ کے سامنے موجود تھی آپ اس روشنی میں چلتے لیکن آپ پر راہ ہدایت پوری طرح روشن نہیں تھی۔اس لئے نہ آپ کو ایمان کی حقیقت معلوم تھی اور نہ شریعت کی تفصیلات کا علم تھا۔ چنانچہ قرآن نے اس کی صراحت کی ہے مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَاالْکِتَابُ وَلَاالْاِیْمَانُ (تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے۔سورۃ الشوریٰ۔۵۲)اسی حالت کو یہاں ضال (جو راہ سے بے خبر ہو) سے تعبیر کیا گیا ہے۔بالفاظ دیگر یہ جستجوئے راہ اور تلاش حق کی حالت تھی۔اس لئے اس کو ضلالت بمعنیٰ گمراہی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اور بالخصوص جب کہ آپ کے بارے میں معلوم ہے کہ نہ کبھی آپ نے خدا کا انکار کیا اور نہ بت پرستی اختیار کی۔نہ برائیوں سے آپ کو واسطہ رہا اور نہ فسق وفجور سے۔اور نہ ہی آپ نے کسی باطل چیز کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ بخاری میں بعثت سے پہلے کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھانا پیش کیا گیا جو بت کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کا تھا۔آپ ﷺ نے کھانے سے انکار کر دیا اور یہ دیکھ کر زید بن عمرو بن نفیل نے بھی انکار کیا۔ (بخاری کتاب المناقب باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل)

جہاں تک دین ابراہیمی کے بعض اجزاء کے برقرار رہنے کا تعلق ہے علامہ ابن حجر شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

انما کان عند اهل الجاهلية بقايا من دين ابراهيم ''اہل جاہلیت کے پاس دین ابراہیمی کے کچھ اجزاء ہی باقی رہ گئے تھے۔'' (فتح الباری جلد ۷ ص ۱۳)

۸ ہدایت سے مراد وحی الٰہی ہے جس نے صراط مستقیم پوری طرح آپ پر روشن کر دی۔

۹ نبی ﷺ کا بچپن یتیمی کی حالت میں گذرا اور جب آپ جوان ہوئے تو افلاس ہی کی حالت رہی۔یہاں تک کہ قریش کی سب سے زیادہ مالدار خاتون نے آپ کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کیا۔اور آپ کو شام کے تجارتی سفر میں خوب نفع ہوا۔حضرت خدیجہ نے آپ کی دیانتداری، شرافت اور حسن اخلاق سے متاثر ہو کر آپ ﷺ سے نکاح کر لیا، جس کے بعد آپ کی معاشی حالت کافی اچھی ہوئی۔(سیرۃ النبی ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۲ تا ۲۰۶) یہ جو کچھ ہوا عالم اسباب کے تحت ہوا۔لیکن حقیقۃً یہ اللہ تعالیٰ ہی کے فضل کا نتیجہ تھا کہ افلاس کی حالت غنا سے بدل گئی۔

۱۰؎ اوپر اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر فرمایا تھا۔ اب مختصراً ان کے تقاضے بیان کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہاری یتیمی کی حالت میں تمہیں پناہ دی، اسی طرح تم بھی یتیموں کے حقوق کے پاسباں بن جاؤ ۔ کسی یتیم کے ساتھ سختی سے پیش نہ آؤ۔ اس ہدایت کے براہ راست مخاطب گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن آپ کے واسطے سے یہ ہدایت قرآن کے ہر قاری کے لئے ہے۔ اور اس میں زر پرستوں کے اس رویّہ کی مذمت بھی ہے جو یتیموں اور کمزوروں کے سلسلہ میں وہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی ان کو حقیر جان کر ان کے ساتھ عزت کا برتاؤ نہیں کرتے، ان کو دباتے ہیں اور ان کے حقوق غصب کر جاتے ہیں۔

۱۱؎ یہ اس احسان کا تقاضا ہے جو اوپر آیت ۸ میں بیان ہوا یعنی ''نادار پایا تو غنی کر دیا۔'' اس احسان کا حق یہ ہے کہ محتاجوں کے ساتھ اخلاق سے پیش آیا جائے۔ اور اگر کسی مانگنے والے کی مدد نہ کی جا سکتی ہو تو اچھے انداز سے معذرت کر دی جائے۔ اور ان لوگوں کا طریقہ ہرگز نہ اختیار کیا جائے جو مال کے گھمنڈ میں غریبوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مانگنے والوں کو ڈانٹتے اور جھڑکتے ہیں۔ اس حکم کی تعمیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شدت کے ساتھ کی کہ نہ صرف یہ کہ کسی سائل کو کبھی ڈانٹا نہیں بلکہ ''نہیں'' کہہ کر اسے خالی ہاتھ واپس لوٹانا بھی پسند نہ فرماتے چنانچہ حضرت جابر کا بیان ہے کہ: ما سُئِلَ رسولُ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم شَیْئًا قَطُّ فَقَالَ لَا ۔ (بخاری کتاب الادب)

''کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز مانگی گئی ہو تو آپ نے فرمایا ہو ''نہیں''۔

اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ:

اَتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمَرَةٍ فَمَنْ لَمْ یَجِدْ فَبِکَلِمَةٍ طَیِّبَةٍ (مسلم کتاب الزکوٰۃ)

''جہنم سے بچو اگر چہ کہ کھجور کا ایک ٹکڑا صدقہ کر کے، بچنے کا سامان کر سکو اور اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو اچھی بات ہی کہو۔''

یعنی سائل کو ڈانٹنے کے بجائے اچھی بات کہہ کر معذرت کر دو۔

۱۲؎ نعمت سے مراد عام نعمتیں بھی ہیں اور خاص نعمت ہدایت بھی ہے۔

اوپر آیت ۷ میں ہدایت سے نوازے جانے کا جو ذکر ہوا یہاں اسی کا حق بیان کیا جا رہا ہے۔ گو ترتیب کے لحاظ سے اس کا مقام ایک آیت پہلے تھا۔ لیکن بات کو مؤکد کرنے کے لئے اس کو اخیر میں بیان کر دیا گیا۔ تاکہ اس کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے اور اس پر توجہ مرکوز ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو جن عنایات سے نوازا ان میں اس کی سب سے بڑی عنایت ہدایت ہی ہے۔ یہ ہدایت قرآن کی شکل میں آپ ﷺ کو ملی اور آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا گیا۔ یہاں اسی نعمت کے اظہار کی تاکید کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نوازش کا کہ اس نے تم کو پیغمبر بنایا اور قرآن جیسی عظیم اور حکمت سے لبریز کتاب عطاء کی لوگوں میں خوب چرچا کرو۔ اس پیغام کو اُن تک پہنچاؤ اور انہیں اس راہ کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعہ تم پر کھولی ہے دعوت دو۔ یہ ہدایت اگر چہ کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دی گئی ہے۔ لیکن آپ کے واسطہ سے اس کے مخاطب پیروان اسلام بھی ہیں۔ انہیں قرآن کی جو نعمت پیغمبر کے واسطہ سے ملی ہے وہ چھپانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اظہار اور بیان کے لئے ہے تاکہ اس کا فیض عام ہو۔

(۹۴)الم نشرح

نام سورہ کا آغاز اَلَمْ نَشْرَحْ کے الفاظ سے ہوا ہے۔اس مناسبت سے یہ الفاظ اس سورہ کا نام قرار پائے ہیں۔

زمانہ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں نازل ہوئی ہوگی، جب کہ آپ کے اندر منصب نبوت کی گرانبار ذمہ داریاں سنبھالنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔جس کے نتیجہ میں مخالفتوں کے طوفان سے گزرنا آپ کے لئے آسان ہو گیا تھا۔نبوت کا چرچا بھی عام ہو گیا تھا اور آپ کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی ایک تعداد بھی آپ کے گرد جمع ہو گئی تھی۔

مرکزی مضمون یہ سورہ سابق سورہ (الضحیٰ) کا تکملہ ہے۔سابق سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہنی پریشانی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ان احسانات کا حوالہ دیا ہے، جن سے اس نے اپنے نبی کو نوازا۔اس سورہ میں شرح صدر کی عظیم نعمت سے سرفراز کئے جانے کا ذکر کرتے ہوئے آپ کو اطمینان دلایا ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی ہے۔اور یہی اس سورہ کا مرکزی نقطہ ہے۔یعنی ہر مشکل کے بعد آسانی کی راہ کھلتی ہے۔گویا مشکلات کے ساتھ آسانیاں لگی ہوئی ہیں۔اس لئے ایک داعی کو راہ حق کی مشکلات دیکھ کر پست ہمت نہیں ہونا چاہئے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا ذکر ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔اور وہ بوجھ اتار دیا جو آپ کی کمر توڑے دے رہا تھا۔

آیت ۴ میں آپ کو یہ خوشخبری سنائی گئی ہے کہ آپ کا آوازہ بلند کر دیا گیا ہے۔

آیت ۵ اور ۶ میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ راہ حق کی ہر مشکل آسانی کا پیش خیمہ ہے۔

آیت ۷ اور ۸ میں نہایت اہم ہدایت دی گئی ہے کہ جب اپنے مشاغل سے تم فارغ ہو جاؤ تو اللہ کی عبادت میں سرگرم ہو جاؤ اور اسی سے لَو لگاؤ کہ تمام غایتوں کی غایت یہی ہے۔

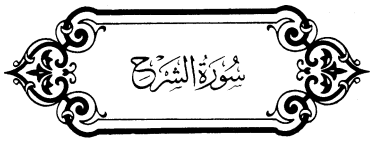

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝١

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝٢

الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝٣

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝٤

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٥

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝٦

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧

وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨

(۹۴) سُورۃ الم نشرح

آیات ۸

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ (اے پیغمبر !) کیا ہم نے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا ؟ ۱

۲ اور تم پر سے وہ بوجھ اتار نہیں دیا۔

۳ جو تمہاری کمر توڑے دے رہا تھا؟ ۲

۴ اور تمہارا ذکر بلند نہیں کیا؟ ۳

۵ تو (دیکھو) مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔

۶ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔ ۴

۷ پس جب تم فارغ ہو تو عبادت میں سرگرم ہو جاؤ۔ ۵

۸ اور اپنے ہی رب سے لَو لگاؤ۔ ۶

۱؎ شرحِ صدر (سینہ کھول دینے) سے مراد اطمینان قلب اور عزم وحوصلہ کی وہ کیفیت ہے، جو ایمان اور بصیرت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ کیفیت قوت و طاقت کا سرچشمہ ہے، جس کے حاصل ہو جانے کے بعد راہ حق کی مشکلات کو برداشت کرنا، مخالفتوں کا سامنا کرنا اور مزاحم قوتوں سے ٹکر لینا آسان ہو جاتا ہے۔ سورۂ انعام میں ارشاد ہوا ہے:

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (الانعام۔۱۲۵)

''جس شخص کو اللہ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔''

پس سینہ کا کھل جانا سراسر اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے۔

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی نعمت سے سرفراز کئے جانے کا جو ذکر ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام اُلجھنوں کو دور کر دیا۔ اور آپؐ کو وہ آہنی عزم، وہ وسعتِ حوصلہ اور وہ نورِ بصیرت عطا فرمایا جو نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے درکار تھا۔

۲؎ سورۃ الضحیٰ کی آخری آیت میں نعمت رسالت کے اظہار و اعلان کی جو ہدایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے وہ ایک گرانبار اور کمر توڑ ذمہ داری تھی۔ کیوں کہ ایک ایسے ماحول میں جہاں لوگ جاہلیت کی زندگی گذار رہے تھے اور بت پرستی اور شرک جن کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا، توحید و آخرت کی دعوت پیش کرنا اور خاص طور سے یہ کہنا کہ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے کوئی آسان کام نہ تھا۔ بلکہ سخت جاں گسل کام تھا۔ چنانچہ جوں ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز فرمایا ہر طرف سے مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آپ کی رسالت کا لوگوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ وہ خوب مذاق اڑانے لگے۔ دعوت و تبلیغ، اظہار حق اور فرائض رسالت کے ادائیگی کی یہی وہ کمر توڑ ذمہ داری تھی جس کو ادا کرنے کی فکر میں آپ ﷺ اس طرح ڈوبے رہتے کہ گویا کوہِ غم آپؐ پر ٹوٹ پڑا ہے۔ بعد کے مرحلہ میں یہ کیفیت نہیں رہی۔ کیوں کہ شرح صدر نے زبردست تقویت کا سامان کیا۔ حوصلہ کی بلندی نے مشکل کام کو بھی آسان کر دیا۔ نیز مخلص ساتھیوں کے فراہم ہو جانے سے دل کو اطمینان اور سکون نصیب ہوا۔ اسی اطمینان اور سکون کی کیفیت کو جو بعد کے مرحلہ میں پیدا ہوئی بوجھ اتار دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور حقیقت حال کا علم اللہ ہی کو ہے۔

۳؎ یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو نبی ﷺ کو دنیا میں عطا کیا گیا۔ رفع ذکر کا مطلب محض شہرت نہیں ہے بلکہ اس میں بڑی معنویت ہے اور بشارتوں کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ اس کے چند پہلو یہ ہیں کہ آپ کا ذکر مبارک بلند سطح سے ہوگا، آپ کی رسالت کا چرچا عام ہوگا۔ آپ کا نام نہایت ادب و احترام کے ساتھ لیا جائے گا، آپ کی رسالت کی گواہی دیئے بغیر کوئی بھی شخص اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اذان میں آپ کے نام کی صدا برابر گونجتی رہے گی، کوئی نماز آپ کے ذکر خیر سے خالی نہیں ہوگی، آپ دنیائے انسانیت کے نجات دہندہ کہلائیں گے، کوئی آپ کو یتیموں کا والی کہے گا، تو کوئی غلاموں کا مولیٰ، کہیں آپ کا تذکرہ معلم اخلاق اور مزکّی نفوس کی حیثیت سے ہوگا تو کہیں تاریخ ساز انقلابی شخصیت کی حیثیت سے، کہیں آپ سرور دو عالم کے لقب سے پکارے جائیں گے تو کہیں رحمۃ للعالمین

کے لقب سے، تو میں آپ کو ہادیٔ اعظم کے نام سے یاد کریں گی تو علماء اور فضلاء نور مجسم کے نام سے، آپ کی سیرت دلوں پر نقش ہوگی اور آپ کی حیات طیبہ کے ذکر سے محفلیں مہک اٹھیں گی، آپ کی شان میں نعت پڑھنا لوگوں کیلئے باعث فخر ہوگا اور بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ جیسے کلمات زبان زد عام ہوں گے۔ اہل ایمان کو آپ سے گہری عقیدت ہوگی اور شب و روز آپ کی خدمت میں ہدیۂ درود و سلام پیش کرتے رہیں گے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس آیت کے نزول کے وقت تو رفع ذکر کی ایک جھلک ہی دیکھی جا سکتی تھی۔ لیکن بعد میں جب آفتاب عالمتاب کی طرح اس کی صداقت روشن ہوگئی تو کسی کو انکار کی مجال نہ رہی اِلاَّ یہ کہ کسی نے اپنی آنکھیں ہی بند کر لی ہوں۔

موقع کلام کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطمینان دلانا مقصود ہے۔ کہ اے نبی! تمہارے مخالفین تمہیں کتنا ہی جھٹلائیں اور تمہارا کیسا ہی مذاق اڑائیں اللہ تعالیٰ نے تو تمہاری شان بلند کی ہے اور اپنے نیک بندوں میں تمہارے لئے کمال درجہ کی مقبولیت رکھ دی ہے۔ چنانچہ تمہارے ذکر سے فضا گونج رہی ہے۔ لہٰذا تم مخالفتوں کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ اور اطمینان رکھو کہ وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔

۴ یہ وہ اہم حقیقت ہے جس کو اصلاً ذہن نشین کرانا مقصود ہے۔ اس سورہ میں نیز سابق سورہ (الضحیٰ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے متعلق جن واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد فراخی، تکلیف کے بعد راحت اور مشکلات کے بعد آسانی کی راہ کھولتا ہے۔ اس حقیقت کو پیش کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ مشکلات آئندہ بھی پیش آ سکتی ہیں۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ کیونکہ ہر مشکل آسانی کا پیش خیمہ ہے۔ اور ہر دشواری سہولت کی ضمانت۔ ابتلاء کے ان مرحلوں سے گذر کر ہی آپ اس منزل کو پہنچ سکیں گے۔ جہاں آسانیاں ہی آسانیاں ہوں گی۔

اس سے یہ اصولی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آدمی راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات سے پریشان اور دل گرفتہ نہ ہو۔ بلکہ اطمینان رکھے کہ مشکلات کے بعد آسانیوں کا دور بھی آئے گا۔ اور آسانیوں کا دور اتنا قریب ہے کہ گویا ساتھ ہی چلا آ رہا ہے۔

''مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے'' یہ بات دو مرتبہ دہرائی گئی ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ راہ حق میں مشکلات بار بار پیش آ سکتی ہیں۔ لیکن ہر مشکل کے بعد، بشرطیکہ آدمی ہمت نہ ہارے آسانی کی راہ لازماً کھلے گی۔ ایسے ہی حالات سے گذر کر اہل ایمان اپنی منزل مقصود کو پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی اس مقام کو جہاں مشکلات کا گذر ہی نہیں اور جس کا اصطلاحی نام جنت ہے۔

۵ فارغ ہونے کے مفہوم میں ہر طرح کے مشاغل سے فارغ ہونا شامل ہے۔ لیکن یہاں خاص طور سے اشارہ دعوتی سرگرمیوں سے فارغ ہونے کی طرف ہے۔ کیوں کہ ماقبل سورہ کی آخری آیت وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ میں دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ اور یہاں اس سیاق میں فرمایا گیا ہے کہ'' جب تم فارغ ہو تو عبادت میں سرگرم ہو جاؤ۔'' مطلب یہ کہ جب کوئی اور مشغولیت نہ رہے تو عبادت الٰہی میں منہمک

ہوجاؤ کہ سب سے بڑی مشغولیت عبادت الٰہی ہی ہے۔ چنانچہ اس ہدایت کی تعمیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عبادت میں انہماک اس قدر بڑھ گیا تھا کہ طویل قیام لیل کی وجہ سے آپ کے پاؤں متورم ہوجاتے۔

عن عائشہ رضی اللّٰہ عنہا قالت : کان النّبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقوم من اللیل حتی تتفطر قدماہ ، فقلت لہ : لم تصنع ھذا یا رسول اللہ وقد غفرلک ما تقدم من ذنبک وما تاخر ؟ قال : افلا اکون عبداً شکوراً ۔(بخاری مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات میں اتنا طویل قیام فرماتے کہ آپ کے قدم متورم ہوجاتے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ آپ اتنا طویل قیام کیوں فرماتے ہیں جب کہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے گئے ہیں۔ فرمایا کیا میں شکر گذار بندہ نہ بن جاؤں۔''

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مقام کیا ہے۔ گو شریعت کے سب احکام اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن جو چیز تمام احکام پر فوقیت رکھتی ہے وہ عبادت ہی ہے۔ یعنی نماز، ذکر، دعا جیسی چیزیں کہ یہ عبادتِ مقررہ وقت پر بھی مطلوب ہے اور اس وقت بھی جب کہ دوسری مصروفیتوں سے آدمی فارغ ہو۔ بالفاظ دیگر اہل ایمان کو سب سے زیادہ جس کام سے دلچسپی ہونی چاہئے اور جو کام مسلسل انجام دیتے رہنا چاہئے وہ عبادتِ الٰہی ہی ہے۔ اگر غذا اور پانی انسان کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے تو اس سے کہیں زیادہ ضروری سانس لینے کا عمل ہے۔ اگر ایک منٹ کے لئے آدمی سانس نہ لے تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اسی طرح شرعی احکام خواہ وہ احکام دعوت وتبلیغ سے متعلق ہوں یا تعلیم وتربیت سے متعلق، انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے متعلق۔ اگر اسلامی زندگی گذارنے کے لئے ان کی پابندی ضروری ہے تو اللہ کی عبادت وپرستش اس سے کہیں زیادہ ضروری۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے احکام کی تعمیل کے سلسلہ میں حالات کی مناسبت سے ذمہ داریوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن نماز مؤمن کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ اور اس کا جتنا اہتمام وہ کرتا ہے اتنا ہی اس کا تعلق اللہ سے مضبوط ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ نماز اس کے آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے۔

۶ یعنی اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوجاؤ، اس کو زیادہ سے زیادہ یاد کرو، اس کی تسبیح وحمد کرو، اس کے کلام کی تلاوت کرو، اس سے استغفار کرو اور عاجزی کے ساتھ اس سے دعائیں مانگو۔

یہ ہدایت گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دی گئی ہے مگر یہ سب کے لئے عام ہے۔ اور اس سے جو اہم ترین حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام غایتوں کی غایت اللہ سے لَو لگانا یا بالفاظ دیگر تعلق باللہ ہے۔

(۹۵)التِّین

نام پہلی آیت میں تین (انجیر) کی قسم کھائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام "التین" ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور اس کے مکی ہونے پر آیت ۳ دلالت کرتی ہے۔جس میں "اس امن والے شہر" کی قسم کھائی گئی ہے جس سے مراد ظاہر ہے شہر مکہ ہی ہے۔مضمون پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دعوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون جزائے عمل ہے جس کی معقولیت نہایت دلنشین انداز میں واضح کی گئی ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں ان مقامات کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے جو جلیل القدر پیغمبروں کی یاد تازہ کرتے ہیں اور جہاں سے ہدایت کی روشنی پھیلی۔

آیت ۴ تا ۶ میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔تاکہ وہ اپنے کو اس مقام بلند کا اہل ثابت کرے جہاں اس کا رب اسے پہنچانا چاہتا ہے۔مگر اس نے پستی کی راہ اختیار کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی پستی کے گڑھے میں پھینک دیا۔البتہ جن لوگوں نے اپنے کو مقام بلند کا اہل ثابت کر دیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دائمی اجر کا وعدہ ہے۔

آیت ۷ و ۸ میں اس بات پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ جب انسانوں میں یہ دو الگ الگ اور متضاد طرز عمل پائے جاتے ہیں تو دونوں کا انجام یکساں کیسے ہوگا؟ یا یہ بات کس طرح صحیح ہو سکتی ہے کہ سرے سے کوئی انجام ہوگا ہی نہیں۔اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ کے نزدیک عدل وانصاف نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔حالانکہ یہ بات سراسر غیر معقول ہے۔کیوں کہ عقل اور فطرت دونوں کی گواہی یہ ہے کہ اللہ تمام حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہے، پھر جو سب سے بڑا حاکم ہو وہ انصاف کیسے نہیں کرے گا ؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ﴿۱﴾

وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ﴿۲﴾

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ﴿۳﴾

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۫﴿۴﴾

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ﴿۵﴾

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ﴿۶﴾

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ؕ﴿۷﴾

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۧ﴿۸﴾

(۹۵) سُورۃُ التِّین

آیات ۸

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ قسم ۱ ہے انجیر اور زیتون کی۔ ۲

۲ اور طور سینین کی۔ ۳

۳ اور اس امن والے شہر کی۔ ۴

۴ بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ ۵

۵ پھر اُسے پست ترین حالت کی طرف پھیر دیا۔ ۶

۶ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ ۷

۷ تو (اے پیغمبر!) اس کے بعد کون ہے جو تمہیں جزا و سزا کے معاملہ میں جھٹلاتا ہے ؟ ۸

۸ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟ ۹

۱؎ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ۔ ۱۴؎

۲؎ یہاں انجیر اور زیتون کا ذکر کنایۃً اس علاقہ کے لئے ہوا ہے جہاں یہ دونوں چیزیں بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ یعنی بیت المقدس کی سرزمین۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس کے بعد طور سینا اور امن والے شہر کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس مناسبت سے انجیر و زیتون سے مراد ان کی پیداوار کا علاقہ ہی ہو سکتا ہے۔

سرزمین فلسطین انجیر اور زیتون کی پیداوار کے لئے قدیم زمانہ سے مشہور رہی ہے۔ چنانچہ عہد نامۂ عتیق میں ہے:

''کیوں کہ خداوند امیرا خدا تجھ کو ایک اچھے ملک میں لئے جاتا ہے۔۔۔۔ وہ ایسا ملک ہے جہاں گیہوں اور جَو اور انگور اور انجیر کے درخت اور انار ہوتے ہیں۔ وہ ایسا ملک ہے جہاں روغن دار زیتون اور شہد بھی ہے۔'' (استثناء ۸: ۷،۸)

اور عہد نامۂ جدید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انجیر کے درخت کے پاس سے گزرنے اور اس کی تمثیل بیان کرنے کا ذکر متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ مثلاً مرقس کی انجیل باب ۱۱: ۱۲، ۱۳، ۱۴، میں اور لوقا کی انجیل باب ۲۱: ۲۹ تا ۳۳ میں ، اور کوہِ زیتون کا ذکر تو موجودہ انجیلوں میں اس کثرت سے ہوا ہے کہ اس کے ایک معلوم اور معروف مقام ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔ یہ مشہور پہاڑ یروشلم کے مشرقی جانب ہے۔

MT.of Olives ------ A hill which is before Jerusalem on the east (A Dictionary of the Bible p.554)

اس پہاڑ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لے جاتے اور اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے۔ اس سلسلہ میں آپ نے نہایت مؤثر خطبے ارشاد فرمائے ہیں جو موجودہ انجیل میں منقول ہیں۔ اور جو کوہِ زیتون کی چوٹی پر دئے گئے تھے۔

پس انجیر کے علاقہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو دعوت پیش کی۔ اور کوہِ زیتون پر آپ نے جو درس دیا اس میں آخرت کی جزا و سزا کا واضح تصور پیش کیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''پھر اس نے اپنے شاگردوں کی طرف نظر کر کے کہا، مبارک ہو تم جو غریب ہو کیوں کہ خدا کی بادشاہی تمہاری ہے۔ مبارک ہو تم جو اب بھوکے ہو کیونکہ آسودہ ہو گئے۔ مبارک ہو تم جو اب روتے ہو کیوں کہ ہنسو گے۔۔۔۔۔ اس لئے کہ دیکھو آسمان پر تمہارا اجر بڑا ہے۔۔۔۔۔ مگر افسوس تم پر جو دولتمند ہو کیوں کہ تم اپنی تسلی پا چکے۔ افسوس تم پر جو اب سیر ہو کیوں کہ بھوکے ہو گے۔ افسوس تم پر جو اب ہنستے ہو کیونکہ ماتم کرو گے اور روؤ گے۔۔۔۔۔ کیونکہ جس پیمانہ سے تم ناپتے ہو اسی سے تمہارے لئے ناپا جائے گا۔۔۔ کیونکہ کوئی اچھا درخت نہیں جو بُرا پھل لائے۔ اور نہ کوئی بُرا درخت ہے جو اچھا پھل لائے۔ ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے کیوں کہ جھاڑیوں سے انجیر نہیں توڑتے''۔ (لوقا ۶: ۲۰ تا ۴۴)

''جب وہ زیتون کے پہاڑ پر ہیکل کے سامنے بیٹھا تھا تو پطرس اور یعقوب اور یوحنا اور اندریاس نے تنہائی میں اس سے پوچھا، ہمیں بتا کہ یہ باتیں کب ہوں گی؟۔۔۔۔ مگر ان دنوں میں اس مصیبت کے بعد سورج تاریک ہو جائے گا۔ اور چاند اپنی روشنی نہ دے گا اور آسمان سے ستارے گرنے لگیں گے اور جو قوتیں آسمان میں ہیں وہ ہلائی جائیں گی۔۔۔۔ اب انجیر کے درخت سے تمثیل سیکھو۔ جونہی اس کی ڈالی نرم ہوتی ہے اور پتے نکلتے ہیں تو جان لیتے ہو کہ گرمی

نزدیک ہے ۔اسی طرح جب تم ان باتوں کو ہوتے دیکھو تو جان لو کہ وہ نزدیک بلکہ دروازہ پر ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک یہ سب باتیں نہ ہولیں یہ نسل ہرگز تمام نہ ہوگی۔ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن میری باتیں نہ ٹلیں گی۔ لیکن اس دن یا اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا۔'' (مرقس ۱۳: ۳ تا ۳۲)

''یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے مگر راستباز ہمیشہ کی زندگی'' (متی ۲۵: ۴۶)

بائبل کے ان اقتسابات میں زیتون اور انجیر دونوں کا نہ صرف ذکر موجود ہے۔ بلکہ ساتھ ہی قیامت اور جزا وسزا کا بیان بھی۔ قرآن کا اشارہ تین اور زیتون کی قسم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسی درس اور اسی تعلیم کی طرف ہے۔ اور یہ الفاظ کنایہ کے طور پر اس لئے استعمال کئے گئے ہیں تا کہ وہ ماحول مصور ہو کر سامنے آجائے جس میں جزا وسزا کا واضح تصور پیش کیا گیا تھا اور جہاں انجیل نازل ہوئی تھی۔ یہ بلاغت کا ایک اسلوب ہے تا کہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

۳ اس کا دوسرا نام طورِ سینا ہے۔ کوہِ طور جہاں موسیٰ علیہ السلام کو شریعت عطا ہوئی تھی، جزیرہ نمائے سینا میں واقع ہے۔ بنی اسرائیل مصر سے نکلنے کے بعد کوہ سینا کے دامن میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ طورِ سینین سے اشارہ تورات کی طرف ہے جس میں صراحت کے ساتھ یہ بات پیش کی گئی تھی کہ قیامت کے دن جزا وسزا کا معاملہ لازماً پیش آئے گا۔

۴ مراد شہر مکہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے نتیجہ میں امن والا قرار پایا اور اس کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہی۔ یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہاں لڑائی ممنوع تھی۔ اس کی یہ صفت کہ وہ امن والا ہے اس بات کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ انسان کی عظمت کا راز خدا کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی پاسداری میں ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی انسان کے لئے باعث ذلت ہے۔

بلدِ امین (امن والا شہر) اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ یہاں سے ہدایت کی روشنی پھیلی ہے۔ اور اس ہدایت کا ایک اہم جز آخرت کی جزا وسزا پر ایمان لانا تھا۔ اور جو صحیفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل کیا گیا تھا اس میں جزا وسزا کا یہ تصور شامل ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ اعلیٰ نوٹ ۱۹)

۵ بہترین ساخت پر پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اس کے لحاظ سے اسے نہایت موزوں ساخت عطاء کی گئی ہے۔ جسم بھی نہایت اعلیٰ درجہ کا دیا گیا ہے اور اس میں قوتیں اور صلاحیتیں بھی اعلیٰ قسم کی رکھ دی گئی ہیں۔ پھر عقل وفہم اور علم وحکمت کی قابلیتوں نے تو گویا اس کے سر پر اشرف المخلوقات کا تاج رکھ دیا ہے۔ وہ نہ پیدائشی گنہگار ہے، اور نہ اس کی فطرت شر پسند ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسے فطرتِ مستقیمہ پر پیدا کیا گیا ہے اور خیر وشر کا امتیاز اس کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ بھلائی اور برائی کے رجحانات اس کے اندر ضرور پائے جاتے ہیں لیکن جہاں تک اس کی اصل فطرت کا تعلق ہے وہ خیر پسند ہی ہے۔

انسان کو یہ بہترین ساخت جو عطا ہوئی ہے وہ خدائے واحد کی خلاقی اور اس کے فضل کا نتیجہ ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ انسان ان صلاحیتوں سے کام لے کر وہ ذمہ داریاں پوری کرے جو خدا نے اس کے سپرد کی ہیں۔ اور وہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرے جو انسانیت کا کمال ہیں۔ تا کہ وہ آنے والی زندگی میں اپنے رب کے ابدی انعامات کا مستحق قرار پائے۔

واضح ہوا کہ آخرت کی جزا وسزا انسان کے بہترین ساخت پر پیدا کئے جانے کا لازمی تقاضا ہے۔ لہٰذا قرآن کا یہ دعویٰ کہ جزا وسزا واقع ہو کر رہے گی اس کی صداقت کی دلیل ہے۔ اور اس کی یہ دعوت کہ اس تصور کی بنیاد پر اپنی زندگیاں سنوارو کوئی انوکھی دعوت نہیں ہے جو پہلی مرتبہ پیش ہوئی ہو، بلکہ اس سے پہلے بھی یہی دعوت انبیاء علیہم السلام پیش کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان جلیل القدر پیغمبروں نے جن کی طرف بڑی بڑی ملتیں منسوب ہیں۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پیروؤں کو اسی کی تعلیم دی تھی۔ انجیر وزیتون کی سرزمین (بیت المقدس) گواہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عدالت خداوندی کے تصور کو اجاگر کر کے پیش کیا تھا۔ اور کوہ زیتون پر اپنے شاگردوں کو یہ تعلیم دی تھی کہ تمہاری سعی اور جہد کا مقصد حصول آخرت ہونا چاہئے۔ جزا وسزا کی حقیقت انجیل میں بڑے مؤثر انداز سے بیان ہوئی ہے۔

اسی طرح طور سینا گواہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب ''تورات'' نازل کی گئی تھی اس میں بھی اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا گیا تھا۔ اور آپ نے بنی اسرائیل کو جو درس کوہ طور کے دامن میں دیا تھا، اور ان سے شریعت کی پابندی کا جو عہد لیا تھا اس میں آخرت کی جزا وسزا کا یہ بنیادی تصور پوری طرح شامل تھا۔ اور شہر مکہ کی تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جزا وسزا کے تصور ہی کی بنیاد پر ایک نئے شہر اور ایک نئے سماج کی داغ بیل ڈالی تھی۔ صحیفۂ ابراہیمی میں ایمان بالآخرۃ کی دعوت واضح طور سے موجود تھی۔ اور انہوں نے جو صدا بلند کی وہ فلاحِ آخرت کی طرف دوڑنے ہی کی صدا تھی ان تاریخی حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ:

اولاً جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام نے توحید کی دعوت دی تھی اسی طرح جزا وسزا پر یقین رکھنے کی بھی دعوت دی تھی۔ حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم نے تعلیم وارشاد کے جو مراکز قائم کئے تھے وہ اپنے اندر اس تعلیم کی تاریخی شہادت رکھتے ہیں۔

ثانیاً جزائے عمل کا انکار، انبیاء علیہم السلام کی تکذیب اور ان کی دعوت کا انکار ہے۔

ثالثاً ہر وہ تصور جو آخرت کی جزا وسزا کے خلاف ہو خواہ وہ دنیا کو مقصود بنانے کا تصور ہو یا مرنے کے بعد انسان کے کسی اور مخلوق میں تبدیل ہو جانے (تناسخ) کا تصور، مثلاً جانور یا درخت بن جانے کا تصور یا پھر یہ خیال کہ مرنے کے بعد زندگی ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتی ہے یا یہ وہم کہ (نعوذ باللہ) انسان مرنے کے بعد خدا میں ضم ہو جاتا ہے وہ گمراہی ہے، جو انسان کے سارے شرف کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے اور اس کی زندگی کو ناکام بنا کر اسے تباہی کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔

رابعاً جزا وسزا کا تصور انسان کو ذمہ دار اور باکردار بناتا ہے۔ نیز اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر اسے حقیقی ترقی کی راہ پر لگا دیتا ہے۔

خامساً یہ تاریخی مقامات جہاں جلیل القدر پیغمبر مبعوث ہوئے، اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ پاکیزہ نفوس اخلاق وکردار کے اعلیٰ معیار پر تھے۔ اور ان کی عظمت نے آسمان کو چھو لیا تھا۔ نیز جن لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کر کے جزائے عمل کی بنیاد پر اپنے کردار کی تعمیر کی تھی وہ بام عروج کو پہنچ گئے۔ یہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بہترین صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ اور وہ توحید وآخرت کی بنیاد پر زندگی بسر کر کے ان صلاحیتوں کو پروان چڑھا سکتا ہے۔ اور اپنے کو اتنا اونچا اٹھا سکتا ہے کہ ثریا بھی اس کی رفعت پر رشک کرنے لگے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

آیت ۱ تا ۳ میں جو قسمیں کھائی گئیں ہیں اور آیت ۴ میں جو بات ارشاد ہوئی ہے، ان کے اشارات اور مضمرات، ان تمام حقائق کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جن کو مختصراً ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔

۶ پست ترین حالت سے مراد گراوٹ اور تنزل کی انتہائی حالت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان نے اپنی ساخت کی قدر نہیں کی۔ اور ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کیا جو اس کے اندر ودیعت کی گئی تھیں۔ اور اوپر اٹھنے کے بجائے اس نے گرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے گراوٹ کے آخری درجہ کو پہنچا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قعر جہنم میں جا گرا۔

معلوم ہوا کہ انسان جب اس مقصد کو اپنا نصب العین نہیں بناتا جس کے لئے اسے اعلیٰ صلاحیتیں عطاء کی گئی ہیں تو پھر وہ انسانیت کا جوہر کھو دیتا ہے۔ اور حیوان سے بھی بدتر ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ انسانی گراوٹ کی بدترین مثالوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ اور آج بھی ذلیل حرکتوں اور کمینہ پن کے ایسے ایسے واقعات مشاہدے میں آتے رہتے ہیں کہ انسانیت ماتم کرنے لگتی ہے۔ عبادت کے مقدس جذبہ کی یہ توہین کہ انسان اینٹ پتھر کو معبود بنالے، یہاں تک کہ آلۂ تناسل کو پوجنے لگے؟ انسانی خون کی یہ ارزانی کہ جانور کی قدر و قیمت انسانی جانوں سے بھی زیادہ قرار پائے، صنف نازک پر یہ ظلم کہ مرد ان کو اپنی ہوس کا نشانہ بنالیں، کمزوروں کے حقوق کی یہ پامالی کہ یتیموں کا مال ہڑپ کر جائے، خودغرضی کی یہ انتہا کہ غریبوں کا خون چوسنے لگے، انسانوں کی اس درجہ بے وقعتی کہ ان کو اذیت دینے کے دردناک طریقے اختیار کرے اور انسانی سماج کی یہ بے حرمتی اور اس کے ساتھ ایسی دشمنی کہ سائنس اور ٹکنولوجی کو اس کی تباہی کے لئے استعمال کرے، یہاں تک کہ ایک بم کے دھماکہ میں لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر جائیں۔ یہ اور اس طرح کی دوسری خرابیاں انسانی گراوٹ کا ناقابل انکار ثبوت ہیں۔

۷ یعنی جن لوگوں نے اپنی بہترین ساخت پر پیدا ہونے کی قدر کی اور اپنے کو ایمان و عمل صالح سے سنوارا وہ پستی میں گرنے سے بچ گئے۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا استعمال صحیح مقصد کے لئے کیا اور آخرت کی منزل کو سامنے رکھتے ہوئے بلندیوں پر چڑھنے کا حوصلہ کیا۔ اس لئے وہ آخرت میں دائمی اجر کے مستحق ہوں گے اور ابدی انعام سے نوازے جائیں گے۔

۸ یعنی ان واضح اور محکم دلائل کے سامنے آجانے کے بعد قیامت اور جزائے عمل کے بارے میں پیغمبر کو جھٹلانے میں کیا معقولیت ہے؟ پس جو لوگ اس کے باوجود پیغمبر کو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں وہ اپنے ہی نامعقول ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔

۹ یعنی خدا کا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کیوں کہ آسمان اور زمین اور انسان اور فرشتے اور جن سب پر اس کی حکومت قائم ہے۔ پھر کیا تم اس سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ اچھے اور برے انسانوں میں امتیاز نہ کرے گا؟ اس کے نزدیک انصاف کوئی چیز نہیں اور وہ کبھی عدالت برپا نہیں کرے گا؟ وہ نہ مجرموں کو سزا دے گا اور نہ نیکوکاروں کو انعام؟ جب تم دنیا کے حاکموں سے بھی انصاف کی توقع رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو احکم الحاکمین ہے یہ خیال کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی انصاف کرنے والا نہیں ہے اور نہ جزا و سزا کی کوئی حقیقت ہے؟

(۹۶) العلق

نام آیت ۲ میں انسان کے عَلَقٌ (خون کی پھٹکی) سے پیدا کئے جانے کا ذکر ہوا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام اَلْعَلَقُ ہے اور اس کا دوسرا نام اِقْرَأْ (پڑھ) بھی ہے۔اس مناسبت سے کہ سورہ کا آغاز اسی لفظ سے ہوا ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور پہلی وحی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی وہ اس سورہ کی ابتدائی پانچ آیتیں تھیں۔بقیہ آیتیں بعد میں اس وقت نازل ہوئیں جبکہ ابوجہل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی اور آپ کی کھلی مخالفت پر اتر آیا۔

مرکزی مضمون یہ ہے کہ یہ کتاب خالق کائنات کا فرمان ہے جو انسان کی رہنمائی کے لئے پیغمبر پر نازل ہوا ہے۔تاکہ وہ اس کی روشنی میں اپنے رب کی بندگی کرے اور اس کا قرب حاصل کرے۔لیکن انسان کا حال عجیب ہے بجائے اس کے کہ وہ اس سعادت کو حاصل کرتا، اپنے رب سے سرکشی کرنے لگتا ہے اور پیغمبر کی مخالفت پر اُتر آتا ہے۔اس طرح اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں قرآن پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔اور اسی ضمن میں انسان کے خالق کی کرشمہ سازی کا ذکر کرتے ہوئے جو اس کی تخلیق میں نمایاں ہے، علم حقیقی کی دولت سے نوازے جانے کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔

آیت ۶ تا ۸ میں انسان کو اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ان نعمتوں کی قدر کرنے کے بجائے الٹا اپنے رب سے سرکشی کرتا ہے۔درآنحالیکہ پہنچنا اسے اپنے رب ہی کے پاس ہے۔

آیت ۹ تا ۱۴ میں ان لوگوں کو سرزنش کی گئی ہے جو پیغمبر کی مخالفت پر تُل گئے تھے۔اور آپ کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر رہے تھے۔

آیت ۱۵ تا ۱۸ میں سرکشوں کو انجام بد سے آگاہ کیا گیا ہے۔

آیت ۱۹ میں پیغمبر کو اور اس کے واسطے سے اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان سرکشوں کی بات نہ مانو اور اللہ کی بندگی میں لگے رہو۔

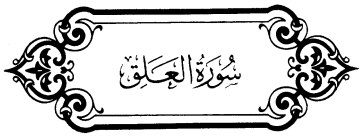

سُوْرَةُ الْعَلَقِ	# (٩٦) سُورۃُ العلق
	آیات ١٩
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے
اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ ①	١ پڑھو ١ اپنے رب کے نام سے ٢ جس نے پیدا کیا۔ ٣
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ ②	٢ پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے۔ ٤
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ ③	٣ پڑھو ٥ اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ ٦
الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ ④	٤ جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ ٧
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۭ ⑤	٥ انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ٨
كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۙ ⑥	٦ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ وہ سرکشی کرتا ہے۔ ٩
اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۭ ⑦	٧ اس بنا پر کہ وہ اپنے کو بے نیاز خیال کرتا ہے۔ ١٠
اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۭ ⑧	٨ (جب کہ) یہ بات یقینی ہے کہ تمہارے رب ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ١١
اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ ⑨	٩ تم نے اس شخص کو دیکھا جو روکتا ہے۔
عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۭ ⑩	١٠ ایک بندے کو جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے! ١٢
اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۙ ⑪	١١ تم نے سوچا اگر وہ (بندہ) ہدایت پر ہو۔
اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۭ ⑫	١٢ یا پرہیزگاری کا حکم دیتا ہو۔
اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۭ ⑬	١٣ تم نے سوچا اگر یہ (روکنے والا شخص) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو! ١٣

لے یہ ابتدائی پانچ آیتیں پہلی وحی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی جب کہ آپ ﷺ غار حرا میں جو مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے، عبادتِ خداوندی کی غرض سے معتکف تھے۔ یہ ماہ رمضان کی کوئی شب تھی اور اس وقت آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ سن عیسوی کے اعتبار سے یہ A.D. - 610 کا واقعہ ہے۔ بخاری میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غار حراء میں یکا یک فرشتہ آپ کے سامنے نمودار ہوا اور اس نے کہا ''اقرأ '' ''پڑھو'' آپ نے کہا مَـا اَنَا بِقَارِئٍ ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ مجھے فرشتے نے پکڑ کر زور سے دبایا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑا اور کہا ''پڑھو'' میں نے کہا'' میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس نے دوسری مرتبہ مجھے دبایا یہاں تک کہ میرے لئے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا'' پڑھو'' میں نے کہا'' میں پڑھا ہوا نہیں ہوں''۔ اس نے تیسری مرتبہ مجھے دبایا یہاں تک کہ میرے لئے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْـرَأْ بِسْـمِ رَبِّکَ الَّـذِیْ خَـلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا) یہاں تک کہ اس نے مَـالَـمْ یَـعْلَـمْ تک کی آیتیں پڑھیں (بخاری بدءالوحی، کتاب التفسیر)

اس طرح قرآن کے نزول کا آغاز ہوا اور آپ ﷺ نبوت سے سرفراز کئے گئے۔ یہ معاملہ یکا یک پیش آیا تھا۔ اس سے پہلے یہ بات آپ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی کہ آپ کو نبی بنایا جانے والا ہے۔ البتہ نبوت سے پہلے بھی آپ خالصۃً اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہے اور یہ عبادت کا ذوق وشوق ہی تھا جو آپ کو غار حرا میں کھینچ لایا۔ تاکہ آپ یکسوئی کے ساتھ عبادت میں منہمک ہو جائیں۔ جس فرشتہ کو آپ نے دیکھا وہ جبرئیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کا کلام لے کر آئے تھے۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے یعنی آپ نے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ اس لئے کلام الٰہی کو پڑھنے کے سلسلہ میں اشکال محسوس کیا۔ لیکن جب فرشتہ نے آپ کو تین مرتبہ دبایا تو آپ کا اشکال دور ہو گیا۔ اور کلام الٰہی کے اخذ کرنے اور پڑھنے کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں پڑھنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے مراد قرآن کا پڑھنا ہے جو کتابِ ہدایت ہے۔ جو لوگ قرآن کے اولین مخاطب تھے ان کی زبان عربی تھی اور قرآن عربی ہی میں نازل ہو رہا تھا۔ اس لئے پڑھنے کا حکم ان کے لئے سمجھ کر پڑھنے کے ہم معنیٰ تھا۔ لیکن جن کی زبان عربی نہیں ہے ان کے لئے اس حکم کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ قرآن کے اصل متن کو پڑھتے ہوئے اس کے معنیٰ ومفہوم کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ جو کتاب ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے اس کو آدمی جب تک سمجھ کر نہیں پڑھے گا اس کی ہدایت اور خیر وبرکت سے فائدہ کس طرح اٹھا سکے گا؟

واضح رہے کہ قرآن پڑھنے کا یہ حکم عربوں یا مسلمانوں کے لئے خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس حکم کا مخاطب ہر وہ انسان ہے جس تک یہ کتاب پہنچے۔ کیوں کہ یہ کتاب انسان کے خالق نے انسان کی ہدایت کے لئے نازل کی ہے۔ انسانوں کے کسی مخصوص گروہ کی ہدایت کیلئے نہیں۔ اور چونکہ یہ قیامت تک کے لئے ہدایت ہے اس لئے قیامت تک

پیدا ہونے والے سارے انسان اس حکم کے مخاطب ہیں۔ اگر ایک دوست کے خط کو غیر زبان میں پا کر آدمی کے اندر اس کے سمجھنے کے لئے بے چینی پیدا ہوتی ہے تو اس سے کہیں زیادہ بے چینی آدمی کو، بشرطیکہ اس کے اندر انسانیت زندہ ہو اپنے خالق کا ہدایت نامہ سمجھنے کے لئے ہوگی جو اگر چہ اس کی اپنی زبان میں نہیں ہے مگر اس کو سمجھنے کے لئے وسائل مہیا کر دیئے گئے ہیں۔

۲ یعنی اپنے رب کا نام لے کر قرآن پڑھو۔ بِسْم کی ''ب'' بائے استعانت ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ قرآن پڑھنا خدا کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا اس کا آغاز کرتے ہوئے اپنے رب سے مدد طلب کی جائے۔ اس حکم کی تعمیل کا طریقہ بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے اور وہ ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا۔ چنانچہ سورہ فاتحہ جو قرآن کا دیباچہ ہے اور دیگر تمام سورتوں کا آغاز بجز سورۂ توبہ کے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے) ہی ہوتا ہے۔

قرآن کو جو اللہ کے نام سے پیش کیا گیا ہے وہ دراصل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ یہ کتاب لفظاً لفظاً اللہ کا کلام ہے۔ پیغمبر کا اپنا کلام نہیں اور یہ ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہے (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ فاتحہ نوٹ ۱)

۳ یعنی جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا۔

۴ جمے ہوئے خون سے مراد استقرار حمل یعنی (Ovum) کے Fertilize ہونے کے بعد کی وہ حالت ہے جب کہ انسان اپنی تخلیق کے ابتدائی مرحلہ میں ہوتا ہے۔ اور اس کی شکل جمے ہوئے خون کی سی ہوتی ہے۔

یہاں اس کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا ہے کہ اتنی حقیر چیز سے انسان جیسی اشرف المخلوقات کو بنا کر کھڑا کر دینا خالق کی عظیم قدرت، کمالِ حکمت، اس کی کرشمہ سازیوں اور بے انتہا نوازشوں پر دلالت کرتا ہے۔

۵ اِقْرَأْ یعنی پڑھنے کا حکم یہاں دوبارہ دیا گیا ہے جس سے تاکید بھی مقصود ہے اور قرآن کی اہمیت کا اظہار بھی، کہ یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جو بار بار پڑھے جانے کے لائق ہے۔ اور تمہیں یہ تاکیدی حکم دیا جا رہا ہے کہ اسے ایک بار نہیں بلکہ بار بار پڑھو۔

۶ اللہ تعالیٰ کی صفت '' اَکْـرَم '' بیان ہوئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بڑے شرف وعظمت والی ہستی ہے اور وہ بندوں کے حق میں نہایت محسن ہے۔ یہاں اس صفت کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اپنی ذات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ ہی شرف والا اور صاحب عظمت ہے۔ انسان کی تخلیق تو نہایت حقیر مادہ سے ہوئی ہے اس لئے اسے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح انسان کو یہ احساس دلانا بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ بہترین مخلوق بنا کر اس کی رشد وہدایت کا سامان کیا۔

۷ یعنی قلم علم کی اشاعت کا محفوظ اور اہم ترین ذریعہ ہے۔ یہ ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کا بہترین استعمال یہ ہے کہ قرآن کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے۔ چونکہ قرآن ایک ایسی قوم پر نازل کیا جا رہا تھا جو اُمّی تھی۔ اس لئے قلم (کتابت) کی اہمیت واضح کی گئی تا کہ اب اسے اشاعتِ قرآن کی جو خدمت انجام دینا ہے اور

اس میں تحریر و کتابت کا جو مقام ہے اسے وہ محسوس کرے اور اس کے لئے مستعد ہو جائے۔ چنانچہ آگے چل کر تعلیمی میدان میں اس نے جو ترقی کی اور قرآن کو ضبطِ تحریر میں لا کر اس کی اشاعت کے سلسلہ میں جو بیش بہاء خدمات انجام دیں وہ اسی ہدایتِ ربانی کے اثرات و نتائج تھے۔

۸ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے کہ اس نے ایک حقیر ترین مادہ سے بلند ترین صفات کی مخلوق کھڑی کر دی، جس کی ایک ممتاز ترین صفت اس کا صاحب علم ہونا ہے۔

"وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا" سے مراد غیب کی حقیقتوں کا وہ علم ہے جو وحی کے ذریعہ انسان کو دیا گیا۔ یہ حقیقی اور بنیادی علم ہے جو قرآن کی شکل میں انسان کو عطاء ہوا ہے اور اسی پر اس کے ارتقاء اور اس کی ابدی کامیابی کا دارومدار ہے۔ گویا قرآن کا نزول انسان پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے۔ چنانچہ سورۂ رحمٰن میں اس کو اپنی رحمت کا سب سے بڑا فیضان قرار دیا ہے۔:

الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ "رحمٰن نے قرآن سکھایا" اور اس کا ذکر انسان کی پیدائش کے ذکر سے پہلے کیا ہے۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ (انسان کو پیدا کیا) تا کہ واضح ہو کہ اس کی پیدائش کا مقصد ہدایت کا حصول ہے جس کا سرچشمہ قرآن ہے۔

۹ یعنی بجائے اس کے کہ انسان اللہ کی اس نعمت کی قدر کرتا اس سے سرکشی کرنے لگتا ہے۔

۱۰ یعنی اس سرکشی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے کو خدا سے بے نیاز خیال کرنے لگتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ من مانی کرنے کے لئے آزاد ہے۔ اس لئے اسے نہ خدا کی پرواہ ہوتی ہے اور نہ اس کی ہدایت کی۔ اور اگر اسے مال و دولت اور جاہ و منصب بھی حاصل ہو تو پھر اس کے اندر متکبرانہ نفسیات بڑی تیزی سے پیدا ہونے لگتی ہیں اور وہ خدا کے خلاف سرکشی پر اُتر آتا ہے۔

۱۱ یعنی خدا سے بے نیازی اختیار کر کے کوئی شخص بھی اپنے کو عدالت خداوندی کی حاضری سے بچا نہیں سکتا۔ وہاں اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس سرکشی کا کیا نتیجہ نکلا۔

۱۲ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف جو حدیث میں بیان ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثت کے بعد جب مسجد حرام میں نماز ادا کرنے لگے تو ابوجہل نے جو بڑا سرکش تھا آپ کو نماز سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اس مخصوص واقعہ کی طرف اشارہ کے علاوہ آیت کا عمومی پہلو یہ ہے کہ جو شخص بھی جس کسی بندہ کو نماز سے جو بندگیٔ رب کا اولین مظہر ہے روکتا ہے وہ ایک بے ہودہ حرکت کرتا ہے جو ہر طرح قابل مذمت ہے۔

۱۳ ان آیات میں قرآن کے ہر مخاطب کو یہ سوچنے کی دعوت دی گئی ہے کہ ایک طرف اللہ کا وہ بندہ ہے جو خود راہ راست پر ہے۔ اور دوسروں کو خدا سے ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ شخص ہے جس کا کام حق کو جھٹلانا اور اس سے روگردانی کرنا ہے تو بتاؤ ان میں سے کس کی روش صحیح ہے؟ اور پھر اگر یہ جھٹلانے والا شخص اسلام دشمنی میں اندھا ہو کر اس نیک بندہ پر زیادتیاں کر رہا ہو اور اس کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہو تو اس کی یہ حرکت کیسی ہے؟

پس منظر کے لحاظ سے ان آیات کا اشارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل کی طرف ہے۔ مگر اپنے مفہوم کے لحاظ سے اس میں عمومیت ہے۔ جو شخص بھی اسلام دشمنی میں کسی نیک بندے کو راہ حق سے روکے اس کی یہ حرکت اسی طرح قابل مذمت ہے جس طرح کہ ابوجہل کی حرکت قابل مذمت تھی۔

اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ﴿۱۴﴾	۱۴ کیا اسے نہیں معلوم کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟ ۱۴
كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ﴿۱۵﴾	۱۵ خبردار! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ ۱۵
نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿۱۶﴾	۱۶ جھوٹی اور خطا کار پیشانی ! ۱۶
فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ﴿۱۷﴾	۱۷ پس وہ بلا لے اپنی ٹولی کو۔ ۱۷
سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿۱۸﴾	۱۸ ہم بھی بلاتے ہیں عذاب کے فرشتے کو۔ ۱۸
كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾	۱۹ خبردار! اس کی بات نہ مانو ۱۹ اور سجدہ کرو ۲۰ اور قرب حاصل کرو۔ ۲۱

۱۴؎ یعنی کیا یہ ظالمانہ حرکتیں کرنے والا شخص اس بات سے بے خبر ہے کہ اللہ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اور جب وہ ظالم و مظلوم اور بدکردار و نیک کردار سب کو دیکھ رہا ہے تو وہ ظالم کو سزا کیسے نہیں دے گا اور مظلوم کی دادرسی کیسے نہیں کرے گا؟ کیا جس ہستی کی نظر اس کے بندوں اور ان کی تمام حرکات و سکنات پر ہو، اس کے نزدیک اس کی بندگی کرنے والے اور اس کی بندگی سے روکنے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انصاف کا ایک دن برپا ہو۔

۱۵؎ یعنی یہ سرکش اگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تو وہ دن آنا ہے جب کہ فرشتے اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔ سورۂ رحمٰن میں مجرموں کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (الرحمٰن ۴۱)

''ان کی پیشانیوں کے بال اور ان کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو گھسیٹا جائے گا۔''

سرکش بڑے گھمنڈ میں مبتلا ہوتے ہیں اور ان کے دماغ میں یہ ہوا بھر جاتی ہے کہ وہ بڑے لوگ ہیں، اس لئے ان کو قیامت کے دن یہ رسوا کن عذاب نہیں دیا جائے گا کہ فرشتے ان کی پیشانیوں کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے اور انہیں جہنم رسید کریں گے۔

۱۶؎ جھوٹی اور خطا کار پیشانی اس لئے کہا کہ جو پیشانی میں اپنے خالق کے حضور نہ جھکی اور دوسروں کو بھی اس کے حضور جھکنے سے روکتی رہی اس کے جھوٹی اور خطا کار پیشانی ہونے میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے۔

۱۷؎ اشارہ ہے ابوجہل کی اس دھمکی کی طرف کہ اس وادی میں میری ٹولی کے لوگ زیادہ ہیں۔

۱۸؎ یعنی اگر کسی کو اپنی ٹولی کے لوگوں پر ناز ہے تو وہ ان کو اپنی حمایت کے لئے بلا لے۔ ہم بھی اپنی پولیس (زبانیہ) یعنی دوزخ کے فرشتوں کو بلاتے ہیں۔ پھر وہ دیکھ لے کہ اس کے اندر کتنا بل بوتا ہے۔

۱۹؎ یعنی ان سرکشوں کی باتوں میں نہ آؤ جو خدائے واحد کی بندگی سے تمہیں روکنا چاہتے ہیں۔

۲۰؎ سجدہ کے معنیٰ جھکنے کے بھی ہیں اور ماتھا زمین پر ٹیک دینے کے بھی۔ یہاں سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے واحد ہی کے آگے جھکو، اسی کے آگے ماتھا ٹیکو اور اسی کے لئے نماز پڑھو۔

۲۱؎ یعنی اپنے رب کا قرب حاصل کرو۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ (مسلم کتاب الصلوٰۃ)

''بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔''

واضح ہوا کہ سجدہ جو نماز کا اہم ترین رکن ہے قرب الٰہی کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ کیوں کہ سجدہ میں انسان اپنی پیشانی کو جو جسم کا اشرف ترین حصہ ہے زمین پر رکھ دیتا ہے اور خدا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی پاکیزگی بیان کرتا ہے۔ (**سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى**)۔

اس سے پہلے کی آیت میں خطا کار پیشانی کا ذکر تھا جسے جہنم رسید کر دیا جائے گا۔ اسکے مقابل میں یہ آیت مؤمن

کی پیشانی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے کی بناء پر معزز قرار پائے گی۔

سورہ کی ابتداء قرآن پڑھنے کے حکم سے ہوئی تھی اور اختتام خدا کا قرب حاصل کرنے کے حکم پر ہوا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ قرآن پڑھنے کا ثمرہ خدا کا قرب ہے۔اس سے اونچا کوئی مقام نہیں جس کا انسان تصور کر سکے اور اس سے بلند کوئی غایت نہیں جو حاصل کی جا سکتی ہو۔

اس آیت پر سجدہ کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

(مسلم کتاب المساجد)

غارِ حراء

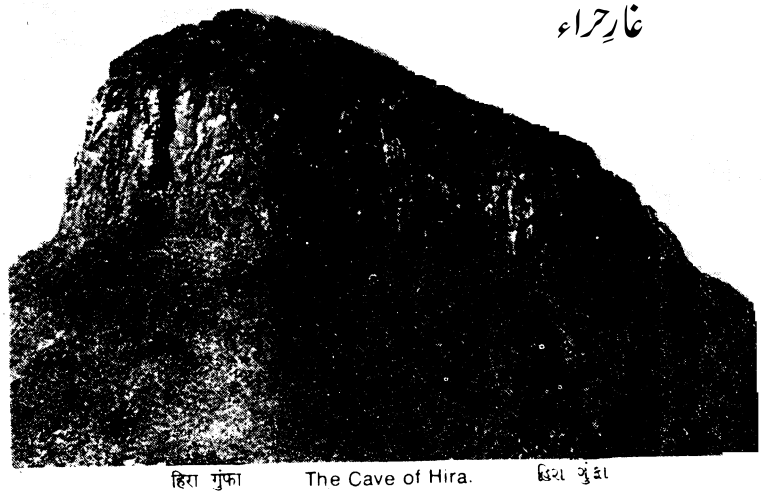

हिरा गुंफा The Cave of Hira. હિરા ગુફા

(۹۷) القدر

نام پہلی آیت میں قرآن کے شب قدر میں نازل ہونے کا ذکر ہوا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام اَلْقَدَر ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے جیسا کہ امام سیوطی نے الاتقان میں صراحت کی ہے(الاتقان ج ا ص ۲۲)۔ نیز مضمون سے بھی اس کے مکی ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

مرکزی مضمون قرآن کی اہمیت اور اس کی عظمت کو واضح کرنا ہے۔

نزولِ قرآن کا آغاز سورۂ علق کی ابتدائی آیات سے ہوا تھا۔اس سورہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ گھڑی نہایت مبارک تھی جب کہ نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔

نظم کلام سب سے پہلے اس عظیم تاریخی واقعہ سے آگاہ کیا گیا ہے کہ نزول قرآن کا آغاز نہایت مہتم بالشان طریقہ پر ایک جلیل القدر رات میں کیا گیا، کیوں کہ قرآن کا نزول کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ عظیم الشان فیصلۂ الٰہی ہے جو قوموں کی تقدیر بدلنے والا اور دنیائے انسانیت کی کایا پلٹ دینے والا ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس رات کی برکتیں کیا ہیں اور کس طرح یہ رات صبح تک سرتاسر سلامتی کی رات ہوتی ہے۔

اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جو کتاب اس شان کے ساتھ نازل ہوئی ہے اس سے بے اعتنائی برتنے والے اور اس کو بے وقعت خیال کرنے والے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اتنے بڑے خیر سے اپنے کو محروم رکھنا چاہتے ہیں۔

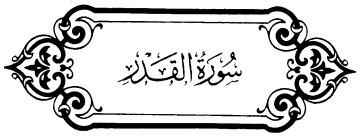

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲

لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴

سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

(۹۷) سُورۃُ القدر

آیات ۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ ہم نے اسے ۱ شبِ قدر میں نازل کیا ۔۲

۲ اور تمہیں کیا معلوم کہ شبِ قدر کیا ہے؟ ۳

۳ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔۴

۴ اس میں فرشتے اور روح (الامین)۵ اپنے رب کے اذن سے ہر حکم کو لے کر اترتے ہیں۔۶

۵ سراپا سلامتی ہے وہ شب طلوعِ فجر تک۔۷

۱؎ یعنی قرآن کو۔

۲؎ قَدْر کے معنی قدر و منزلت کے ہیں اور (شبِ قدر) کے معنی ہیں قدر و منزلت والی رات۔ یہ وہ رات ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی جب کہ آپ غارِ حراء میں معتکف تھے۔ چونکہ اس رات کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں نزولِ قرآن کا آغاز ہوا۔ اس لئے اسے لیلۃ القدر کے نام سے موسوم کیا گیا اور سورۂ دخان میں لیلۃ مبارکۃ (مبارک شب) بھی کہا گیا ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے ان ایام کو منحوس قرار دیا گیا۔ جن میں قوم عاد پر عذاب نازل ہوا تھا۔

فَأَرسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحِسَاتٍ ''تو ہم نے ان پر منحوس دنوں میں سخت تند ہوا بھیج دی۔'' (حم السجدہ۔۱۶)

ظاہر ہے اس آیت میں منحوس دنوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دن بجائے خود منحوس تھے۔ بلکہ چونکہ ان ایام میں قوم عاد پر اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا اس لئے وہ دن اس قوم کے لئے منحوس قرار پائے۔ اس کی دوسری مثال رمضان کا مہینہ ہے کہ اس کی فضیلت و برکت اس بنا پر ہے کہ اس میں قرآن نازل ہوا۔ اسی طرح لیلۃ القدر کی فضیلت و برکت اس بنا پر ہے کہ اس میں نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہ رات رمضان کی تھی جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔ (البقرہ۔۱۸۵)

یہ رات جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آتا ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ کی ایک رات تھی۔

واضح رہے کہ لیلۃ القدر میں قرآن کے نازل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس شب میں پورا قرآن نازل ہوا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس متبرک کتاب کے نزول کی ابتداء اسی شب میں ہوئی۔ گویا رحمت خداوندی اسی رات کو جوش میں آئی اور ہدایت کے سوتے اسی شب میں پھوٹ پڑے۔

نزولِ قرآن کے لئے دن کے بجائے رات کا انتخاب خالی از حکمت نہیں ہے۔ رات کا وقت سکون و طمانیت کا وقت ہوتا ہے خدا پرست انسانوں کی طبیعتوں کا میلان خدا کی طرف ہوتا ہے۔ یہ پرسکون اوقات روح کی بالیدگی کے لئے بہت موزوں ہوتے ہیں۔ اور بالخصوص شب کا آخری حصہ تو مناجاتِ الٰہی اور آہ سحر گاہی کے لئے موزوں ترین وقت ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن اور حدیث میں شب کے آخری حصہ میں نماز اور دعا کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور عجب نہیں کہ قرآن کا نزول بھی لیلۃ القدر کے آخری حصہ میں ہوا ہو۔

۳؎ یہ سوال لیلۃ القدر کی عظمت و برکت واضح کرنے کیلئے ہے۔ نیز اس کا اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ اس رات کا معاملہ اسرارِ غیب میں سے ہے۔ اس لئے اس کے بارے میں وحی الٰہی نے جو کچھ بتلایا ہے اس سے زیادہ تفصیلات جاننے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس رات کی ٹھیک ٹھیک تعیین کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں اسے تلاش کرنے کا

جو حکم دیا ہے اس پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

ہزار مہینوں کی تعبیر خیر و برکت کی کثرت کو واضح کرنے کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ رات اپنے اس شرف کی بنا پر کہ اس میں انسان کو ہدایت سے نوازے جانے کا حکیمانہ فیصلہ ہوا اور نزول قرآن کے سلسلہ کی ابتداء ہوئی۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ دوسری ہزار راتوں بلکہ ہزار مہینوں پر بھی بھاری ہے اور جب ظرف (رات) اس درجہ کا ہے تو مظروف (قرآن) کس درجہ کا ہوگا!

اس رات نے اپنے برکتوں کے خزانے تو اس وقت کھول دیئے تھے جب کہ فرشتہ غار حراء میں پہلی وحی لے کر آیا تھا۔ لیکن اس کی برکتیں مستقل طور سے باقی رہ گئیں۔ چنانچہ ہر سال رمضان کے مہینہ میں نزول قرآن کی یادگار کے طور پر اسے منایا جاتا ہے۔ اور اس کے منانے کی شکل یہ ہوتی ہے کہ اس میں نماز، تلاوتِ قرآن اور ذکر و دعا کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ قَامَ لَيْلَةَالْقَدْرِ اِيْمَاناً وَ احْتِسَاباً غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ۔

''جس شخص نے ایمان کے ساتھ اللہ سے اجر کی امید پر شب قدر میں عبادت کی اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے گئے۔'' (بخاری کتاب صلاۃ التراویح)

جس طرح بارش کا موسم کاشت کاری کے لئے بڑا سازگار ہوتا ہے اسی طرح قرب الٰہی کے حصول کے لئے شریعت کے مقرر کردہ مخصوص اوقات، مخصوص دن اور مخصوص راتیں نہایت سازگار ہوتی ہیں۔ مثلاً تہجد کا وقت، جمعہ کا دن، رمضان کا مہینہ، یوم عرفات وغیرہ۔ اسی طرح لیلۃ القدر قرب الٰہی کے حصول کے لئے بہترین اور موزوں ترین شب ہے۔ اسی لئے حدیث میں اسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرنے کا حکم دیا گیا ہے :

عن عائشة رضى الله عنها ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : تَحَرُّوْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ ۔

(بخاری۔ کتاب صلاۃ التراویح)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شب قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔''

طاق راتوں سے مراد رمضان کی اکیسویں، تیئیسویں، پچیسویں، ستائیسویں، اور انتیسویں شب ہے۔ کسی ایک شب کا تعین اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس کی تلاش کا شوق پیدا ہو اور لوگ کئی راتیں عبادت میں گزاریں۔ اس پہلو سے اعتکاف کی مصلحت بھی واضح ہے جو رمضان کے آخری عشرہ میں کیا جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ دنیا کے ایک حصہ میں رات ہوتی ہے تو دوسرے حصہ میں دن۔ اس لئے جب مکہ میں شب قدر ہو تو دور کے علاقے کے لوگ کس طرح اس کو پا سکیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت نے جس گھڑی کو بابرکت قرار دے کر عبادت کے لئے مختص کیا ہے اس کے سلسلہ میں مقامی وقت کا اعتبار ہوگا۔ مثلاً شب کا آخری حصہ

جو دعا کی قبولیت کے لئے خاص ہے یا جمعہ کا وقت تو اس سلسلہ میں مقامی وقت ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے اور اسی کے مطابق نماز وغیرہ ادا کی جاتی ہے۔ اور اس سے وہ برکتیں غائب نہیں ہو جاتیں جو مخصوص وقت یا مخصوص دن کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اسی طرح شب قدر کی برکتیں بھی مقامی وقت کا اعتبار کرنے کے باوجود باقی رہتی ہیں اور ہر علاقے کے لوگ اسے پا سکتے ہیں۔

۵ روح سے مراد روح الامین ہیں جو حضرت جبریل کا لقب ہے۔ ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کے سردار ہیں۔

۶ تَنَزَّلُ (اترتے ہیں) کا صیغہ تصویرِ حال کے لئے ہے تا کہ اس وقت کی تصویر سامنے آجائے جب کہ فرشتے کلام الٰہی کو لے کر نازل ہو رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی بادشاہ کے سپاہی شاہی فرمان کو لے کر کسی مہم پر دوڑ پڑتے ہیں اسی طرح جبریل فرشتوں کی فوج کے ساتھ فرمان الٰہی کو لے کر نازل ہوئے تھے، اور اس شان سے نازل ہوئے تھے کہ گویا روحانی عالم میں یہ جشنِ قرآن کی شب تھی۔

ہر حکم کو لے کر نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شب قدر میں فرشتوں کا نزول یونہی نہیں ہوا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہر ہر حکم کی تعمیل کے لئے ہوا تھا مثلاً یہ کہ قرآن کی پانچ آیتوں کو جو سورۂ علق کی ابتدائی آیات میں نازل کرنا، مکہ کے غار حراء میں نازل ہونا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل کر کے آپ ﷺ کو خلعتِ نبوت پہنانا، آپ کو پکڑ کر بھینچنا تا کہ آپ میں اخذِ وحی کی اور اس کو صحت کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے وغیرہ۔ ان کے علاوہ نزولِ خیر و برکت کے سلسلہ میں فرشتوں کو جو احکام دئے گئے تھے ان میں سے ہر ہر حکم کی انہوں نے ٹھیک ٹھیک تعمیل کی اس لئے نزول قرآن اور نبوت سے سرفراز کئے جانے کا جو معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا وہ شبہہ سے بالاتر ہے۔

واضح رہے کہ آغازِ وحی کے موقعہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف جبریل علیہ السلام دکھائی دئے تھے مگر جیسا کہ یہ آیت صراحت کرتی ہے اس شب میں دوسرے فرشتے بھی نازل ہوئے تھے۔ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے فرشتہ کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا، جس کا متحمل ہونا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس لئے آپ کے سامنے صرف جبریل علیہ السلام کو ظاہر کیا گیا۔

۷ نزول قرآن کے موقع پر آسمان پر سخت پہرے بٹھا دئے گئے تھے تا کہ شیاطین قرآن میں خلل اندازی نہ کر سکیں اور نہ انہیں ملأ اعلیٰ سے سن گن لینے کا موقع مل سکے کیوں کہ اگر انہیں پیغمبر کی بعثت کی خبر قبل از وقت ہوئی یا جو پیغامات پیغمبر کی طرف بھیجے جا رہے ہیں ان کی بھنک انہوں نے پائی تو وہ کاہنوں کے کانوں میں الٹی سیدھی باتیں ڈال کر زمین پر فتنہ برپا کریں گے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کے غیر معمولی انتظام کا نتیجہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ آپ کو نبی بنایا جانے والا ہے اور نہ نزول قرآن سے پہلے کسی کو یہ خبر ہوئی کہ فلاں شب کو یہ اور یہ پیغام نازل ہونے والا ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے نزول قرآن کی شب کو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھنے کا سامان کیا تھا۔ اور اس رات کو کامل طور پر سلامتی کی رات بنایا تھا۔ اور یہ کیفیت تھوڑی دیر کے لئے نہیں بلکہ طلوع فجر تک رہی کیوں کہ یہ مبارک شب قرآن کریم کے افتتاح کی شب تھی اور اب جو نزول قرآن کی یادگار کے طور پر شب قدر منائی جاتی ہے تو اس میں بھی اس کی سلامتی اور برکتیں طلوع فجر تک رہتی ہیں اس لئے یہ پوری رات اس لائق ہے کہ عبادت میں گذاری جائے۔

شب قدر سرتاسر سلامتی کی رات تھی اور اس میں جو کتاب نازل ہوئی وہ بھی سرتاسر سلامتی ہی کی کتاب ہے یہ انسانیت کے لئے سلامتی کا پیغام ہے۔ اس کو قبول کرنے والے دنیا میں بھی سلامتی کی زندگی گذاریں گے اور آخرت میں انہیں ابدی سلامتی نصیب ہوگی۔

پہلی وحی جو شب قدر میں نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

العلق: ۱-۵

(۹۸) البینة

نام پہلی آیت میں اَلْبَیِّنة (روشن دلیل) کا ذکر ہوا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام اَلْبَیِّنة رکھا گیا ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دعوت کے اس دور میں نازل ہوئی جب کہ اہل کتاب اور مشرکین پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا اچھی طرح واضح ہو گیا تھا۔اور اس کے باوجود انہوں نے انکار کی روش اختیار کر لی تھی۔

مرکزی مضمون اس سورہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنا کر بھیجنے اور آپ پر کتاب نازل کرنے کی ضرورت کیا تھی۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں بتایا گیا ہے کہ لوگوں کو کفر کی حالت سے نکالنے کے لئے ضروری تھا کہ کتاب کے ساتھ ایک رسول بھیجا جائے تا کہ وہ اللہ کے دین کو صحیح شکل میں پیش کرے۔

آیت ۴ اور ۵ میں واضح کیا گیا ہے کہ اہل کتاب کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن تعلیمات آ چکی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تفرقہ میں پڑ گئے اور دین کی اصل تعلیمات کو بھلا بیٹھے۔

آیت ۶ تا ۸ میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول کا انکار کرنے والے کیسے دردناک انجام سے دوچار ہوں گے۔ بخلاف اس کے رسول پر ایمان لا کر خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے والے کس طرح کامیاب اور بامراد ہوں گے۔

ارشاد رسول حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبی بن کعب سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں سورۂ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سناؤں۔حضرت اُبی بن کعب نے عرض کیا، کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر یہ حکم دیا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔یہ سن کر حضرت اُبی بن کعب کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔(بخاری کتاب التفسیر)

حضرت اُبی بن کعب اہل کتاب میں سے تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لائے تھے۔اور چونکہ اس سورہ میں ان ایمان لانے والوں کے لئے بشارت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی قدر فرماتے ہوئے انہیں یہ سورہ سنانے کا حکم اپنے نبی کو دیا۔اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ قدر دیکھ کر حضرت اُبی بن کعب پر رقت طاری ہو گئی جو ایمان کا خاصہ ہے۔

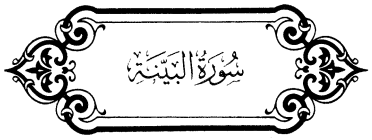

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴿۱﴾

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ﴿۲﴾

فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ؕ﴿۳﴾

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ؕ﴿۴﴾

وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ؕ﴿۵﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ؕ﴿۶﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ؕ﴿۷﴾

(۹۸) سُورۃُ البینۃ

آیات ۸

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ اہل کتاب ۱ اور مشرکین میں سے ۲ جنہوں نے کفر کیا ۳ وہ باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس واضح دلیل نہ آجاتی۔ ۴

۲ (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے ۵ پڑھ کر سنائے۔

۳ جن میں درست احکام لکھے ہوئے ہوں ۶

۴ جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی وہ واضح ہدایت آجانے کے بعد ہی تفرقہ میں پڑ گئے۔ ۷

۵ حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں۔ ۸ دین کو اس کے لئے خالص کر کے ۹ ، راست روی کے ساتھ ۱۰ اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ ۱۱ یہی صحیح دین ہے۔ ۱۲

۶ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جنہوں نے کفر کیا۔ ۱۳ وہ جہنم کی آگ میں پڑیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہ لوگ بدترین مخلوق ہیں۔ ۱۴

۷ یقیناً جو لوگ ایمان لائے ۱۵ اور جنہوں نے نیک عمل کئے وہ بہترین مخلوق ہیں۔ ۱۶

۱؎ اہل کتاب سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں جن کے پاس اللہ کی کتاب۔تحریف شدہ شکل میں سہی موجود تھی۔اور جہاں تک اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید کا تعلق ہے آج بھی تورات، زبور اور انجیل میں یہ نمایاں طور سے موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تحریف کی وجہ سے اس میں شرک کی آمیزش بھی ہوگئی ہے۔لیکن چونکہ یہود اور نصاریٰ اصلاً توحید کو مانتے تھے۔اور شرک انکے اندر باطل تاویلات کے نتیجہ میں آ گیا تھا وہ آخرت اور سلسلۂ رسالت کو بھی تسلیم کرتے تھے۔اس لئے قرآن نے اس گروہ کیلئے اہل الکتاب کی اصطلاح استعمال کی۔اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے کے سلسلہ میں مخصوص شرعی احکام بھی دئے مثلاً یہ کہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جاسکتا ہے اور ان کا ذبیحہ اگر شرعی طریقہ پر ہو، کھایا جاسکتا ہے۔

رہے دوسرے اہل مذاہب تو چونکہ ان بنیادی عقائد کے سلسلہ میں ان کے تصورات بہت مختلف تھے اور ان کے پاس کوئی آسمانی کتاب اس شکل میں بھی موجود نہیں تھی۔جس شکل میں کہ تورات و انجیل یہود و نصاریٰ کے پاس موجود تھی اس لئے ان دو گروہوں کے علاوہ کسی بھی مذہبی گروہ کو قرآن نے اہل کتاب قرار نہیں دیا۔حتیٰ کہ بنی اسمٰعیل، قریش مکہ کو بھی جو ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے اور جن کے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے بعض اجزاء مثلاً طواف کعبہ، حج وغیرہ موجود تھے اہل کتاب میں شامل نہیں کیا۔اور صریح بت پرستی میں مبتلا ہونے کے وجہ سے ان کے لئے مشرکین کی اصطلاح استعمال کی۔اسی طرح مجوسیوں کو باوجودیکہ ان کے پاس مذہبی کتاب تھی'' اہل کتاب'' قرار نہیں دیا۔اس سے واضح ہوا کہ'' اہل کتاب'' کی اصطلاح یہود و نصاریٰ کے لئے خاص ہے۔اور اس حکم کا اطلاق کسی دوسرے مذہبی گروہ پر نہیں کیا جاسکتا اگر چہ اس کے پاس کوئی مذہبی کتاب ہو۔

۲؎ مشرکین یعنی اللہ کا شریک ٹھہرانے والے۔یہاں یہ لفظ عرب کے بت پرستوں کے لئے بطور اصطلاح استعمال ہوا ہے۔

۳؎ یہاں کفر سے مراد وہ کفر ہے جس کے ساتھ ہٹ دھرمی بھی ہو۔جیسا کہ بعد کے فقرہ'' باز آنے والے نہ تھے'' سے واضح ہے۔ایسے ہٹ دھرم کافر اہل کتاب میں بھی تھے اور مشرکین میں بھی۔مشرکین کا کفر تو واضح ہی ہے کہ انہوں نے توحید کو چھوڑ کر بت پرستی کا طریقہ اختیار کیا تھا۔وہ آخرت کے بھی منکر تھے اور سلسلۂ رسالت کے بھی۔ رہے اہل کتاب تو ان کے کفر کی مختلف صورتیں تھیں۔مثلاً کوئی حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا قرار دیتا تھا تو کوئی حضرت عیسیٰ کو، کوئی تو حضرت عیسیٰ کی رسالت ہی کا منکر تھا اور کسی کے نزدیک وہ کفارہ بن گئے۔(یعنی عیسائیوں کے گناہوں کی معافی کا ذریعہ بن گئے)

۴؎ واضح دلیل سے مراد ایک نئے رسول کی آمد ہے جیسا کہ بعد والی آیت میں بیان ہوا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کفر میں شدید تھے ان کے کفر کے ٹوٹنے کی اگر کوئی صورت ہوسکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ ایک نئے رسول کی آمد ہو۔گویا ایک نئے رسول کی آمد حالات کا اقتضاء تھا اور اس ضرورت کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے پورا کر دیا ہے۔اس کے بعد بھی اگر کوئی ہٹ دھرمی میں مبتلا رہتا ہے تو اس کے جرم کی سنگینی اور

بڑھ جاتی ہے۔

۵ صحیفے یعنی لکھے ہوئے اوراق۔ پاک صحیفوں سے مراد کتاب الٰہی کے اوراق ہیں جو خالصۃً اللہ کے کلام پر مشتمل ہوں اور ہر قسم کی تحریف اور باطل عقائد اور اخلاقی گندگی کی آمیزش سے پاک ہوں۔

آج جو لوگ مذہب بیزار ہیں وہ بائبل اور دوسری ''مقدس'' کتابوں کا مطالعہ کریں تو ان میں پائی جانے والی گمراہیوں، خدا کے بارے میں گھٹیا تصورات، انبیاء کی طرف منسوب غیر اخلاقی باتوں، بے سروپا روایتوں، لغو قصوں اور رسومات کی جکڑ بندیوں کو دیکھ کر ان کی مذہب بیزاری میں اضافہ ہی ہوگا۔ اس مذہب بیزاری کو اگر کوئی کتاب دور کر سکتی ہے تو وہ قرآن ہی ہے، جو نہ صرف ان تمام خرابیوں سے پاک ہے بلکہ ساتھ ہی اعلیٰ درجہ کی اور نہایت حکیمانہ تعلیمات پر مشتمل ہے۔

۶ اپنی طرف سے باتیں گڑھ کر خدا کی طرف منسوب کرنا اور ان کو ''مقدس'' کتابوں میں شامل کرنا مذہب کا ناجائز انتفاع (Exploitation) کرنے والوں کا شیوہ رہا ہے۔ اور اس کی مثالیں بائبل اور دوسری مذہبی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان ''مقدس'' کتابوں کا یہ حال دیکھ کر ایک ایسی کتاب کی ضرورت ابھر کر سامنے آتی ہے جن میں اللہ کے احکام صحیح شکل میں موجود ہوں۔ اور ایسی ٹھوس باتیں ہوں جو انسانی زندگی کے لئے صحیح منزل کا تعین کر سکیں اور اس کو صحیح رخ پر ڈال سکیں۔ قرآن ہی وہ کتاب ہے جو اس معیار پر پوری اترتی ہے اور انسان کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے۔

۷ یعنی اہل کتاب کے فرقوں میں بٹ جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس اللہ کی ہدایت واضح طور پر نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کی وجہ ہدایت خداوندی سے بے اعتنائی، خواہشات کے پیچھے چلنا اور نفسانیت ہے۔ ورنہ انہیں جو کتاب دی گئی تھی اس میں اللہ کی روشن ہدایت موجود تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ گمراہ ہوتے اور الگ الگ فرقوں میں بٹ جاتے۔

واضح رہے کہ اہل کتاب دو بڑے فرقوں میں بٹ گئے۔ یہود اور نصاریٰ۔ اور ان دونوں نے الگ الگ مذہب کی شکل اختیار کر لی۔ نیز ان کے اندر ذیلی فرقے بھی بکثرت پیدا ہو گئے۔ مثلاً عیسائیوں میں کیتھولک، پروٹسٹنٹ وغیرہ۔

۸ یعنی انہیں خدائے واحد کی پرستش اور بندگی کا حکم دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے اس اولین ہدایت ہی کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ یہود کو بت پرستی میں بھی باک نہ ہوا۔ اور حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا بنا بیٹھے۔ اور نصاریٰ نے ایک کی جگہ تین خدا بنا لئے۔ نیز دونوں گروہوں نے اپنے فقہاء اور مشائخ کو رب بنا لیا کہ وہ جس چیز کو چاہیں حرام قرار دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال۔

۹ یہاں ''دین'' کے معنیٰ اس اطاعت کے ہیں جو خضوع کے ساتھ ہو، نیز مطلق اور غیر مشروط ہو۔ خالق و مالک ہونے کی حیثیت سے اس اطاعت کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اس لئے یہ اطاعت خالصۃً اسی کے لئے ہونی چاہئے۔

اس کی ہدایت سابقہ کتابوں میں بھی دی گئی تھی اور قرآن میں بھی دی گئی ہے۔

خدائے واحد کی عبادت کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے ساتھ "دین" کو اس کے لئے خالص کرنے کا مطالبہ، اسلام میں عبادت کی نوعیت کو بخوبی واضح کرتا ہے اور وہ ہے پرستش کے ساتھ اطاعت کا امتزاج۔ بالفاظِ دیگر اسلام میں خدائے واحد کی پرستش اس طور سے مطلوب ہے کہ آدمی اس کی غیر مشروط اطاعت کرنے کے لئے دل سے آمادہ ہو اور اس مستقل بالذات اطاعت کو اللہ کے لئے مختص کردے۔ اس اطاعت میں اللہ کی شریعت اور اس کا پورا دین شامل ہے۔

۱۰؎ راست روی کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو دل کا میلان غیر اللہ کی پرستش کی طرف ہو اور نہ اس کی عبادت میں وہ بدعات کو شامل کرے۔ بلکہ یکسوئی کے ساتھ اللہ کی عبادت اس طریقہ پر کرے جو طریقہ کہ اللہ نے عبادت کے لئے مقرر کیا ہے۔ چونکہ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ یہی تھا اس لئے حنیفیت طریقۂ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے۔

۱۱؎ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم اہل کتاب کو دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے نماز کو ضائع کردیا۔ یہاں تک کہ تورات سے یہ حکم ہی غائب کردیا۔ البتہ زکوٰۃ کے احکام کسی نہ کسی شکل میں اب بھی بائبل میں موجود ہیں۔

۱۲؎ یعنی دین حق کی یہ بنیادی تعلیمات ہیں۔ یہی دین اہل کتاب کو دیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے ان بنیادی تعلیمات کو کھو دیا اور کھوکھلی دینداری کو لے کر بیٹھ گئے۔ اس معیار پر دوسرے مذاہب کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔

۱۳؎ یہاں کفر سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور قرآن کو اس کی نازل کردہ کتاب ماننے سے انکار کرنا ہے۔

۱۴؎ جو مخلوق اپنے خالق سے کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کرے اس کے بدترین مخلوق ہونے میں شبہہ کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟ معلوم ہوا کہ کفر کے نتیجہ میں انسان جوہرِ انسانیت کھو بیٹھتا ہے اور بجائے ارتقاء کے تنزل کے آخری گڑھے میں جا گرتا ہے۔

۱۵؎ ایمان لانے کے مفہوم میں توحید کے علاوہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور قرآن کو اس کی نازل کردہ کتاب تسلیم کرنا بھی شامل ہے۔

۱۶؎ معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح کے نتیجہ میں جوہرِ انسانیت کھلتا ہے اور وہ حقیقی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرتا ہے۔

جو مخلوق ہر قسم کی شیطانی ترغیبات کے علی الرغم اور ہر قسم کی آزمائشوں سے گذرنے کے باوجود قائم ہے اور اس کی وفادار اور اطاعت شعار بن کر رہے اس کے بہترین مخلوق ہونے میں شبہہ کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝

۸ ان کی جزا ان کے رب کے پاس جاودانی باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی۔ وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی! یہ (جزا) اس کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرے ۔ ۱۸

۱۷؎ اللہ کی رضا سب سے بڑا انعام ہے جس سے اہل ایمان نوازے جائیں گے۔ جنت اللہ تعالیٰ کی رضا کا مظہر ہوگی اور وہاں ظاہری نعمتوں کے ساتھ ساتھ یہ باطنی نعمت بھی اہل ایمان کو نصیب ہوگی۔

۱۸؎ اپنے رب سے ڈرنا دین کی اصل روح ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ روح موجود ہوتی ہے۔ ان کے اندر صحیح دینداری ہوتی ہے اس بنا پر وہ اس جزاء کے مستحق ہوتے ہیں جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

صُحُفًا مُّطَهَّرَةً

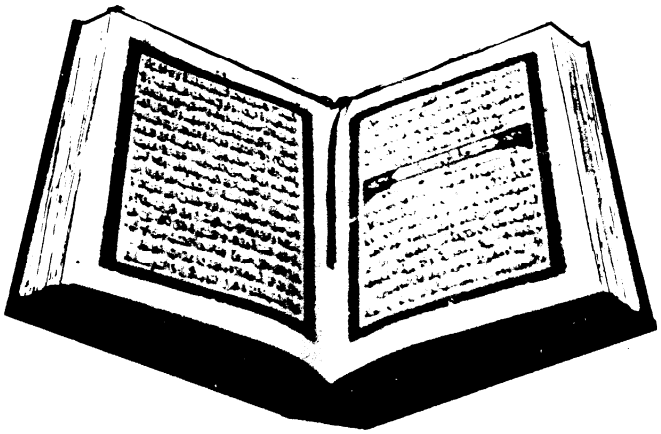

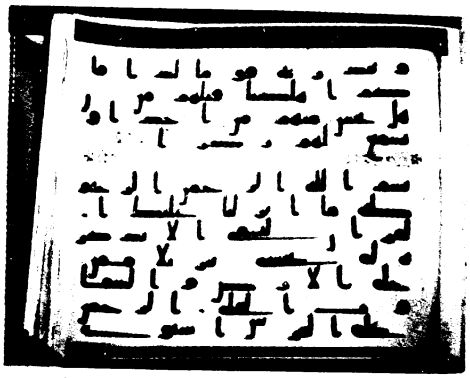

▲ صورة لمصحف عثمان بن عفان رضي الله عنه

(۹۹) الزلزالُ

نام پہلی آیت میں قیامت کے دن زمین کے ہلائے جانے کا ذکر ہوا ہے اور اس سلسلہ میں لفظ زلزال آیا ہے جس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام الزلزال ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون قیامت کے دن انسان کا اٹھ کھڑا ہونا ہے تا کہ اس کے اعمال کا پورا کچا چٹھا اس کے سامنے رکھا جائے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں زمین کی اس کیفیت کا ذکر ہے جو قیامت کے دن اس پر طاری ہوگی۔ اور جس کو دیکھ کر انسان ششدر رہ جائے گا۔

آیت ۴ اور ۵ میں بتایا گیا ہے کہ اس روز زمین بول پڑے گی اور اپنی داستان سنائے گی۔ تا کہ انسان اس کی پیٹھ پر جو کچھ کرتا رہا ہے اس کی تاریخی شہادت سامنے آجائے۔

آیت ۶ تا ۸ میں بتایا گیا ہے کہ اس روز لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں، اعمال کی پیشی کے لئے نکل پڑیں گے۔ اور کوئی چھوٹی سے چھوٹی بھلائی یا برائی ایسی نہیں ہوگی جو اس کے سامنے نہ آجائے ۔

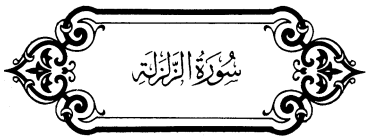

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ①

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ②

وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ③

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ④

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ⑤

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ
اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ⑥

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ⑦

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ⑧

(۹۹) سُورۃُ الزلزال

آیات ۸

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلادی جائے گی۔ ۱

۲ اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔ ۲

۳ اور انسان کہے گا کہ اسے کیا ہوگیا ہے! ۳

۴ اس روز وہ اپنی خبریں سنائے گی۔ ۴

۵ کیوں کہ تمہارے رب نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ ۵

۶ اس روز لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں نکلیں گے، تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھادئے جائیں۔ ۶

۷ تو جس نے ذرہ برابر بھلائی کی ہوگی اس کو دیکھ لے گا۔

۸ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ ۷

۱؎ یہ قیامت کے دوسرے مرحلہ کا ذکر ہے۔ جبکہ تمام مرے ہوئے انسان زندہ ہو کر نکل پڑیں گے، جیسا کہ آگے کے مضمون سے واضح ہے۔

اس روز پورا کرۂ ارض اس شدت کے ساتھ ہلایا جائے گا کہ اس ہلائے جانے کا صحیح تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زمین پر جتنے بھی زلزلے آئے ہوں، قیامت کا زلزلہ اتنا عظیم ہوگا کہ بڑے سے بڑا زلزلہ بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ ہوگا۔

۲؎ مراد مردے ہیں جن کو زمین قیامت کے دن اُگل دے گی۔ گویا مُردے زمین کے لئے بوجھ ہیں جن سے وہ خالی ہوا چاہتی ہے۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم مٹی میں جوں جاتا ہے۔ وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ یہ امانت بن کر زمین کے پاس رہتا ہے۔ خواہ کیمیائی طور پر (Chemically) اس نے کسی بھی مادہ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ اور یہ امانت اپنی اصل شکل میں قیامت کے دن زمین حاضر کر دے گی۔ یعنی انسانی جسم کے اعضاء کیمیائی تغیرات سے گذرنے کے بعد اپنی اصل ہیئت میں پھر ظاہر ہو جائیں گے۔

بوجھ باہر نکالنے کے مفہوم میں وہ شہادتیں بھی شامل ہیں جو زمین میں مدفون ہیں۔ (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ انشقاق نوٹ ۴؎)

۳؎ یعنی انسان قبر سے نکلتے ہی بدحواسی کے عالم میں پکار اٹھے گا کہ زمین کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ وہ جھٹکے پر جھٹکے لے رہی ہے اور ایک زبردست حادثہ سے دوچار ہے۔ زمین کی یہ حالت دیکھ کر انسان اوّل تو حیران و پریشان ہوگا۔ اس کے بعد اس پر یہ بات ظاہر ہوگی کہ یہ قیامت کا دن ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے ایمان میں مخلص ہیں ان پر قیامت کی کوئی گھبراہٹ طاری نہیں ہوگی۔

۴؎ یعنی زمین اپنی ساری سرگزشت سنائی گی کہ انسان نے جسے زمین میں خلیفہ بنایا گیا تھا، اس پر کس طرح کے تصرفات کئے۔ کون زمین کے خالق کے آگے سجدہ ریز ہوا، اور کون بھومی پوجا کرتا رہا، کس نے دھرتی پر مسجد بنائی اور کس نے مندر، کس نے رفاہ عامہ کے ادارے قائم کئے اور کس نے سنیما گھر، کس نے دینی اجتماعات منعقد کئے اور کس نے ناچ رنگ کی مجلسیں سجائیں، کون انسانیت کے امن و امان کے لئے دوڑ دھوپ کرتا رہا اور کون بستیوں کو اجاڑنے کے لئے بم برساتا رہا، کون اصلاح کا کام کرتا رہا اور کس نے فسادات برپا کئے، جنگیں کن لوگوں نے لڑیں، کب لڑیں، کس میدان میں لڑیں اور کن اغراض کے لئے لڑیں۔ غرض زمین گذرے ہوئے تمام واقعات اس طرح سنائے گی جیسے ہر واقعہ جو زمین پر رونما ہوا تھا ٹیپ کر لیا گیا تھا اور قیامت کے دن یہ پورا ریکارڈ انسان کو سنایا جائے گا۔ تاکہ وہ زمین پر جو کچھ کرتا رہا ہے اس کا ثبوت فراہم ہو اور انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور پوچھا جانتے ہو زمین کیا خبریں سنائے گی؟ لوگوں نے کہا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا وہ ہر بندے اور بندی کے بارے میں گواہی دے گی کہ اس نے یہ اور یہ کام فلاں اور فلاں دن اس کی پیٹھ پر کئے تھے۔ (ترمذی ابواب تفسیر القرآن)

۵ یہ سوال ذہن میں پیدا ہوسکتا ہے کہ زمین تو جمادات میں سے ہے پھر وہ انسانی اعمال کی سرگزشت کس طرح سنائے گی؟ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بول پڑے گی۔ قرآن میں دوسرے مقام پر یہ صراحت ہے کہ قیامت کے دن مجرموں کی کھالیں بھی اس کے خلاف گواہی دیں گی۔ اور وہ جب تعجب سے پوچھیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی تو کھالیں جواب دیں گی، کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویائی بخشی اس نے ہمیں بھی گویا کر دیا۔ (حم سجدہ: ۲۱)

گویا جو چیزیں ہمارے تجربہ میں غیر ناطق ہیں ان کے ناطق ہونے کا مشاہدہ ہم قیامت کے دن کریں گے۔ اور جو ہستی مٹی سے انسان بنا کر کھڑا کر سکتی ہے اس کے لئے مٹی میں گویائی کی صفت پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ جب ہم اپنی صدائے بازگشت گنبدوں سے اسی دنیا میں سن سکتے ہیں تو قیامت کے دن جب کہ ایک نیا نظام قائم ہوگا اپنی ان باتوں کی جو دنیا میں کرتے رہے ہیں صدائے بازگشت سننا کیوں ناممکن ہے؟ اور ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر اور فوٹوگرافی جیسی ایجادات کے اس دور میں تو یہ بات محتاج دلیل ہی محتاج نہ رہی کہ انسان کی تمام حرکات وسکنات ذرہ ذرہ پر ثبت ہو رہی ہیں۔

۶ یعنی قیامت کے دن لوگ زمین کے مختلف گوشوں سے مختلف حالت میں گروہوں کی شکل میں نکلیں گے تاکہ میدان حشر میں جمع ہو جائیں۔ اور وہاں انہیں ان کے اعمال دکھا دئے جائیں۔ قیامت تک جتنے انسان بھی پیدا ہوئے اور مرے خواہ کوئی زمین میں دفن ہوا ہو یا سمندر میں غرق ہوا ہو، کسی کی لاش جلا دی گئی ہو، یا فضا میں تحلیل ہوگئی ہو، قیامت کے دن سب کے سب زمین سے نکل پڑیں گے۔ تاکہ وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا نتیجہ ان کے سامنے آئے؟ ''تاکہ انہیں ان کے اعمال دکھا دئے جائیں'' سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے اس کی عملی زندگی کے مناظر پیش کئے جائیں گے۔

۷ یعنی قیامت کے دن ہر شخص کو جو اس کی قولی وعملی زندگی کا مشاہدہ کرایا جائیگا۔ تو وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی نیکی اور چھوٹی سے چھوٹی بدی کو دیکھ لے گا۔ رہا جزا وسزا کا معاملہ تو وہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان قاعدوں کے مطابق ہوگا جن کی صراحت قرآن میں دوسرے مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ کامیاب ہونگے یا یہ کہ کافروں کے اعمال بے وزن قرار پائیں گے یا یہ کہ شرک ناقابل معافی گناہ ہے اور کافروں کے لئے ابدی جہنم کی سزا ہے وغیرہ۔

(۱۰۰) العٰدیات

نام پہلی آیت میں العٰدیات (دوڑنے والے گھوڑوں) کی قسم کھائی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''العٰدیت'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت کے پہلے مرحلہ میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون خدا کے حضور جوابدہی سے غفلت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے جو انسان کو خدا کا ناشکر گزار بناتا ہے اور اس کی بخشی ہوئی نعمتوں اور قوتوں کے غلط استعمال پر اسے آمادہ کرتا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں جنگی گھوڑوں کو اس بات کی شہادت میں پیش کیا گیا ہے کہ انسان خدا کی عطاء کردہ قوتوں کا کتنا غلط استعمال کرتا ہے۔

آیت ۶ تا ۸ میں انسان کو خدا کا ناشکر گزار ہونے اور اُس کے مال کی محبت میں گرفتار ہونے پر ملامت کی گئی ہے۔

آیت ۹ تا ۱۱ میں انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اسے قیامت کے دن قبر سے اٹھا کھڑا کیا جائے گا اور اسے خدا کے حضور حاضر ہونا ہوگا۔اس روز انسان کے باطن کا حال کھل کر سامنے آجائے گا اور وہ محسوس کرے گا کہ کوئی بات بھی، حتیٰ کہ اس کی وہ نیتیں اور ارادے بھی اللہ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں جو دنیا میں مختلف کاموں کو انجام دیتے ہوئے اس نے اپنے دل میں چھپائے رکھے تھے۔

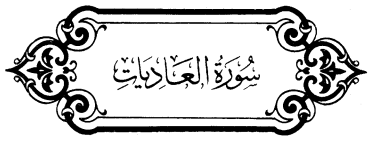

(۱۰۰)سُورۃ العٰدیات

سُورَةُ العَادِيَاتِ

آیات ۱۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

وَالۡعٰدِيٰتِ ضَبۡحًا ۙ﴿۱﴾	۱ قسم ہے ۱ دوڑنے والے گھوڑوں کی ۲ جو ہانپ اٹھتے ہیں۔ ۳
فَالۡمُوۡرِيٰتِ قَدۡحًا ۙ﴿۲﴾	۲ جو ٹاپ مار کر چنگاریاں جھاڑتے ہیں۔ ۴
فَالۡمُغِيۡرٰتِ صُبۡحًا ۙ﴿۳﴾	۳ جو صبح کے وقت دھاوا مارتے ہیں ۔ ۵
فَاَثَرۡنَ بِهٖ نَقۡعًا ۙ﴿۴﴾	۴ اور اس تگ ودو سے غبار اڑاتے ہیں ۔ ۶
فَوَسَطۡنَ بِهٖ جَمۡعًا ۙ﴿۵﴾	۵ اور اس حالت میں غول میں جا گھستے ہیں۔ ۷
اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوۡدٌ ۚ﴿۶﴾	۶ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔ ۸
وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيۡدٌ ۚ﴿۷﴾	۷ اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔ ۹
وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الۡخَيۡرِ لَشَدِيۡدٌ ؕ﴿۸﴾	۸ اور وہ مال کی محبت میں بہت سخت ہے۔ ۱۰
اَفَلَا يَعۡلَمُ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِى الۡقُبُوۡرِ ۙ﴿۹﴾	۹ تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ ہے اسے باہر نکال لیا جائے گا ۱۱
وَحُصِّلَ مَا فِى الصُّدُوۡرِ ۙ﴿۱۰﴾	۱۰ اور سینوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اس کو نکال کر پرکھا جائے گا۔ ۱۲
اِنَّ رَبَّهُمۡ بِهِمۡ يَوۡمَٮِٕذٍ لَّخَبِيۡرٌ ﴿۱۱﴾	۱۱ یقیناً ان کا رب اُس روز اُن سے اچھی طرح باخبر ہوگا۔ ۱۳

۱ قسم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ تکویر نوٹ ۱۴ ۔

۲ مراد جنگی گھوڑے ہیں جو سرپٹ دوڑتے ہیں۔نزول قرآن کے زمانہ میں گھوڑے بڑی جنگی اہمیت کے حامل تھے۔

۳ گھوڑوں کا ہانپ اٹھنا اور ہانپنے کے باوجود اپنی دوڑ جاری رکھنا،اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر زبردست طاقت رکھی ہے۔

۴ یعنی جب جنگ یا غارتگری کے لئے گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں تو وہ ایسی سرگرمی دکھاتے ہیں کہ ان کی ٹاپوں سے چنگاریاں جھڑنے لگتی ہیں۔یہ چنگاریاں گھوڑوں کی سموں کے تیزی کے ساتھ پتھریلی زمین سے ٹکرانے کے نتیجہ میں نکلتی ہیں اور رات کی تاریکی میں دکھائی دیتی ہیں۔

گھوڑوں کا چنگاریاں جھاڑتے ہوئے بگ ٹٹ چلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک زبردست طاقت انسان کے طابع کر رکھی ہے۔

۵ عربوں کا قاعدہ تھا کہ جب وہ کسی قبیلہ یا بستی پر حملہ کرنا چاہتے تو رات کو گھوڑے دوڑاتے اور علی الصبح حملہ آور ہوتے۔رات کو اس لئے حملہ نہیں کرتے تھے کہ رات کی تاریکی میں لڑنا مشکل تھا اور صبح کو اس لئے حملہ آور ہوتے کہ دشمن پر انہیں اچانک ٹوٹ پڑنے کا موقع ملتا۔

۶ یعنی یہ گھوڑے اس برق رفتاری سے دوڑتے ہیں کہ گرد وغبار کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور جب یہ حملہ آور ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ گرد وغبار کی ایک آندھی لئے ہوئے ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ عربستان کا علاقہ ریگستانی ہے اور نزول قرآن کے زمانہ میں پختہ سڑکیں بھی نہیں تھیں۔اس لئے گھوڑوں کی دوڑ سے جو گرد وغبار اٹھتا ہوگا اس کو دیکھ کر لوگ دور ہی سے اندازہ کر لیتے ہوں گے کہ یہ غارتگری کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔

۷ یعنی غول میں گھس کر تباہی مچاتے ہیں۔

ان آیات میں عربوں کے ان حملوں کی تصویر پیش کی گئی ہے جو لوٹ مار اور غارت گری کی غرض سے وہ کیا کرتے تھے۔ایک قبیلہ جب دوسرے قبیلہ پر چڑھائی کرتا تو اس کے لئے گھوڑے استعمال کئے جاتے۔یہ گھوڑے رات کی تاریکی میں چنگاریاں جھاڑتے ہوئے نکلتے اور علی الصبح گرد وغبار کی آندھی اٹھائے ہوئے بستی پر حملہ آور ہوتے اور مدافعت کرنے والوں کے مجمع میں جا گھستے۔اس کے بعد لوٹ مار کی گرم بازاری ہوتی اور عورتوں اور مردوں کو پکڑ کر لونڈی اور غلام بنا لیتے۔اس چیز نے عرب کے علاقہ میں بدامنی کی فضا پیدا کر دی تھی اور بستیوں پر یہ خطرہ منڈلاتا رہتا تھا کہ معلوم نہیں کون قبیلہ کس بستی پر کب حملہ آور ہو۔

قرآن نے اس ظلم وستم کا احساس دلانے کے لئے غارت گری کی اس مہم کی تصویر پیش کر دی،جس میں تیز رفتار گھوڑوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔یہ ایسی ہی بات ہے جیسے آج باطل مقاصد کے لئے لڑی جانے والی جنگوں میں جو تیز رفتار طیارے استعمال کئے جاتے ہیں۔اور ان کے ذریعہ جو بمباری کی جاتی ہے اور شہروں اور بستیوں کو جس طرح تباہ کیا جاتا ہے اس کی تصویر الفاظ میں کھینچ لی جائے۔تاکہ ان ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف انسانیت کو جھنجوڑا جا سکے۔

۸ یہ وہ بات ہے جس کا احساس دلانے کے لئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم کھائی گئی ہے۔مطلب یہ ہے کہ تیز رفتار گھوڑے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں اور زبردست جنگی اہمیت کے حامل ہیں۔لیکن ان کو غلط اغراض

اور ظالمانہ کارروائیوں کے لئے استعمال کرنا اس نعمت کی ناقدری اور اپنے رب کی بڑی ناشکری ہے:

موجودہ دور میں ایٹمی توانائی کا انکشاف انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور اس نعمت کا شکر وہ اسی صورت میں ادا کرسکتا ہے جب کہ وہ اس توانائی کو تعمیری کاموں کیلئے استعمال کرے۔ لیکن اگر وہ تخریبی کاموں مثلاً ایٹم بم بنانے اور اس کو بڑے بڑے شہروں کو تباہ کرنے اور انسانیت پر ظلم ڈھانے کیلئے استعمال کرتا ہے تو یہ اس نعمت کی صریح ناقدری اور اس کے عطاء کرنے والے کی بڑی ناشکری ہوگی۔

۹ یعنی انسان کا یہ ناشکرا پن محتاج دلیل نہیں ہے۔ اس کا ضمیر خود اس پر بہت بڑا گواہ ہے۔ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کے ناجائز استعمال کیلئے کتنے ہی بہانے بنائے اس کی فطرت اندر سے ضرور پکار اٹھے گی کہ اس نے یہ غلط حرکت کی ہے۔ کتنے ہی انسان اعلانیہ اپنے پروردگار کے خلاف ناشکری کا اظہار کرتے ہیں، وہ اپنی ناشکری پر خود حجت ہیں۔

۱۰ یعنی انسان کو خدا سے زیادہ مال و دولت سے محبت ہے۔ وہ خدا پرست بننے کے بجائے زر پرست بن جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حصول مال کے لئے کشت وخون اور غارت گری تک کرنے سے نہیں رکتا۔

واضح رہے کہ قرآن مال کی محبت کو جو مذموم قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدا سے زیادہ مال کو محبوب رکھے، آخرت کو مقصود قرار دینے کے بجائے دنیا کی دولت کو مقصود قرار دے۔ حصول مال میں جائز اور ناجائز اور حلال وحرام کی تمیز نہ کرے۔ اور بندگان خدا کی حق ماری اور ان کی املاک پر غاصبانہ قبضہ کرنے میں بھی اسے دریغ نہ ہو۔ یہ زر پرستی ہر زمانہ میں موجود رہی ہے اور اس کا نیا روپ موجودہ زمانہ کی سرمایہ پرستی ہے۔

۱۱ یعنی تمام مرے ہوئے انسانوں کو زندہ اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو سورۂ زلزال نوٹ ۲ اور ۶) یہاں سوال بطور تنبیہ کے ہے کہ انسان لوٹ کھسوٹ اس لئے کرتا ہے اور زر پرستی میں اس لئے مبتلا ہوتا ہے کہ اسے نہ اپنے دوبارہ زندہ کئے جانے کا یقین ہے اور نہ خدا کے حضور جوابدہی کا احساس۔ حالانکہ یہ مرحلہ لازماً پیش آنا ہے۔

۱۲ یعنی قیامت کے دن صرف ظاہری اعمال ہی کو نہیں دیکھا جائے گا جو دنیا میں انسان کرتا رہا ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے جو جذبات، ارادے، نیتیں، اغراض اور محرکات رہے ہیں ان کو بھی دیکھا اور پرکھا جائے گا۔ تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں اور اس کے بعد ہی جزا یا سزا کا فیصلہ سنایا جائے گا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے سینہ کے جس بھید کو ظاہر کیا جائے گا وہ ایمان یا کفر ہوگا۔ یعنی کس کے دل میں ایمان تھا اور کس کے دل میں کفر؟ جو لوگ اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے رہے لیکن دلوں میں کفر کو چھپائے ہوئے تھے، ان کے سینوں سے اس روز کفر ہی برآمد ہوگا۔ اسی طرح جن لوگوں نے نیکی اور بھلائی کے کام کسی غلط مقصد یا ناجائز محرکات کے تحت کئے ہوں گے تو ان کی حقیقت بھی آشکارا ہو جائے گی۔ اور جو لوگ غلط کام کرکے ان کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگ باور کریں کہ انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، ان کی اغراض اور نیتیں بھی کھل کر سامنے آجائیں گی۔

۱۳ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ظاہر و باطن سے آج بھی باخبر ہے۔ لیکن قیامت کے دن ہر شخص پر یہ حقیقت کھل جائے گی اور وہ ماننے کے لئے مجبور ہوگا کہ واقعی اللہ تعالیٰ کو ہر شخص کے ظاہری اور باطنی حالات کا پورا پورا علم تھا۔ اور آج قیامت کے دن وہ جو فیصلہ بھی کر رہا ہے پوری طرح باخبر ہو کر ہی کر رہا ہے۔

(۱۰۱) القارعة

نام آیت ۱ میں قیامت کے عظیم حادثہ کو القارعة (کھڑکھڑانے والی آفت) سے تعبیر کیا گیا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''القارعة'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون قیامت کے عظیم حادثہ سے خبردار کرنا ہے۔اور اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ اس روز کامیابی وناکامی کے لئے معیار حسنِ عمل ہوگا۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۵ میں قیامت کی ہولناکی اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی صورت حال سے خبردار کیا گیا ہے۔

آیت ۶ اور ۷ میں ان لوگوں کا حسنِ انجام بیان کیا گیا ہے جن کے اعمال میزان عدل میں بھاری ہوں گے۔

آیت ۸ تا ۱۱ میں ان لوگوں کا انجام بد بیان کیا گیا ہے جن کے اعمال میزان عدل میں ہلکے ہوں گے۔

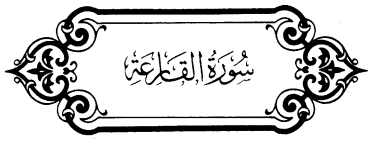

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ ۝١

مَا الْقَارِعَةُ ۝٢

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝٣

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝٤

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝٥

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٦

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝٧

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝٨

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝٩

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝١٠

نَارٌ حَامِيَةٌ ۝١١

(۱۰۱)سُورۃ القارعة

آیات ۱۱

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ وہ کھڑکھڑانے والی آفت۔ ۱

۲ کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی آفت ! ۲

۳ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کھڑکھڑانے والی آفت کیا ہے ؟ ۳

۴ وہ دن جب لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوں گے۔ ۴

۵ اور پہاڑ دھنکی ہوئی اُون کی طرح ہوجائیں گے ۔ ۵

۶ پھر جس کی میزان بھاری ہوگی۔ ۶

۷ وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔

۸ اور جس کی میزان ہلکی ہوگی ۔ ۷

۹ اس کا ٹھکانہ "ہاویہ" ہوگا۔ ۸

۱۰ اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے ؟

۱۱ دہکتی ہوئی آگ! ۹

۱؎ متن میں لفظ ''القارعۃ'' استعمال ہوا ہے جو قیامت کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ہے۔اس کے لفظی معنیٰ ہیں ٹھو نکنے والی، کھٹکھٹانے والی، کھڑ کھڑانے والی عظیم آفت ۔قیامت کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ظہور بہت بڑی آفت کی صورت میں ہوگا۔اور جس طرح کوئی رات میں آنے والا دروازے کو دستک دیتا ہے اور سونے والے یکا یک جاگ اٹھتے ہیں اسی طرح یہ آفت اچانک آئے گی جس کو دیکھ کر لوگ گھبرا اٹھیں گے۔

۲؎ یہ سوال اس لئے ہے تا کہ لوگ غفلت سے بیدار ہوں۔

۳؎ یہ سوال قیامت کی حقیقت اور اس کی ہولنا کی سے آگاہ کرنے کے لئے ہے۔یعنی اس آفت کو معمولی واقعہ خیال نہ کرو۔

قرآن قیامت کا ذکر جس وثوق کے ساتھ کرتا ہے اور اس کے جو احوال تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے وہ اس کی صداقت کی روشن دلیل ہے۔آج آسمانی کتابوں میں کوئی کتاب ایسی موجود نہیں ہے جو قیامت کا اتنا واضح تصور اس تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہو۔

۴؎ یعنی قیامت کے دن لوگ قبروں سے متفرق طور پر نکل پڑیں گے اور ان کے انتشار کا یہ حال ہوگا جیسے بکھرے ہوئے پتنگے۔اس انتشار کی تصویر سورۂ قمر میں اس طرح کھینچی گئی ہے :

خُشَّعاً اَبْصَارھُمْ یَخْرُجُوْنَ مِنَ اَجْدَاثِ کَاَنَّھُمْ جَرَادٌمُّنْتَشِرٌ (القمر۔۷)

''پست نگاہوں کے ساتھ قبروں سے اس طرح نکلیں گے کہ گویا وہ بکھری ہوئی ٹڈیاں ہیں۔''

انسان جب قبر سے اٹھے گا تو نہ اس کے ساتھ اس کا خاندان ہوگا اور نہ ذات برادری کے لوگ، بلکہ وہ اپنے کو ایک منتشر ہجوم اور ایک نئے ماحول میں پائے گا اور زمین وآسمان کو بدلا ہوا دیکھ کر اس پر سخت دہشت طاری ہوگی۔

۵؎ یعنی جس طرح دُھنکی ہوئی اُون ریشہ ریشہ ہو کر ہوا میں اُڑتی ہے اسی طرح یہ بڑے بڑے پہاڑ قیامت کے دن ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اڑ رہے ہوں گے۔اور جب ہمالیہ جیسے پہاڑ،اس روز اڑ رہے ہونگے تو کونسا قلعہ،کونسا محل اور کون سی عمارت ہے جو زمین پر باقی رہ سکے گی؟

منکرین قیامت کو اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ پہاڑ جیسی مضبوط چیز کو کیونکر اُکھاڑ پھینکا جا سکتا ہے؟ ان کا یہ تعجب خدا کی قدر کا صحیح اندازہ نہ کرنے کی بناء پر تھا۔ظاہر ہے جو خدا پہاڑوں کو پیدا کرنے اور ان کو زمین میں گاڑ دینے پر قادر ہے وہ ان کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑا دینے پر کیوں قادر نہ ہوگا؟ موجودہ سائنسی انکشافات کے دور میں تو ان باتوں کو سمجھنا بالکل آسان ہو گیا ہے۔اگر ایک ذرہ میں اتنی قوت ہے کہ اس کو توڑنے Splittig کے نتیجہ میں زبردست دھما کہ ہو سکتا ہے تو پہاڑوں کے ذرات کے توڑنے Splittig کے نتیجہ میں قیامت کیوں نہیں برپا ہو سکتی؟

۶؎ قیامت کے دن اعمال تولے جائیں گے اور ان کے تولنے کے لئے میزان (ترازو) قائم کی جائے گی۔اس میزان میں وہی اعمال وزنی قرار پائیں گے جو حق کی بنیاد پر انجام دئے گئے ہوں گے۔کیوں کہ قیامت کے دن وزن صرف حق کو حاصل ہوگا جیسا کہ سورۂ اعراف میں فرمایا ہے:

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ (الاعراف ۔۸) "وزن اس روز حق ہوگا"۔

اور کامیابی کے لئے شرط یہ ہوگی کہ یہ میزان بھاری ہو۔ اور کسی شخص کی میزان اسی صورت میں بھاری ہوگی جب کہ اس نے عملی زندگی حق کی بنیاد پر بسر کی ہوگی۔ اور جس شخص کی نیکیوں کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ یہ میزان بھاری ثابت ہوگی۔

اس میزانِ عدل کا تعلق احوال آخرت سے ہے اور عالم آخرت کے زمان و مکان اور وہاں کے پیمانے سب کچھ اس دنیا سے بہت مختلف ہوں گے۔ اس لئے ہم آخرت کی میزان عدل کی نوعیت کا پوری طرح اس دنیا میں اندازہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ہمیں قرآن کے اجمالی بیان پر اکتفا کرنا چاہئے۔

اعمال کے تولے جانے میں اگر حیرت کی کوئی بات تھی تو سائنس کی ایجادات نے اس کو بالکل ختم کر دیا ہے۔ کیوں کہ کیفیتوں کو ناپنے کے لئے مختلف قسم کے آلات ایجاد ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جسم کی حرارت کو جو ایک کیفیت ہی ہے تھرمامیٹر کے ذریعہ ناپا جاتا ہے۔ اسی طرح ہوا کے دباؤ کو معلوم کرنے کے لئے بیرومیٹر (Barometer) استعمال کیا جاتا ہے اور جب انسان کے لئے کیفیتوں کا ناپنا ممکن ہو گیا ہے تو زمین و آسمان کے خالق کے لئے اعمال کو تولنے والی میزان قائم کرنا کیا مشکل ہے؟

ے ہلکی میزان ان لوگوں کی ہوگی جنہوں نے باطل، کی بنیاد پر زندگی بسر کی تھی۔ ان کے اعمال خواہ وہ بظاہر کتنے ہی اچھے کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں آخرت کی میزان عدل میں بالکل بے وزن ہوں گے۔ کیوں کہ باطل سرے سے کوئی وزن ہی نہیں رکھتا۔ اسی طرح "سیئات" برائیوں کے لئے بھی عالم آخرت میں بے وزنی کی کیفیت ہوگی۔ آج جب کہ یہ بات مشاہدہ میں آرہی ہے کہ جو چیز زمین پر وزن رکھتی ہے وہ خلا میں بالکل بے وزن ہو جاتی ہے۔ یہ باور کرنا کیا مشکل ہے کہ باطل پرستوں کا "کارنامۂ حیات" دنیا والوں کی نظروں میں کتنا ہی وزنی اور شاندار رہا ہو، آخرت کی فضا میں وہ بالکل بے وزن ثابت ہوگا۔

۸ " ھاویہ " کے معنیٰ گہرے گڑھے اور کھڈ کے ہیں۔ یہ جہنم کا نام ہے اور اسے اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت گہری ہوگی۔ اور اس میں دوزخ والوں کو اوپر سے پھینک دیا جائے گا۔

۹ یعنی جہنم کا یہ عمیق گڑھا دہکتی ہوئی آگ سے بھرا ہوا ہوگا۔

جہنم کی وسعت، اس کی گہرائی اور اس کی غیر معمولی آگ کا حال سن کر کتنے ہی لوگ اسے ناقابل یقین خیال کرتے رہے ہیں۔ اور آج بھی کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ ان کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی ہے۔ ورنہ جہنم کا وجود ہرگز باعثِ حیرت نہیں۔ سورج کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ۲۷ ملین ڈگری فارن ہائیٹ، اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا، اور اس کا حجم زمین کے حجم سے تین لاکھ تینتیس ہزار گنا بڑا ہے۔ سورج دراصل گرم گیسوں (Highly heated gases) کا مجموعہ ہے جس میں زبردست مقناطیسی طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ سائنس کی فراہم کردہ ان معلومات سے سورج کی بے پناہ وسعت، اس کی بے اندازہ گہرائی اور اس کی زبردست حرارت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ گویا سورج دنیا میں جہنم کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اور اس کو دیکھتے ہوئے آخرت کی جہنم نہ صرف ممکن معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔

(۱۰۲) التکاثر

نام پہلی آیت میں تکاثر (مال ودولت کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی طلب) کو اصل مقصد حیات سے غفلت کا باعث قرار دیا گیا ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام "اَلتَّکَاثُرُ" ہے ۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دعوتی دور کے آغاز میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ مال ودولت اور دیگر دنیوی فوائد کے حصول میں ایسا انہماک، کہ عمریں اسی میں کھپ جائیں اور آخرت کی باز پرس کا خیال تک نہ آئے، بہت بڑی ناعاقبت اندیشی اور زبردست خسارہ کا سودا ہے۔

نظم کلام آیت ۱ اور ۲ میں ان لوگوں کو جھنجھوڑا گیا ہے جو دنیا کی دولت کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔اور اس کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی دھن ان پر ایسی سوار ہے کہ موت کے اس پار جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کا انہیں ہوش ہی نہیں۔

آیت ۳ تا ۵ میں متنبہ کیا گیا ہے کہ موت کے اس پار کیا ہے وہ تمہیں آنکھیں بند ہوتے ہی معلوم ہو جائے گا۔ اگر آج تمہیں اس کا یقین ہوتا تو اپنے مستقبل کی طرف غافل نہ ہوتے اور حصول دنیا کی یہ دُھن تم پر سوار نہ ہوتی۔

آیت ۶ تا ۸ میں خبردار کیا گیا ہے کہ جہنم کے وجود پر تم یقین کرو یا نہ کرو وہ دن آ کر رہے گا جب اسے تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔اس وقت تمہیں اس کے وجود کا پوری طرح یقین ہو جائے گا۔لیکن وہ وقت عمل کا نہیں بلکہ حساب دینے کا ہوگا اور تمہیں ہر ہر نعمت کے بارے میں خدا کے حضور جواب دہی کرنی ہوگی۔

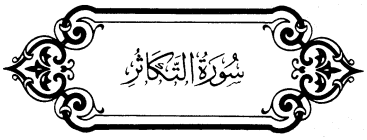

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۳﴾

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ؕ﴿۴﴾

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ؕ﴿۵﴾

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ﴿۶﴾

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ﴿۷﴾

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾

(۱۰۲)سُورۃ التکاثر

آیات ۸

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ مال و دولت کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی طلب نے تمہیں غفلت میں ڈال رکھا۔۱

۲ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔ ۲

۳ مگر نہیں عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔۳

۴ پھر سن لو! یہ دھن صحیح نہیں، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔۴

۵ ہرگز نہیں! اگر تم یقینی طور پر جان لیتے۔ ۵ (تو دنیا کے پیچھے نہ پڑتے)

۶ تم ضرور دوزخ کو دیکھ لو گے۔۶

۷ پھر تم اسے بالکل یقین کے ساتھ دیکھو گے۔ ۷

۸ پھر اس روز تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور باز پرس ہوگی۔۸

۱؎ یعنی تم لوگ مال و دولت کمانے، دنیا کے فائدے حاصل کرنے اور سامانِ عیش فراہم کرنے میں ایسے منہمک ہو کہ اصل مقصدِ حیات اور اپنی حقیقی منزل تمہاری نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔ تمہاری ساری تگ و دو کسبِ زر، اور حصولِ جاہ و اقتدار کے لئے ہوتی ہے۔ اس سے بلند ہو کر کچھ سوچنے کے لئے تم آمادہ ہی نہیں ہو۔

مال و دولت کی حرص اور دنیوی فوائد کے حصول میں انسان کا حد سے زیادہ انہماک، انسان کی وہ بنیادی کمزوری ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہا ہے۔ البتہ موجودہ دور میں اس نے کچھ ''ترقی یافتہ'' شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ چنانچہ زر پرستی نے سرمایہ پرستی کی اور دنیا پرستی نے مادہ پرستی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اگر انسان پہلے آخرت کا منکر تھا تو اب سرے سے خدا ہی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر پہلے اخلاقی قدروں کو پس پشت ڈال کر دنیوی فوائد حاصل کرتا تھا تو اب مفادِ دنیا کی خاطر اخلاقی اقدار سے بالکل عاری ہو گیا ہے۔ پھر موجودہ تمدنی ترقی کے زیرِ اثر ہر شخص کو اپنا معیارِ زندگی (Standard of life) بلند کرنے کی فکر ہے۔ اور معاشی اور اقتصادی میدان میں افراد اور قومیں ایک دوسرے سے آگے نکلنا چاہتی ہیں۔ لیکن معیارِ اخلاق بلند کرنے کی فکر کسی کو نہیں ہے، اور نہ کوئی یہ سوچنے کی زحمت گوارہ کرتا ہے کہ آیا دنیا زندگی کا آخری مرحلہ ہے، یا اس سے آگے بھی مراحل طے کرنا ہوں گے؟ اس اہم ترین سوال کی طرف توجہ نہ کر کے انسان اپنے مقصدِ حیات سے بہت دور جا پڑا ہے اور ایسی غفلت میں مبتلا ہے کہ اسے آگے پیچھے کی کچھ خبر نہیں۔

۲؎ یعنی زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے اور دنیا حاصل کرنے کی کوشش میں تم نے اپنی عمریں کھپا دیں۔ اور مرتے دم تک تمہیں یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ موت کے بعد جس چیز سے سابقہ پیش آنے والا ہے اس پر غور کرتے۔

انسان کی کثرت طلبی اور کبھی نہ ختم ہونے والی حرص پر اسے حدیث میں بڑے مؤثر انداز میں متنبہ کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغٰى ثَالِثاً وَ لَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابنِ آدَمَ اِلَّا التُّرابُ۔

(بخاری کتاب الرقاق)

''آدمی کے پاس اگر مال سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی تمنا کرے گا۔ آدمی کا پیٹ تو مٹی ہی بھر سکتی ہے۔''

''مٹی ہی بھر سکتی ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی حرص کا خاتمہ خاک میں مل جانے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

۳؎ یعنی عنقریب یہ حقیقت تم پر کھل جائے گی کہ مال و دولت کی کثرت اور دنیوی سروسامان کا وافر مقدار میں حاصل ہو جانا اصل کامیابی نہیں ہے۔ بلکہ اصل کامیابی اخروی نعمتوں کا حصول ہے۔ اس وقت تمہیں اپنی اس غلطی کا شدید احساس ہوگا کہ آخرت کو نظر انداز کر کے تم نے کتنے برے انجام کو دعوت دی ہے۔

۴؎ مضمون کی یہ تکرار تاکید کے لئے بھی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے بھی، کہ دنیا طلبی کی حقیقت پہلی مرتبہ تو موت کے آتے ہی سامنے آئے گی۔ اور دوسری مرتبہ قیامت کے دن ظاہر ہوگی۔

۵؎ یعنی قرآن جس دن کی خبر دے رہا ہے اس پر اگر تمہیں یقین ہوتا تو دنیا کے پیچھے پڑ کر غفلت کی زندگی ہرگز نہ گذارتے بلکہ اس دن کے لئے تیاری کرتے۔

۶؎ یعنی تم جہنم کے وجود کو اگر ماننا نہیں چاہتے تو نہ مانو، اس کا وجود بہرحال ایک حقیقت ہے۔ اور وہ دن لازماً آنا

ہے جبکہ وہ تمہارے سامنے آنمودار ہوگی اور تم اس کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کروگے۔

ے یعنی تمہارا جہنم کو دیکھنا خواب کی دنیا میں نہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں ہوگا۔آج جس چیز کو تم ناقابل یقین خیال کررہے ہو وہ کل جب تمہارے مشاہدہ میں آئے گی تو تمہیں اس کے وجود کا پوری طرح یقین ہو جائے گا۔

۸ نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ تمام نعمتیں شامل ہیں مثلاً سامان رزق، مال ودولت، اولاد قوتیں اور صلاحیتیں، ذرائع و وسائل، جاہ و منصب اور حکومت و اقتدار وغیرہ۔ دنیا میں انسان کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اپنے ساتھ ایک ذمہ داری بھی لاتی ہے۔اور وہ ذمہ داری یہ ہے کہ انسان اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرے اور اس کو ان کاموں میں استعمال کرے جو اللہ کو پسند ہیں۔ اس طرح اگر انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حق ادا کرتا ہے تو قیامت کے دن اس کے لئے جوابدہی کا معاملہ آسان ہوگا اور اپنے رب کی ابدی نعمتوں کا مستحق ٹھہرے گا۔لیکن اگر وہ سرے سے خدا کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا یا تسلیم تو کرتا ہے مگر یہ سمجھتا ہے کہ ان نعمتوں کو عطا کرنے والے بہت سے خدا ہیں یا فلاں نعمت فلاں دیوی یا دیوتا کی عطاء کردہ ہے۔اور اس فاسد عقیدہ کی بنا پر وہ ان نعمتوں کو اللہ کی پسند اور ناپسند سے آزاد ہو کر استعمال کرتا ہے تو قیامت کے دن اس سے سخت باز پرس ہوگی۔اور اس ناشکری اور مجرمانہ طرز عمل کی بنا پر وہ سخت سزا کا مستحق ہوگا۔

محل کلام کے لحاظ سے اس آیت کا اشارہ خاص طور سے مال ودولت کی نعمت کی طرف ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر تمہیں ضرور ہے۔لیکن اس سلسلہ میں جو جوابدہی کرنا ہوگی اس کا تمہیں بالکل خیال نہیں۔اگر خدا کے حضور جوابدہی کا احساس تم میں ہوتا تو مال ودولت کے حریص بننے کے بجائے قناعت پسند ہوتے کہ دولت جتنی وافر مقدار میں ملے گی حساب کے معاملہ اتنا ہی بڑھ جائے گا اور جوابدہی مشکل ہوگی۔واضح رہے کہ قیامت کے دن جوابدہی ہر کسی کو کرنا ہوگی خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر۔حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَاتَـزُوْلُ قَدَمَاعَبْدٍحَتّٰى يُسْأَ لَ عَنْ عُمرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ وَعَنْ عِلْمِهٖ فِيْمَا فَعَلَ وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اِكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَا اَنْفَقَهٗ وَ عَنْ جِسمِهٖ فِيْمَا اَبْلَاهُ (ترمذی ابواب الزهد)

" (قیامت کے دن) بندے کے قدم ہٹ نہ سکیں گے، جب تک کہ اس سے ان باتوں کے بارے میں پوچھ نہ لیا جائے گا: اس کی عمر کے بارے میں کہ کس چیز میں گذاری، اس کے علم کے بارے میں کہ کہاں تک اس پر عمل کیا، اس کے مال کے بارے میں کہ کہاں سے کمایا اور کس چیز میں خرچ کیا اور اس کے جسم کے بارے میں کہ کس چیز میں بوسیدہ کیا۔"

ایک موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بھوک کی شدت کو رفع کرنے کے لئے ایک انصاری کے گھر گئے اور انہوں نے آپ کی تواضع کھجور اور گوشت سے کی اور سب شکم سیر ہو گئے تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

وَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَتُسْأَ لُنَّ عَنْ هٰذا لنَعِيْمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

(فتح القدیر للشوکانی ج ۵ ص ۴۹۰ بروایة مسلم)

" قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے قیامت کے دن تم سے ضرور اس نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

(۱۰۳) اَلْعَصْرِ

نام پہلی آیت میں عصر (زمانہ) کی قسم کھائی گئی ہے اس مناسبت سے اس سورہ کا نام "اَلْعَصْرِ" ہے۔

زمانہ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت کے ابتدائی مرحلہ میں نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون اس بات سے آگاہ کرنا ہے کہ انسانی قافلہ تیزی کے ساتھ ابدی ہلاکت کی طرف گامزن ہے۔ اس ہلاکت سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کریں۔ اور اس کے تقاضوں کو پورا کریں۔

نظم کلام یہ سورۃ تین مختصر آیتوں پر مشتمل ہے مگر معنیٰ کے لحاظ سے اس قدر جامع ہے کہ نہ صرف انسانیت کے عروج وزوال کی پوری تاریخ اس میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ بلکہ مینارۂ ہدایت بن کر افراد، قوموں اور ملتوں کو صحیح سمتِ سفر سے آگاہ کر رہی ہے تاکہ وہ منزل مقصود کو پہنچ جائیں۔ اور غلط راہ پر پڑ کر تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچیں۔ زمانہ کی شہادت اس بات کی تائید میں پیش کی گئی ہے کہ انسان تباہی سے نہیں بچ سکتا اگر وہ اپنے اندر ایمانی اوصاف نہ پیدا کرلے۔

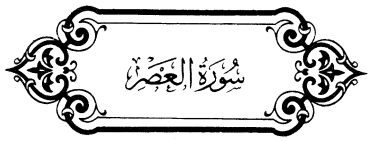

سُورَةُ الْعَصْرِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ ①
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ②
اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③

(۱۰۳) سُورۃ العَصر

آیات ۳

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ زمانہ کی قسم ۔ ۱

۲ انسان گھاٹے میں ہے۔ ۲

۳ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے
۳ اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ۴ اور
ایک دوسرے کو حق کی ہدایت ۵ اور صبر کی تلقین
کی۔ ۶

۱؎ اس سے پہلے ہم واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں مختلف چیزوں کی جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ ان کے تقدس یا عظمت کی بنا پر نہیں کھائی گئی ہیں بلکہ بطور شہادت اور دلیل کے کھائی گئی ہیں۔ یہاں زمانہ کی قسم بھی اس مفہوم میں ہے۔

متن میں لفظ ''عصر'' استعمال ہوا ہے جس کے معنیٰ زمانہ کے ہیں۔ یہ لفظ خاص طور سے زمانہ کی تیز روی اور برق رفتاری کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

۲؎ یہ ہے وہ بات جس پر زمانہ کی گواہی پیش کی گئی ہے۔ یہ گواہی درج ذیل پہلوؤں سے ہے:

۱ ۔ انسان کے پاس سب سے زیادہ قیمتی چیز وقت ہی کا سرمایہ ہے جو گذرتے ہوئے زمانہ کا ایک حصہ ہے۔ یہ وقت نہایت محدود ہے اور بڑی تیزی سے گذر جاتا ہے۔ جس طرح برف ہر لحظہ پگھلتی رہتی ہے اور اگر ایک تاجر اس کو جلد فروخت کر کے اس کی قیمت کھڑی نہ کر لے، برف ختم ہو جائے گی اور اس کے پلہ کچھ بھی نہ پڑے گا۔ اسی طرح انسان کو جو مہلت عمر ملی ہے اس سے اگر وہ فائدہ نہ اٹھائے اور اپنی عاقبت کا سامان نہ کرے تو وہ لازماً گھاٹے میں رہے گا۔ کیوں کہ جو لحہ بھی گذر رہا ہے، اس کا سرمایہ برابر گھٹ رہا ہے۔ گویا سیکنڈ کی سوئی جس تیزی کے ساتھ چلتی ہے اسی تیزی کے ساتھ وہ ہماری عمر کو گھٹا کر ہمارے نقصان میں اضافہ ہی کرتی رہتی ہے۔ الا یہ کہ ہم وقت کی قدر پہچانیں اور اس کو ان کاموں میں گذاریں جو مفید نتائج پیدا کرنے والے اور ہماری عاقبت کو سنوارنے والے ہوں۔

۲ ۔ تاریخ کے وہ واقعات جو عذاب الٰہی کا مظہر تھے۔ اس بات کا ثبوت ہیں کہ جن قوموں نے کفر و سرکشی، مخالفت حق اور ظلم و فساد کی راہ اختیار کی وہ ہلاکت سے دوچار ہوئیں۔ گویا زمانہ اپنی تاریخ کے آئینہ میں اس حقیقت کو پیش کرتا ہے کہ ہلاکت و تباہی سے دوچار ہونیوالے کون ہیں اور اس سے بچنے والے کون۔

۳ ۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے نہ کہ سیر و تفریح کی جگہ۔ اس امتحان گاہ میں انسان کو مختلف موضوعات پر پرچے حل کرنے کیلئے دیئے گئے ہیں اور اس کے لئے وقت بھی مقرر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا جو شخص پرچہ حل کرنے کے بجائے تفریح میں وقت گذار دیتا ہے وہ لازماً اپنا نقصان کرتا ہے۔ اور وقت کو ضائع کرنے والے کے لئے ناکامی مقدر ہے۔

ان پہلوؤں کے علاوہ عصر کی قسم میں یہ اشارہ بھی مضمر ہے کہ دنیا کے خاتمہ کا وقت قریب آ لگا ہے، گویا آخری نبی کی بعثت اور قیامت کے درمیان اتنا ہی فاصلہ رہ گیا ہے جتنا کہ انسانی آبادی کی کل عمر کو ایک دن فرض کرنے کی صورت میں عصر اور مغرب کے درمیان ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ کی حدیث ہے کہ:

اِنَّمَا بَقَاءُ کُم فِيْمَنْ سَلَفَ قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ کَمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْعَصرِ اِلیٰ غُرُوْبِ الشَّمْسِ (روح المعانی ج۱۰ ص ۲۹۲ بحوالہ بخاری)

''جو امتیں گذر چکی ان کے مقابلہ میں تمہارا دنیا میں رہنا اتنے ہی وقت کے لئے ہے جتنا وقت کہ نماز عصر اور غروب آفتاب کے درمیان ہوتا ہے''۔

خسران سے مراد زندگی بھر کا گھاٹا یعنی دائمی تباہی اور ہلاکت ہے، جس سے فیصلہ کے دن انسان کو دوچار ہونا ہوگا۔

۳؎ یعنی آخرت کی ابدی ہلاکت سے وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو ایمان لا کر صالحیت کی زندگی اختیار کریں گے۔ ایمان لانے کا مطلب سورۂ بقرہ نوٹ ۶؎ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

۴؎ معلوم ہوا کہ آخرت کے خسارہ سے بچنے کیلئے صرف ایمان لانا کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ جہاں ایمان حقیقۃً موجود ہوگا وہاں اس کی روشنی سے عملی زندگی بھی منور ہوگی اور انسان نیک کردار بنے گا۔لیکن جہاں ایمان محض جامد عقیدہ کی شکل میں ہوگا۔جس نے شعور کو متاثر نہ کیا ہو تو عملی زندگی بھی سنور نہ سکے گی۔اچھے بیج سے اچھا درخت ہی پیدا ہوتا ہے اور خراب بیج سے خراب درخت۔اس لئے ہو نہیں سکتا کہ ایمان تو دل میں موجود ہو اور عملی زندگی فسق وفجور سے بھری ہوئی ہو۔عملی زندگی کا فساد اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان صحت کی حالت میں موجود نہیں ہے۔

اعمال صالحہ کی حقیقت علامہ فراہی نے بڑی عمدگی سے بیان کی ہے۔لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے اعمال حسنہ کو صالحات سے تعبیر فرمایا ہے۔اس لفظ کے استعمال سے اس عظیم حکمت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے کہ انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمال حسنہ ہی ہیں۔یعنی عمل صالح وہ عمل ہوا جو انسان کے لئے زندگی اور نشو ونما کا سبب بن سکے اور جس کے ذریعہ سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک ترقی کر سکے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔'' (مجموعۂ تفاسیر فراہی ص ۳۵۲)

۵۔ حق اور صبر اگرچہ، اعمال صالحہ میں شامل ہیں۔لیکن چونکہ بنیادی نیکیوں میں سے ہیں اس لئے ان کا ذکر خصوصیت کے ساتھ فرمایا ہے۔

حق اس بات کو کہتے ہیں کہ جو سچی اور مبنی بر عدل اور مطابقِ حقیقت ہو۔یہ باطل کی ضد ہے۔اور اس کا اطلاق پورے دین حق پر بھی، ہوتا ہے اور اس کی تعلیمات پر بھی، نیز اس کلمۂ حق پر بھی جو عدل وانصاف کے تقاضے کے تحت ظالم حکمرانوں یا باطل پرستوں کے سامنے پیش کیا جائے۔علاوہ ازیں اس کا اطلاق ان حقوق پر بھی ہوتا ہے جن کا ادا کرنا اخلاقاً یا شرعاً انسان پر واجب ہے مثلاً خدا کا حق، ماں باپ کا حق، رشتہ داروں کا حق، پڑوسیوں کا حق، غریبوں اور مسکینوں کا حق وغیرہ۔

اہل ایمان کے اس وصف کا جو ذکر فرمایا کہ وہ حق کی ایک دوسرے کو ہدایت کرتے ہیں تو اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ اہل ایمان حق پر نہ صرف خود جمے رہتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کو بھی اس کی ہدایت وتلقین کرتے ہیں۔بالفاظ دیگر اہل ایمان ایسے بے حس نہیں ہوتے کہ باطل اُبھر رہا ہو یا معاشرہ میں خلافِ حق اور منکر باتیں عام ہو رہی ہوں اور وہ خاموش تماشائی بنے رہیں۔بلکہ وہ اپنی معاشرتی اور اجتماعی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے حق کی آواز بلند کرتے ہیں۔اور ایک دوسرے کی اصلاح کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

ضمناً اس سے یہ اصولی بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اظہار حق اہل ایمان کا حق ہے۔اور اس کی آزادی بہر حال انہیں ہونی چاہیئے۔

۶۔ حق کو قبول کرنے، اس کی حمایت کرنے، کلمۂ حق کہنے اور راہ حق پر چلنے کے نتیجہ میں طرح طرح کی مشکلات پیش آتی ہیں، تکالیف اور مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مخالفتوں کے طوفان سے گذرنا پڑتا ہے۔نقصانات بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں اور قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔اس لئے حق کے ساتھ صبر واستقامت، تحمل وبردباری اور عزم وحوصلہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔صبر کے مفہوم میں یہ تمام باتیں شامل ہیں اور اسی مناسبت سے صبر کی تلقین کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

(۱۰۴) اَلْهُمَزَة

نام پہلی آیت میں " هُمَزَةٌ "اہل ایمان پر انگلیاں اٹھانے والوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ان کی یہ حرکتیں ان کے لئے تباہی کا موجب ہوں گی۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''اَلْهُمَزَة'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے۔اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورۂ عصر کے بعد نازل ہوئی ہوگی۔

مرکزی مضمون زر پرستوں کو جھنجھوڑنا ہے کہ جن کے کردار کا یہ حال ہو وہ لازماً کیفرِ کردار کو پہنچ کر رہیں گے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں زر پرستوں کے کردار کی تصویر پیش کی گئی ہے اور انہیں متنبہ کیا گیا ہے کہ یہ کردار لازماً تباہی کا موجب ہے۔

آیت ۴ تا ۹ میں زر پرستوں کا اخروی انجام بیان کیا گیا ہے۔

یہ سورہ سابق سورہ سے اس درجہ مربوط ہے کہ بالکل اس کا تتمہ معلوم ہوتی ہے۔اگر سابق سورہ کا اختتام ان اوصاف کے بیان کرنے پر ہوا تھا جو کامیابی کی ضمانت ہیں، تو اس سورہ کا آغاز ان خصائل کے ذکر سے ہوا ہے جو ہلاکت کا موجب ہیں۔

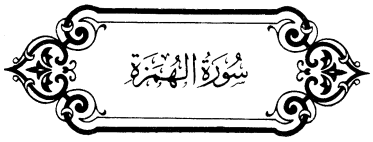

(۱۰۴) سُورةُ الۡهُمَزَة

سُوۡرَةُ الۡهُمَزَةِ

آیات ۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

وَیۡلٌ لِّکُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ ۝۱

۱ تباہی ہے ہر اس شخص کے لئے جو (اہل ایمان پر) انگلیاں اٹھاتا اور طعن وتشنیع کرتا ہے۔ ۱

الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ ۝۲

۲ جس نے مال سمیٹا اور اسے گن گن کر رکھا۔ ۲

یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۚ ۝۳

۳ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے مال نے اس کو ہمیشگی کی زندگی بخشی ہے۔ ۳

کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَةِ ۫ۖ ۝۴

۴ ہرگز نہیں، ۴ وہ حطمہ ۵ (کچل دینے والی) میں پھینک دیا جائے گا۔ ۶

وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحُطَمَةُ ؕ ۝۵

۵ اور تمہیں کیا معلوم کہ حطمہ کیا ہے؟ ۷

نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۙ ۝۶

۶ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ! ۸

الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَةِ ؕ ۝۷

۷ جو دلوں پر جا چڑھے گی۔ ۹

اِنَّهَا عَلَیۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ۙ ۝۸

۸ اس میں اُن کو بند کر دیا جائے گا۔

فِیۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۝۹

۹ لمبے لمبے ستونوں میں۔ ۱۰

۱؎ سابق سورہ کی آخری آیت میں وہ اوصاف بیان کئے گئے تھے۔ جو آخرت کے خسران سے بچانے والے اور کامیابی کی ضمانت ہیں۔ یہ اوصاف اہل ایمان کے کردار کی خصوصیات ہیں۔ لیکن دنیا پرستوں کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اور خاص طور سے جو لوگ مال و دولت کے پجاری ہوتے ہیں وہ اس کردار کے لوگوں کو نہ صرف بے وقعت خیال کرتے ہیں بلکہ ان کی تذلیل و تحقیر پر اُتر آتے ہیں۔ مال کا گھمنڈ ان کے اندر اوچھا پن پیدا کر دیتا ہے اور وہ ان پر انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ ان پر بس آخرت ہی کی دُھن سوار ہے۔ اور ان کی دینداری کا مذاق اڑاتے ہیں اور جہاں موقع پاتے ہیں اس پر فقرے چست کر دیتے ہیں۔

اس سورہ کے نزول کے زمانہ میں قریش کے سرداروں کا یہی حال تھا۔ وہ مال کے گھمنڈ میں مبتلا تھے۔ اور جو لوگ مال کے پیچھے پڑنے کے بجائے آخرت کی دولت جمع کر رہے تھے ان پر انگلیاں اٹھا رہے تھے کہ یہ کس عزت کے مستحق ہیں؟ عزت والا تو وہی ہے جو دولت مند ہے۔ ان کی دینداری اور ان کی متقیانہ زندگیوں پر وہ طرح طرح کی پھبتیاں چست کرتے اور سخت طعنہ زنی کرتے۔ یہاں ان کی ان ہی حرکتوں پر گرفت کی گئی ہے۔

موقع کلام کے لحاظ سے اہل ایمان پر انگلیاں اٹھانے اور طعن و تشنیع کرنے کی بری حرکت کو بخیل سرمایہ داروں کا شیوہ قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حرکت صرف زر پرست ہی کرتے ہیں۔ بلکہ آیت کا اصل مدعا یہ ہے کہ جو بھی یہ حرکت کرے گا وہ اپنی تباہی کا سامان کرے گا۔ سورۂ توبہ میں جو مدنی سورہ ہے، منافقین کی اس طعنہ زنی کا ذکر ہوا ہے جو اہل ایمان پر وہ صدقات کے سلسلہ میں کیا کرتے تھے۔

غریب اہل ایمان محنت مزدوری کر کے جو کچھ کماتے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے۔ مال کی بڑی مقدار ان کے پاس خرچ کے لئے نہ ہوتی۔ مگر منافقین اس پر طنز کرتے اور ان کا مذاق اڑاتے:

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِى الصَّدَقَاتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُم (التوبۃ ۔۷۹)

''جو خوش دلی سے انفاق کرنے والے مؤمنوں پر ان کے صدقات کے سلسلہ میں طعنہ زنی کرتے ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو اپنی محنت و مزدوری کے سوا انفاق کے لئے کچھ اور نہیں پاتے۔''

جہاں تک آیت کے خصوصی پہلو کا تعلق ہے یعنی سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کا جو مفہوم ہے، اس کی وضاحت اوپر ہو چکی۔ رہا اس کا مجموعی پہلو تو وہ یہ ہے کہ شریعت نے جن لوگوں کے احترام کا حکم دیا ہے ان کا احترام کرنے کے بجائے ان کی پگڑی اُچھالنا، عیب چینی کرنا اور ان کے خلاف دلخراش باتیں کرنا، وہ مذموم خصلت ہے جس کا نتیجہ آخرت میں بہت برا نکلے گا۔ خواہ اس کا مرتکب کوئی مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ پرانے زمانہ میں عیب چینی اور طعن و تشنیع کے جو طریقے رائج تھے مثلاً راہ چلتے آنکھوں سے اشارہ کرنا، انگلیاں اٹھانا، آوازیں کسنا، پھبتیاں چست کرنا، برے نام دھرنا، طعنہ زنی کرنا، اور خاص طور سے شاعری میں ہجو کرنا وغیرہ، موجودہ زمانہ میں ان کے علاوہ کچھ نئے طریقوں کا بھی اضافہ ہو گیا ہے مثلاً

کارٹون، طنز نگاری، مزاحیہ ڈرامے، تیر ونشتر کے کالم جو آج کل اخبارات کی زینت بنے ہوئے ہیں اور جس نے باقاعدہ فن کی شکل اختیار کرلی ہے ھَمَز و لَمَز (عیب چینی وطعنہ زنی) ہی کی ''ترقی یافتہ'' شکلیں ہیں۔ جب کہ ان کے ذریعہ ایسے لوگوں کی پگڑی اچھالی جائے جن کی عزت کو شریعت نے محترم ٹھہرایا ہے۔

۲ یعنی یہ مال کا گھمنڈ ہے جس نے ان کے اندر یہ ذہن پیدا کر دیا ہے۔ وہ ان غریبوں کو حقیر جانیں اور ان کا مذاق اڑائیں جنہوں نے اپنے رب سے صحیح تعلق پیدا کرلیا ہے اور اپنی زندگیوں کو نیکیوں سے سنوارا ہے۔

زر پرستوں کو ہمیشہ مال ہی کی فکر لگی رہتی ہے۔ اور حریص سرمایہ دار ہمیشہ سرمایہ ہی کے الٹ پھیر میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا دل کاروبار میں اٹکا ہوا ہوتا ہے اور ان کا دماغ، حساب کتاب میں لگا ہوا۔ ان کی ساری توجہ ایک ہی مسئلہ پر مرکوز ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان کے سرمایہ میں کس طرح اضافہ ہو اور ان کا بنک بیلنس کس طرح بڑھے۔ یہ فکر ان کے دل و دماغ کو اس طرح پریشان کئے رہتی ہے کہ نہ انہیں خدا اور آخرت کے بارے میں کچھ سوچنے کی فرصت ہوتی ہے اور نہ نفسیاتی طور پر وہ نصیحت کی باتیں سننے کیلئے آمادہ ہوتے ہیں۔ ان کی بڑھتی ہوئی حرص انہیں اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خدا کے بخشے ہوئے مال میں بندگانِ خدا کا جو حق ہے وہ ادا کریں۔ بلکہ وہ اپنے مال پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

زر پرستی کی مذمت انجیل میں بھی بڑے مؤثر انداز میں کی گئی ہے مثلاً:

''اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے اور نہ زنگ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ کیوں کہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔'' (متی ۶:۱۹۔۲۱)

''تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔'' (متی: ۶ ۔ ۲۴)

۳ یہ سرمایہ پرست کی نفسیات کا عکس ہے۔ وہ اپنے مال کو سرمایہ زندگی سمجھتا ہے اور جو طرز عمل اختیار کرتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اس کو دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے اور کبھی موت آنے والی نہیں ہے۔

مال چونکہ دنیوی عیش وعشرت کا ذریعہ ہے، اس لئے ارباب مال اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ مال ان کے لئے حیات بخش ہے اور ان کی بقا کا موجب ہے۔ حالانکہ مال میں نہ قوتِ حیات ہے اور نہ قوتِ بقاء۔ اگر اس میں قوت حیات ہوتی تو وہ انسان کو ضرور قلبی سکون بخشتا، جب کہ مالداروں کو یہی چیز نصیب نہیں ہوتی اور بالعموم ان کی زندگیاں پریشانیوں میں گھری ہوئی ہوتی ہیں۔ البتہ تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے انسان قلبی سکون محسوس کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کو حیات جاوداں عطاء کرنے والی چیز تقویٰ ہے نہ کہ مال۔ قرآن میں یہ حقیقت مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ اور انجیل میں اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آدمی روٹی ہی سے نہیں جیتا بلکہ خدا کے کلام سے جیتا ہے (متی ۴: ۴) اور واقعہ یہ ہے کہ آدمی کا مال اس کی قبر تک بھی نہیں جاتا کجا کہ اسے حیات جاوداں بخشے۔ مگر آج بھی مال کے معاملہ میں انسان کی ذہنیت وہی ہے جو ماضی میں تھی۔ یعنی وہ مال کو دنیوی زندگی کا سامان سمجھنے اور خیر کے

کاموں میں خرچ کرنے کے بجائے اس سے اپنی بقاء کی امیدیں وابستہ کرتا ہے اور اسے جمع کرتا رہتا ہے۔ پھر جمع کرنے کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ لکھ پتی بن جانے کے بعد وہ کروڑ پتی بننا چاہتا ہے اور کروڑ پتی بن جانے کے بعد ارب پتی، جب کہ معاشرہ میں کتنے ہی لوگ اپنی بنیادی ضرورتوں کے لئے محتاج ہوتے ہیں۔ اور خیر کے کتنے ہی کام محض روپے کی کمی کی وجہ سے انجام نہیں پاتے۔

مختصر یہ کہ قرآن مال جمع کرنے کے اس رجحان کو مذموم قرار دیتا ہے الا یہ کہ آدمی اپنی اور اپنے متعلقین کی حقیقی ضروریات کے لئے مال روکے رکھے۔

۴؎ یہ سرمایہ پرستوں کے اس خیال کی تردید ہے جو اوپر بیان ہوا۔

۵؎ متن میں لفظ حطمہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی چُور چُور کر دینے والی اور کچلنے والی ہیں۔ یہ جہنم کا نام ہے اور اس کی یہ صفت ہمز و لمز کی اس مذموم خصلت کے مقابلہ میں بیان ہوئی ہے جس کا ذکر آیت ۱؎ میں ہوا۔ اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ جو شخص اللہ کے مخلص بندوں کی عزت کو مجروح کرتا ہے۔ جہنم اس کی عزت کے پرخچے اُڑائے گی اور اہل ایمان کی تحقیر و تذلیل کرنے کی پاداش میں اُسے کچل ڈالے گی۔

غور کیجئے ہُمَزہ و لُمَزہ کے مقابلہ میں حُطمہ کے لفظ نے لفظی یکسانیت ہی نہیں بلکہ معنوی مناسبت بھی پیدا کر دی ہے اور قرآن کی بلاغت اور اس کے اعجاز کی یہ ادنیٰ مثال ہے۔

۶؎ پھینک دینے میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ وہ مال و دولت کی وجہ سے، جس گھمنڈ میں مبتلا تھا اس کا پتہ اسے اس وقت چلے گا جب کہ وہ جہنم میں حقارت کے ساتھ پھینک دیا جائے گا۔

۷؎ یہ سوال جہنم کی ہولناکی کا احساس دلانے کے لئے ہے۔

۸؎ یہ حُطمہ کی تشریح ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمائی ہے۔

۹؎ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ جن دلوں میں اللہ کی محبت کے بجائے مال کی محبت رچ بس گئی تھی ان پر یہ آگ چڑھ دوڑے گی۔ اور دل میں آگ کے گھس جانے سے کرب و الم کی جو کیفیت ہوگی اس کا اندازہ دل کے مریض کی کیفیت سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۱۰؎ یعنی وہ اس آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے۔

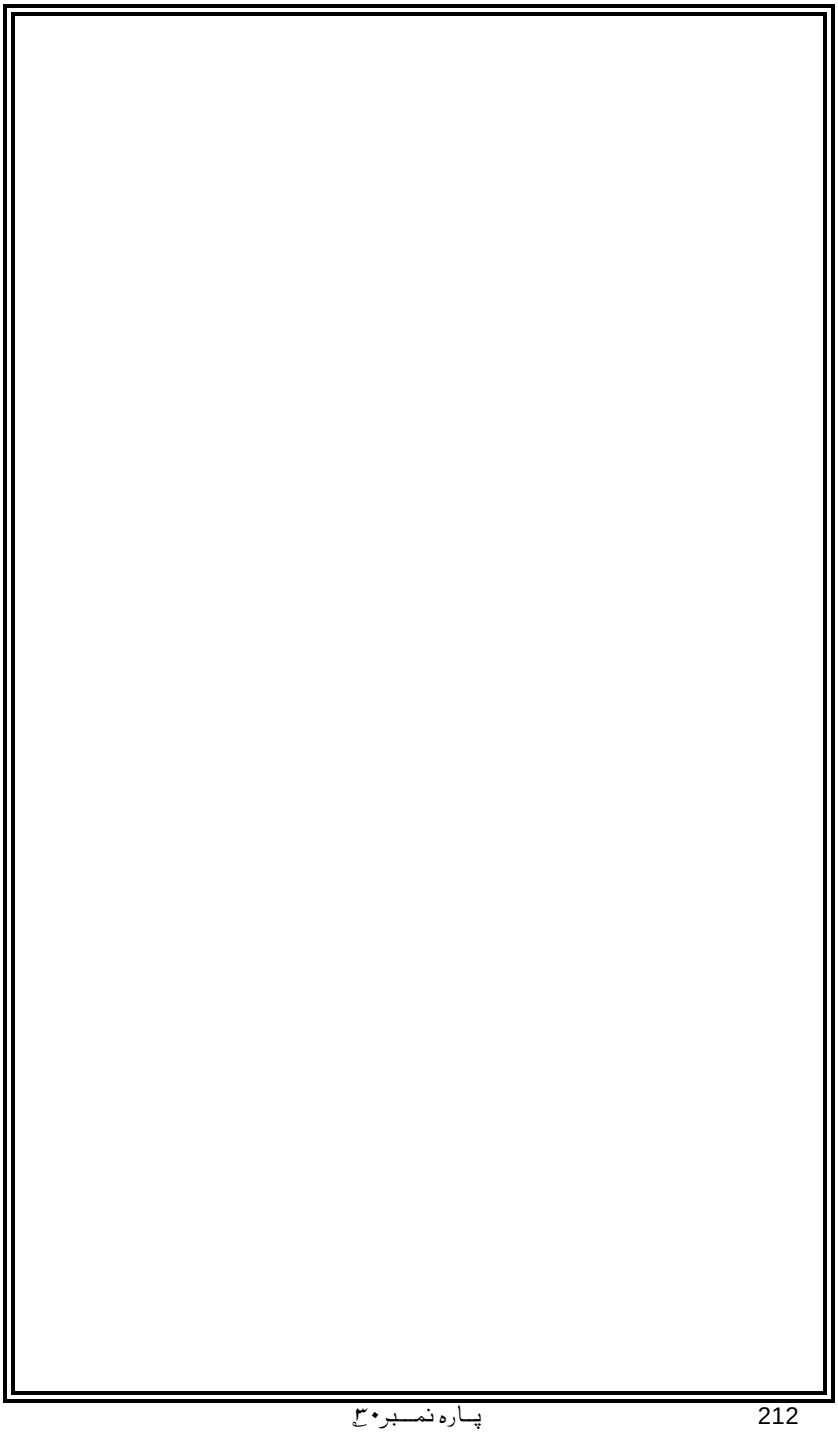

(۱۰۵) الفیل

نام پہلی آیت میں اصحابُ الفیل (ہاتھی والوں) کا ذکر ہوا ہے ۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام " اَلْفِیْل " ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور ابتدائی دور کی تنزیلات میں سے ہے۔

مرکزی مضمون تاریخی اور عبرتناک مثال ان لوگوں کے انجام کی جو دولت اور اقتدار کے نشہ میں خانۂ کعبہ کو ڈھا دینے کی غرض سے نکلے۔

نظم کلام یہ پوری سورہ اس تاریخی واقعہ کے عبرتناک پہلوؤں پر مشتمل ہے جو واقعۂ فیل کے نام سے مشہور تھا۔آیت ۱ میں اس بات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ جس لشکر نے خانۂ کعبہ کو ڈھا دینے کے لئے اقدام کیا تھا اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟

آیت ۲ میں بتایا گیا ہے کہ ان کی چال کس طرح اُلٹی پڑی۔آیت ۳ اور ۴ میں اللہ تعالیٰ کے کرشمہ قدرت کا ذکر ہوا ہے جو اس کے گھر کی حفاظت کے لئے ظہور میں آیا۔اور آیت ۵ میں حملہ آوروں کا عبرتناک انجام بیان کیا گیا ہے جس کو تاریخ نے اپنے اوراق میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

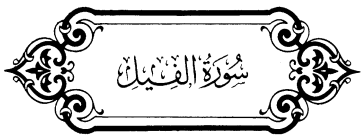

سُورَةُ الْفِيلِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ ①

أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ②

وَّأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيْلَ ③

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ④

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ ⑤

(۱۰۵) سُورۃُ الفیل

آیات ۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ تم نے نہیں دیکھا ۱ کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ ۲

۲ کیا ان کی تدبیر کو بیکار نہیں کر دیا ؟ ۳

۳ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ نہیں بھیجے ؟ ۴

۴ جو ان پر پکی ہوئی مٹی ۵ کے پتھر پھینک رہے تھے۔ ۶

۵ پھر انہیں ایسا کر دیا جیسا کہ کھایا ہوا بھس۔ ۷

۱؎ خطاب گو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس کے اصل مخاطب قریش اور اہل عرب ہیں جو اس واقعہ سے بخوبی واقف تھے۔

۲؎ ہاتھی والوں (اصحاب فیل) سے مُراد ابرہہ اور اس کا لشکر ہے جو ہاتھیوں کو لے کر اللہ کے مقدس گھر پر چڑھ دوڑا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیلات قرآن نے بیان نہیں کیں، کیوں کہ اس واقعہ سے عرب کا بچہ بچہ واقف تھا۔ نیز اس سورہ کے نزول کے وقت اس کے عینی شاہد بھی موجود تھے۔ اس لئے قرآن نے اس کے عبرتناک پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے اور اپنے اس احسان کا ذکر کرنے پر اکتفاء کیا کہ اس نے کس غیر معمولی طریقہ سے اپنے گھر کی حفاظت کا سامان کیا۔ حدیث میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس واقعہ کی کوئی تفصیل منقول نہیں ہے البتہ روایات اور سیرت کی کتابوں میں تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ خاص طور سے سیرت ابن اسحاق میں یہ قصہ تفصیلاً بیان ہوا ہے۔ لیکن اس میں رطب و یابس سبھی کچھ موجود ہے۔ دیگر روایات کا بھی کم وبیش یہی حال ہے۔ اس لئے ہم ان روایات کو سامنے رکھتے ہوئے صرف ان باتوں کے ذکر پر اکتفا کریں گے جن کی تائید قرائن سے ہوتی ہے یا جس کے قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔

یہ واقعہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء کا ہے جبکہ یمن میں ابرہہ نامی ایک عیسائی حکمراں جو حبشہ کے عیسائی بادشاہ کے ماتحت تھا حکومت کر رہا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر کہ عربوں کی عقیدت کا مرکز خانۂ کعبہ ہے اور وہاں ہر سال حج کا بڑا اجتماع ہوتا ہے، حسد پیدا ہو گیا۔ اور اس نے صنعاء (sana) میں نہایت شاندار کنیسہ تعمیر کرایا تا کہ عربوں کے حج کا رُخ اس کی طرف پھیرا جا سکے۔ اس غرض کے لئے اس نے خانۂ کعبہ کو ڈھا دینے کا منصوبہ بنایا اور ساٹھ ہزار کا لشکر جرّار لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس لشکر میں آگے آگے ہاتھیوں کی ایک تعداد تھی اور اسی امتیاز کی وجہ سے یہ لوگ اصحابُ الفیل کہلائے۔

یہ لشکر جب یمن سے مکہ کے لئے روانہ ہوا تو راستہ میں بعض عرب قبائل نے مزاحمت کی۔ لیکن وہ اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے، یہاں تک کہ یہ لشکر منیٰ کے قریب وادی مُحسّر میں پہنچ گیا جو مکہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔

ادھر قریش کو جب اس فوج کشی کی خبر ہوئی تو ان کے سردار عبدالمطلب نے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہیں خانۂ کعبہ کے دروازے کو پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ اس دعا میں قریش کے دوسرے لوگ بھی شریک تھے۔ اس موقع پر عبدالمطلب نے جو اشعار پڑھے وہ یہ ہیں۔

لَاهُمَّ اِنَّ الْعَبْدَ يَمْنَعُ رَحْلَهٗ فَامْنَعْ رِحَالَکَ، لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيْبُهُمْ وَمِحَالُهُمْ غَدْوًا مِحَالَکَ ، اِنْ كُنْتَ تَارِكَهُمْ وَ قِبْلَتَنَا فَاَمْرٌ مَا بَدَالَکَ ، (سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۵۱)

''خدایا! بندہ اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے لوگوں کی حفاظت کر۔ کل ان کی صلیب اور ان کی قوت تیری قوت پر غالب نہ آنے پائے۔ اگر تو ان کو اور ہمارے قبلہ کو یونہی چھوڑ دینا چاہتا ہے تو پھر تیری مرضی''۔

قریش کے لئے جو تعداد میں مختصر تھے ساٹھ ہزار کے لشکر جرار کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ اگر ان کے اور لشکر کے

درمیان مڈبھیڑ ہو بھی جاتی تو کامیابی کی امید نہیں تھی اور معاملہ اللہ کے گھر کی حفاظت کا تھا۔اس گھر کی حفاظت کا جو پہلا گھر ہے جو دنیا میں اللہ کی عبادت کے لئے بنایا گیا۔اس کی یہ غیر معمولی اہمیت اور فضیلت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ اس کی حفاظت کا غیر معمولی سامان ہو۔چنانچہ غیرت حق جوش میں آئی اور اس نے لشکر کو آگے بڑھنے نہیں دیا۔ ابرہہ کا خاص ہاتھی جو آگے آگے تھا، وادی مُحسّر میں یکا یک بیٹھ گیا۔اسے مار مار کر زخمی کر دیا گیا مگر وہ نہ اٹھا۔اسے یمن یا شام یا مشرق کی طرف موڑنے کی کوشش کی جاتی تو وہ اٹھ کر دوڑنے لگتا اور جب مکہ کی طرف موڑا جاتا تو فوراً بیٹھ جاتا۔اتنے میں پرندوں کے جُھنڈ کے جُھنڈ آئے جن کی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں تھیں۔اور انہوں نے لشکر پر ان کی بارش کر دی۔ان کنکریوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جس پر بھی گرتی اس کے جسم پر پھوڑا نکل آتا اور پیپ اور لہو بہنے لگتا، اور کچھ دیر میں پورا جسم گلنے لگتا، جیسا کہ بعض روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ غالباً چیچک کی قسم کا کوئی خطرناک مرض تھا جو یکا یک پھوٹ پڑا تھا۔کنکریاں جو پکی ہوئی مٹی کی تھیں کچھ ایسی سمیت لئے ہوئے تھیں کہ جس کے کنکری لگ جاتی اس کا جسم سڑنے گلنے لگتا۔اس وبا نے لشکر کو اس طرح لپیٹ میں لیا کہ اس کے اندر زبردست بھگدڑ مچ گئی اور لاشوں پر لاشیں گرتی چلی گئیں۔ابرہہ کا بھی بہت بُرا حال ہوا۔اس کے جسم سے لہو اور پیپ بہہ رہا تھا اور جسم جھڑ رہا تھا بالآخر اس کا سینہ پھٹ گیا اور وہ بری طرح ہلاک ہو گیا۔

یہ واقعہ ماہ محرم میں پیش آیا تھا اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔(البدایۃ والنہایۃ ج ۱ ص ۱۷۵)

اس واقعہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا۔پرندوں کے ذریعہ سنگریزوں کی بارش، اور وہ سنگریزے بھی ایسے ایسے جو بندوق کی گولی کا کام کریں، خدا کی ایک معجزانہ نشانی تھی جو ظاہر ہوئی۔اور اس قسم کی نشانیاں خاص خاص مواقع پر ہی ظاہر ہوتی ہیں۔

رہا اس کا تاریخی ثبوت تو قرآن بجائے خود سب سے بڑا تاریخی ثبوت ہے کیوں کہ اگر قرآن کا بیان غلط ہوتا ۔۔۔۔اور یہ بات وہی لوگ سوچ سکتے ہیں جن کو قرآن کی صداقت پر یقین نہیں ۔۔۔۔تو اہل مکہ ضرور اس کی تردید کرتے۔لیکن چونکہ اس واقعہ کے عینی شاہد ان کے درمیان موجود تھے، اور واقعہ کی شہرت کی بنا پر وہ اس کی حقیقت سے باخبر تھے اس لئے قرآن کے بیان کو غلط قرار دینے کی کسی کو جرأت نہیں ہوئی۔علاوہ ازیں قبل اسلام کے عرب شعراء نے اس واقعہ کا ذکر اپنے اشعار میں کیا ہے۔مثال کے طور پر نُفیل جو اس واقعہ کا عینی شاہد ہے کہتا ہے:

حَمِدْتُ اللّٰهَ اِذْ اَبْصَرْتُ طَيْرًا	میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب پرندوں کو دیکھا۔
وَخِفْتُ حِجَارَةً تُلْقَىٰ عَلَيْنَا	اور ڈرا کہ کوئی پتھر لگ نہ جائے جس کی ہم پر بارش ہو رہی تھی۔

اور ابرہہ کی مغلوبی کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

اَيْنَ الْمَفَرُّ وَ الْاِلٰهُ الطَّالِب	اب بھاگ کر کہاں جائیں جب کہ خدا تعاقب کر رہا ہے۔
وَالْاَشْرَمُ الْمَغْلُوْبُ لَيسَ الْغَالِبُ	اور نکبا (ابرہہ) مغلوب ہے غالب نہیں۔

(سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۵۳۔۵۴)

۳؎ یعنی ابرہہ اور اس کے لشکر نے خانۂ کعبہ کو ڈھانے کی غرض سے جو اقدام کیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے ناکام بنا دیا۔ اور وہ اپنے ناپاک ارادوں میں ہرگز کامیاب نہ ہوسکے۔

اصحاب الفیل کی تدبیر کو ناکام بنانے میں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کا کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کرشمۂ قدرت تھا جو ان پر عذاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اہل عرب بھی اس کے معترف تھے، چنانچہ عرب شعراء نے اسے اللہ ہی کا کرشمۂ قدرت قرار دیا ہے۔ اور قریش نے بھی عبدالمطلب کے ساتھ خانۂ کعبہ کے دروازہ پر جو دعا مانگی تھی وہ خدا ہی سے مانگی تھی نہ کہ بتوں سے ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ توحید برحق ہے جس کی دعوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں۔ اور بُت پرستی یکسر باطل ہے۔

۴؎ یہ اس بات کی تفصیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں کی تدبیر کو کس طرح بے کار کردیا۔ صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تباہ کرنے کے لئے پرندوں کے غول کے غول بھیج دیئے ۔ بالفاظ دیگر ہاتھی والے لشکر کا مقابلہ پرندوں کے لشکر نے کیا۔

راویوں کا بیان ہے کہ یہ پرندے خاص قسم کے تھے اور سمندر کی طرف سے آئے تھے۔

۵؎ متن میں لفظ ''سِجّیل'' استعمال ہوا ہے جو فارسی کے دو لفظ سنگ اور گِل کا مُعَرَّب ہے، اور اس سے مراد وہ کنکر ہیں جو پکی ہوئی مٹی سے بنے ہوں۔ آتش فشاں علاقے میں لاوے کی وجہ سے مٹی جو پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے شاید اسی کو سجیل کہا گیا ہے۔ اور عجب نہیں کہ پرندے ان سنگریزوں کو اپنی چونچوں اور پنجوں میں قریب کے کسی آتش فشاں علاقہ سے لے آئے ہوں اور ان کے اندر زہریلا مادہ ہو یا اس کے ساتھ زہریلے جراثیم ہوں جس نے یکا یک وبا کی شکل اختیار کرلی ہو۔ بہرصورت یہ عام پتھر نہیں تھے بلکہ خاص قسم کے سنگریزے تھے اسی لئے قرآن نے اس وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا کہ ''سجیل کی قسم کے پتھر''۔

۶؎ پرندوں کی یہ سنگباری گویا آسمانی بمباری تھی جس نے ہاتھیوں کو بھی تباہ کیا اور ہاتھی والوں کو بھی۔

پرندوں کے سنگریزے گرانے کو سنگریزے پھینکنے، (ترمیھم) سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ انہوں نے لشکر پر سنگریزوں کی ایسی بوچھار کردی تھی کہ وہ پوری طرح اس کی زد میں آ گیا۔ گویا یہ تیر تھے جو نشانہ پر لگ گئے ۔ اس صورتحال کے پیدا ہونے میں ہوسکتا ہے کہ ہوا کا بھی دخل رہا ہو یعنی اس وقت تیز ہوا چلی ہو۔ غالباً اسی وجہ سے بعض شعرائے عرب نے پرندوں کی اس سنگباری کو حاصِب (پتھر برسانے والی آندھی) سے تعبیر کیا ہے۔

ہاتھی والوں پر پرندوں کے جو جھنڈ کے جھنڈ بھیجے گئے تھے اس کی ایک تاویل یہ کی جاتی ہے کہ یہ پرندے ہاتھی والوں کی لاشیں کھانے کے لئے آئے تھے نہ کہ کنکر برسانے کیلئے۔ مگر آیات کا سیاق وسباق اس تاویل کو قبول نہیں کرتا۔ نیز پرندوں کا لاشیں کھانا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ قرآن اس اہتمام کے ساتھ اس کا ذکر کرے۔ اس لئے جمہور مفسرین نے ان آیات کا جو مطلب بیان کیا ہے وہی صحیح ہے اور اس کی رو سے پرندے لاشیں کھانے کے لئے نہیں بلکہ لاشیں گرانے کے لئے آئے تھے۔

رہا یہ سوال کہ قریش نے جو بیت اللہ کے متولی تھے فوج کا مقابلہ کیا یا نہیں؟ تو واقعہ یہ ہے کہ ان کی مڈبھیڑ فوج سے ہوئی ہی نہیں۔ وہ مکہ میں تھے اور لشکر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان تھا اس لئے نہ یہ بات صحیح ہے کہ وہ ڈر کر پہاڑوں میں چھپ گئے تھے جیسا کہ روایتوں میں بیان کیا گیا ہے، اور نہ یہ خیال صحیح ہے کہ انہوں نے پہاڑوں پر سے لشکر پر پتھراؤ کیا تھا۔ پہاڑوں میں چھپنے کی بات اس لئے باور کرنے کے لائق نہیں کہ قریش بزدل نہیں تھے۔ اور جب کہ ابرہہ کی مزاحمت، بعض عرب قبائل نے راستہ میں کی تھی جیسا کہ ان روایات ہی میں بیان ہوا ہے تو قریش کس طرح مزاحمت نہ کرتے۔ ان کی غیرت وحمیت اس بات کو کیسے گوارا کرسکتی تھی کہ بیت اللہ کو چھوڑ کر سب کے سب بھاگ جائیں؟ اور اللہ کے گھر پر قربان ہونے کے لئے ایک آدمی بھی موجود نہ رہے؟ عبدالمطلب کے ان دعائیہ اشعار سے جو اوپر نقل کئے گئے بزدلی کا اظہار نہیں ہوتا۔ البتہ چونکہ قریش تعداد کی قلت کی وجہ سے ایک لشکر جرار کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت کا غیر معمولی سامان کیا۔ رہا یہ دعویٰ کہ دراصل انہوں نے پہاڑوں پر سے سنگباری کی تھی نہ کہ پرندوں نے، تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ اور جب قریش کا ابرہہ کے لشکر کے نزدیک آنا ہی ثابت نہیں تو پتھر پھینکنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔؟

۷ یعنی ان ہاتھی والوں کو اللہ تعالیٰ نے ایسی عبرتناک سزا دی کہ وہ سڑی گلی لاشوں کا ڈھیر بن کر رہ گئے۔ کھائے ہوئے بھوسہ سے تشبیہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح بھوسہ ایک بے وقعت چیز ہے اور پامال کیا جاتا ہے اسی طرح یہ لشکر جرار بے وقعت اور پامال ہو کر رہا۔ بھوسہ کو جب جانور کھا لیتا ہے تو اس کی نہایت مکروہ شکل بنتی ہے۔ ہاتھی والوں کی لاشوں کا بھی یہی حال ہوا۔ اس لئے ان کو کھائے ہوئے بھوسہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔

نقشہ

خانۂ کعبہ پر ابرہہ کی فوج کشی

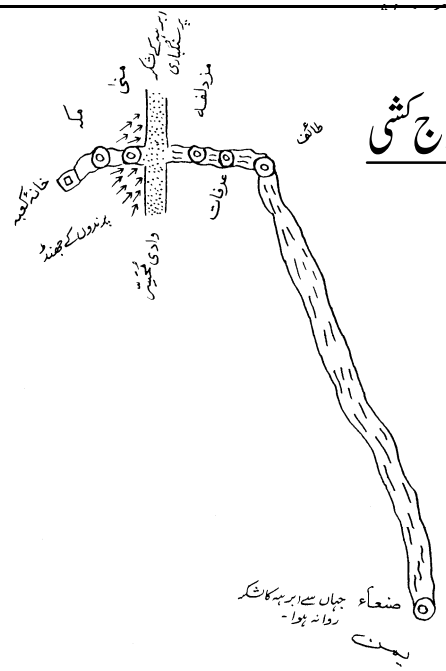

(۱۰۶) قریش

نام پہلی آیت میں ''قریش'' کا ذکر ہوا ہے اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''قریش'' ہے۔

زمانۂ نزول اس سورہ میں رَبَّ هٰذا البَیْتِ (اس گھر کا رب) کے الفاظ آئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے، کیوں کہ خانۂ کعبہ کے لئے اشارۂ قریب (هٰذا) مکہ میں نازل ہونے کی صورت ہی میں موزوں ہوسکتا تھا۔

مرکزی مضمون مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سورۂ فیل کے بعد نازل ہوئی ہوگی۔ قریش پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں۔

نظم کلام آیت ۱ اور ۲ میں قریش کی اس اُلفت کو جو ان کو اپنے تجارتی سفر سے تھی قابل تعجب قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ انہیں یہ نعمت اللہ کے گھر کی بدولت حاصل تھی مگر وہ اللہ کی ناشکری کر رہے تھے۔

آیت ۳ میں اس نعمت کا یہ تقاضا بیان کیا گیا ہے کہ وہ صرف اللہ ہی کی عبادت کریں۔

آیت ۴ میں بتایا گیا ہے کہ رزق اور امن اللہ ہی کی بخشی ہوئی نعمتیں ہیں۔ لہٰذا اس کا اعتراف کرتے ہوئے صرف اسی کی عبادت کرنا چاہئے۔

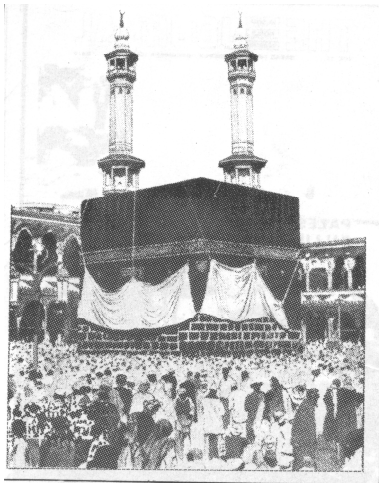

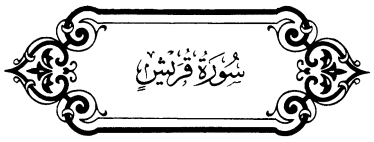

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۙ﴿۱﴾

اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۚ﴿۲﴾

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ﴿۳﴾

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۧ﴿۴﴾

(۱۰۶)سورۃُ قریش

آیات ۴

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ کس ۱ قدر اُلفت ہے قریش ۲ کو ! ۳

۲ ان کو جو اُلفت ہے سرماوگرما کے سفر سے۔

۳ لہٰذا ان کو چاہیئے کہ اس گھر ۴ کے رب کی عبادت کریں۔۵

۴ جس نے ان کو بھوک سے بچا کر کھانا کھلایا اور خوف سے بچا کر امن بخشا ۶ ۔

۱ لِ (لام مجرور) یہاں تعجب کے معنیٰ میں ہے جسے عربی میں لامِ تعجب کہتے ہیں۔ابن جریر طبری نے بھی اسی معنیٰ کو ترجیح دی ہے۔اس لئے ہم نے لِایلافِ کا ترجمہ ''کس قدر اُلفت ہے!'' کیا ہے۔

۲ قریش ایک قبیلہ کا نام ہے جس کے ہاتھ میں خانہ کعبہ کی تولیت تھی۔حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو مکہ کی سرزمین میں بسایا تھا۔قریش ان ہی کی نسل سے ہیں۔اس قبیلہ کی ایک شاخ بنی ہاشم کہلائی۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔

۳ مکہ کی زمین زراعت کے قابل نہیں تھی اس لئے قریش نے تجارت کو اپنا پیشہ بنالیا تھا۔چنانچہ ان کے تجارتی قافلے سردیوں میں یمن کا رخ کرتے اور گرمیوں میں شام وفلسطین کا۔یہ تجارتی سفر ان کی معاش کا بہت بڑا ذریعہ اور ان کی دولت میں اضافہ کا باعث تھے۔وہ جن راہوں سے گذرتے تھے وہ اگرچہ کہ بین الاقوامی شاہراہیں تھیں،لیکن عام بدامنی اور لوٹ مار کی وجہ سے محفوظ نہیں تھیں۔اس کے باوجود قریش کے کاروان تجارت بے خطر آیا جایا کرتے تھے۔کیوں کہ کعبہ کے متولی ہونے کی بنا پر لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔علاوہ ازیں انہوں نے ان ریاستوں کے بادشاہوں سے تجارتی مراعات حاصل کر لی تھیں کہ وہ بے روک ٹوک ان کے ملک میں آتے جاتے رہیں گے۔چنانچہ ہاشم نے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہیں شام،روم،اور غسان کے بادشاہ سے، عبدشمس نے نجاشی سے،نوفل نے کسریٰ سے اور مُطّلب نے حمیر (یمن) کے بادشاہ سے فرمان حاصل کر لئے تھے۔(البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۲۵۳)

اس طرح اللہ کی گھر کے بدولت ان پر رزق کی راہیں بھی کھل گئیں تھیں۔اور عام بدامنی کے باوجود ان کے لئے سفر بھی پُرامن ہو گیا تھا۔ان فوائد کی وجہ سے ان کو اپنے تجارتی سفروں سے الفت پیدا ہو گئی تھی۔چنانچہ وہ پابندی کے ساتھ موسمِ سرما میں یمن کا اور موسم گرما میں شام وفسلطین کا سفر کرتے۔یمن کا علاقہ چونکہ گرم ہے اس لئے موسم سرما میں اس ملک کے سفر کو وہ ترجیح دیتے اور شام وفلسطین کا علاقہ چونکہ سرد ہے اس لئے موسم گرما میں ان ممالک کے سفر کو وہ موزوں خیال کرتے۔

اس آیت میں ان کے تجارتی سفروں سے اُلفت اور وابستگی کو اس بنا پر قابلِ تعجب قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے طرز عمل سے حق ناشناسی اور ناشکری کا ثبوت دے رہے ہیں کیوں کہ یہ نعمتیں انہیں حاصل ہو رہی ہیں خدا کے گھر کی بدولت،لیکن وہ خدا کے ہی حق کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔وہ کھاتے ہیں خدا کا دیا ہوا رزق مگر گن گاتے ہیں بتوں کے۔

۴ اس گھر سے مراد خانہ کعبہ ہے۔

۵ قریش کو متوجہ کیا گیا ہے کہ جب تم اس گھر کو اللہ کا گھر مانتے ہو تو پھر تمہیں اس کا حق ادا کرنا چاہئے۔اور وہ حق یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کی عبادت کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔اس طرح اس گھر کی بدولت جو تجارتی فوائد تمہیں حاصل ہو رہے ہیں اور جو آسودگی تمہیں میسر آرہی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس گھر کے رب کے شکر گذار بندے بن کر رہو اور ناشکری کا طریقہ اختیار نہ کرو۔

خانہ کعبہ کی تعمیر خدائے واحد کی عبادت کیلئے ہوئی تھی،پھر اس گھر کے متولیوں کے لئے خدا کی پرستش کے بجائے

بتوں کی پرستش کے لئے جواز کہاں سے پیدا ہو گیا؟

۲۔ اس زمانہ میں عربوں کی معاشی حالت خستہ تھی، اور اس علاقہ کے جغرافیائی حالات ایسے تھے کہ غذائی اجناس کی بھی بڑی قلت تھی۔ گویا یہ غربت اور فاقہ زدگی کا علاقہ تھا۔ مزید برآں قبائلی سسٹم ہونے اور کسی مضبوط حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ قتل و غارتگری اور لوٹ مار کے واقعات نے ان کی زندگی کا سکون چھین لیا تھا۔ مگر قریش کی حالت معاشی لحاظ بھی بہتر تھی، اور امن وامان کے لحاظ سے بھی۔ معاشی لحاظ سے بہتر ہونے کی وجہ تو ان کے کامیاب تجارتی سفر تھے۔ رہا امن وامان تو انہیں شہر مکہ میں بھی حاصل تھا اور اس کے باہر بھی۔ مکہ میں امن و امان تو اس کے حرم ہونے کی بنا پر تھا، اور باہر نکلنے کے بعد اُن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کوئی شخص یا قبیلہ یا حکومت اس لئے نہیں کرتی تھی کہ وہ پاسبان حرم اور خادم حجاج سمجھے جاتے تھے۔ مختصر یہ کہ قریش کو یہ دونوں نعمتیں یعنی رزق اور امن جو انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہو رہی تھیں۔ اس لئے اس کا شکر اور حق بندگی اُن پر واجب تھا نہ کہ بتوں کا، جن کا نہ بھوک کو مٹانے میں کوئی دخل تھا اور نہ خوف کو دور کرنے میں۔

اس سورہ میں خدائے واحد کی عبادت کا مطالبہ اگر چہ کہ قریش سے کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت یہ مطالبہ پوری انسانیت سے ہے کیوں کہ تمام انسانوں کا رب وہی ہے جو خانۂ کعبہ کا رب ہے۔

قریش اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب (مختصراً)

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

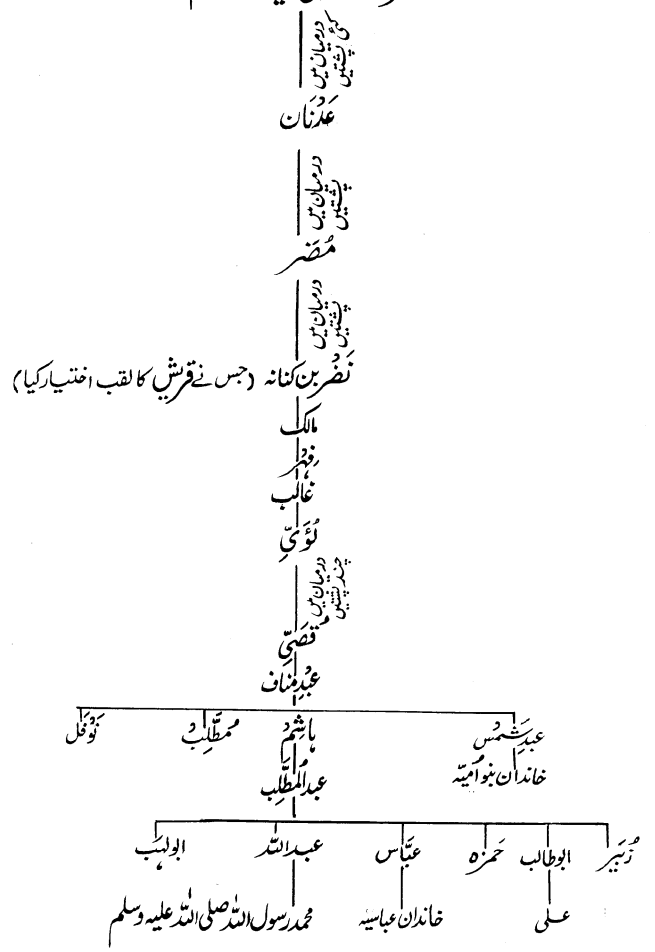

(تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام ج۱ ص ۱، ۲، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، نیز البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۱۹۳، ۲۰۰، ۲۵۹)

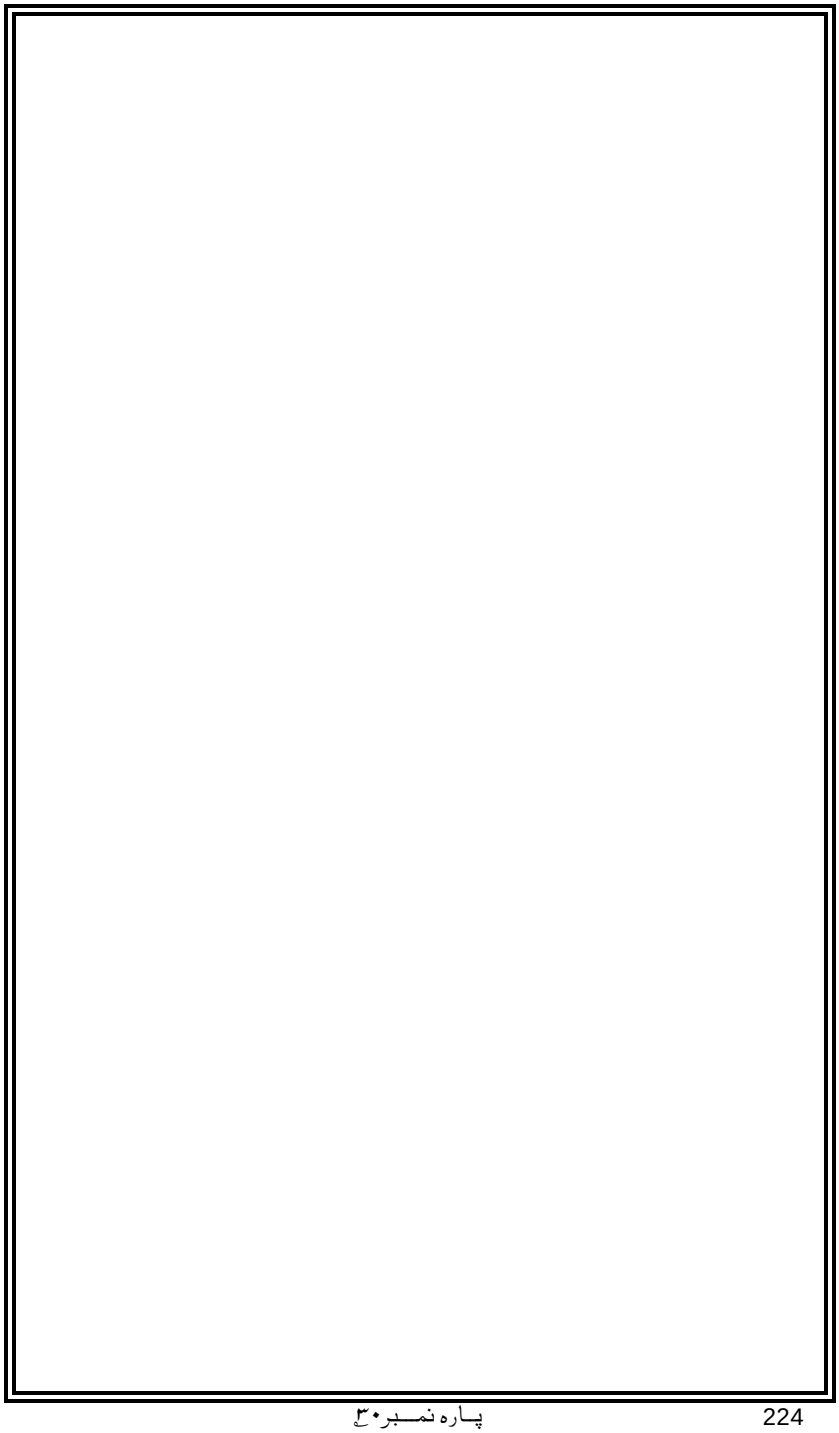

(۱۰۷) الماعون

نـــام آخری آیت میں ماعون (مال حق) ادا نہ کرنے پر وعید آئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''الماعون'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی۔

مـرکزی مضمون اس کردار کو سامنے لانا ہے جو جزا و سزا سے انکار کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے تا کہ لوگ اس کے انجام بد سے خبردار ہوں۔

نظم کلام آیت ۱ میں اس شخص کے کردار پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے جو جزا و سزا کا انکار کرتا ہے۔

آیت ۲ اور ۳ میں بتایا گیا ہے کہ ایسے لوگ ہی سوسائٹی کے کمزور اور بدحال لوگوں کے ساتھ غیر ہمدردانہ اور سنگدلانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

آیت ۴ تا ۶ میں ان کی رسمی نماز کو بے حقیقت قرار دیا گیا ہے۔اور آیت میں ۷ میں ان کے بخل کی خصلت پر گرفت کی گئی ہے۔

پـس مـنظر پس منظر میں قریش کے وہ سردار ہیں جنہیں اپنی مذہبیت اور خانہ کعبہ کے متولی ہونے پر بڑا فخر تھا۔مگر اخلاق و عمل کے اعتبار سے انتہائی پستی کا شکار تھے، جس کی چند مثالیں اس سورہ میں پیش کی گئی ہیں۔

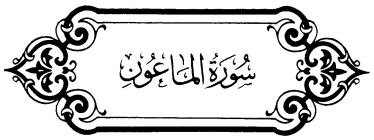

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ①

فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ②

وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ③

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ④

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ⑤

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ⑥

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ⑦

(۱۰۷)سورۃ الماعون

آیات ۷

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ تم نے اس شخص کو دیکھا جو جزا وسزا کو جھٹلاتا ہے!۱

۲ وہی ہے ۲ جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ ۳

۳ اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔۴

۴ تو ایسی نماز پڑھنے والوں کے لئے تباہی ہے۔ ۵

۵ جو اپنی نماز سے غافل ہیں۔۶

۶ جو ریا کاری کرتے ہیں۔۷

۷ اور مال کا حق ادا نہیں کرتے۔۸

۱؎ یعنی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جو جزائے عمل کا منکر ہے کہ اس کا کردار کتنا پست اور اس کے مذہبی مراسم کتنے بے حقیقت ہیں! جو شخص بھی ایسے لوگوں کے حال پر غور کرے گا اس کے اندر یہ احساس ضروری ابھرے گا کہ صحت کردار اور سچی دینداری کے لئے آخرت پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۲؎ یعنی منکرین آخرت میں جو اخلاقی و عملی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ان کا عکس اس کردار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۳؎ یتیم کو دھکے دینے کے مفہوم میں اس کا مال کھانا، اس کا حق مارنا، اس کو جھڑکنا، اس کی تحقیر و تذلیل کرنا اور اس کو دھکے دے کر اپنے دروازے سے ہٹا دینا، سب شامل ہے۔

قرآن نے نہ صرف یتیموں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی ہے بلکہ ان کی قدر کرنے کی بھی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ سورۂ فجر میں فرمایا:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ (الفجر۔۱۷) ''نہیں بلکہ تم یتیموں کی قدر نہیں کرتے۔''

یعنی یتیموں کی ناقدری ان لوگوں کا شیوہ ہے جو خدا کے حضور جوابدہی کا تصور نہیں رکھتے۔

۴؎ اس کی تشریح سورۂ فجر نوٹ ۲۳ میں گذر چکی۔

واضح رہے کہ مسکین کو کھانا کھلانا بجائے خود نیکی کا کام ہے قطع نظر اس سے کہ وہ مسلم ہے یا غیر مسلم۔ اور یتیم کو دھکے دینا بہر صورت گناہ کا کام ہے خواہ اس یتیم کا تعلق کسی بھی مذہب و ملت سے ہو۔

جس وقت یہ سورۂ نازل ہوئی ہے مکہ میں مسلمانوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ لیکن جب انہیں مسکین کو کھانا کھلانے اور اس کی ترغیب دینے کا حکم دیا گیا تو یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اسلام اپنے پیروؤں میں انسانی ہمدردی کا ایسا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے، جس کا دائرۂ اثر پوری انسانیت کے لئے وسیع ہو اور جس کی بنا پر ہر مستحق کی مدد کی جا سکے۔

۵؎ یہاں نماز سے مراد خدا کی پرستش کی وہ شکل ہے جو مشرکین مکہ نے اختیار کی تھی۔ قرآن نے دوسری جگہ ان کی نماز کی ہیئت اور اس کی حقیقت اس طرح بیان کی ہے۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۔ (الانفال ۔ ۳۵) ''بیت اللہ کے پاس ان کی نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔''

یہ ان کی رسمی نماز تھی اور وہ بھی ایسی کہ جس کا حلیہ بگاڑ دیا گیا تھا۔ جہاں تک نماز کی اصلیت کا تعلق ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو اپنی اصل شکل میں قائم کیا تھا۔ اور اپنی اولاد کو بیت اللہ کے پاس اس لئے بسایا تھا، تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ (اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ سورہ ابراہیم۔ ۳۷) اور حضرت اسمٰعیل اپنے گھر والوں کو اس کا تاکید کرتے رہے۔ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ (اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا۔ سورۂ مریم۔ ۵۵) لیکن بعد کے ادوار میں دین میں تحریف کرنے والوں نے نماز کی شکل بگاڑ دی یہاں تک کہ نزول قرآن کے زمانہ میں نماز نام رہ گیا تھا، سیٹیاں اور تالیاں بجانے کا۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کی مثال آج بھی مندروں میں دیکھی جاسکتی ہے جہاں بُت پرست بھجن گا کر اور جھانج اور تالیاں بجا کر ناچتے ہوئے پوجا پاٹ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس سے خدا بھی خوش ہوتا ہے اور بُت بھی۔

یہاں مشرکین کی اسی نماز کو ان کی تباہی کا سبب قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ یہ وہ نماز نہیں ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ لوگوں نے اگر غیر سنجیدہ حرکتوں کا نام نماز یا عبادت رکھ لیا ہو تو اس کا حقیقی نماز اور عبادت سے کیا واسطہ؟ یہ تو خدا کی عبادت نہیں بلکہ اس کا مذاق ہے۔ بعض مفسرین نے اس سورہ کو مدنی قرار دیا ہے اور نماز سے منافقین کی نماز مراد لی ہے، لیکن جس سیاق وسباق (Context) میں نماز کا ذکر ہوا ہے جس کا تعلق منکرین آخرت سے ہے جن اخلاقی خرابیوں کی نمایاں مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں سابق سورہ میں قریش کو خدائے واحد کی عبادت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے متصلاً بعد سورۂ ماعون کو رکھنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کے پس منظر میں قریش کے سردار ہیں جو مشرک بھی تھے اور آخرت کے منکر بھی۔ لہٰذا اس آیت میں جس نماز کا ذکر ہوا ہے وہ مشرکین مکہ اور خاص طور سے خانۂ کعبہ کے متولیوں کی نماز تھی۔ البتہ اس کے وسیع تر مفہوم میں منافقین کی نماز بھی شامل ہے کیوں کہ ان کی نماز بھی محض نام کی نماز تھی۔ حقیقی نماز سے وہ غافل ہی تھے اور یہ بات صرف اس دور کے منافقین پر چسپاں نہیں ہوتی بلکہ ہر دور کے منافقین پر چسپاں ہوتی ہیں۔

۶ یعنی یہ لوگ اپنی حقیقی نماز سے غافل ہیں۔ حقیقی نماز یہ ہے کہ آدمی شرک سے بچتے ہوئے خالصۃً اللہ کے لئے نماز ادا کرے، اسی کی طرف متوجہ ہو اور اس کے حضور جوابدہی کا تصور رکھے نیز اس عبادت کی جو ہیئت اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے اس ہیئت کے ساتھ اسے ادا کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو نماز اپنے پیچھے چھوڑی تھی اس کی یہی خصوصیات تھیں اور اس میں قیام، رکوع اور سجدہ جیسے ارکان تھے مگر مشرکین اس کی ظاہری اور باطنی دونوں خصوصیات کو کھو بیٹھے اور اس کو کھیل تماشا بنا کر رکھ دیا۔ اب جب کہ یہ پیغمبر صلوٰۃِ ابراہیمی کی تجدید کرنا چاہتا ہے یہ لوگ اس پر کان دھرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اور اپنی اس نام نہاد نماز ہی کو لئے بیٹھے ہیں۔

واضح رہے کہ آیت میں عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (وہ اپنی نماز سے غافل ہیں) فرمایا گیا ہے نہ کہ فِيْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (وہ اپنی نماز میں بھولتے ہیں)، کیوں کہ نماز میں بھول (سہو) تو اہل ایمان سے بھی ہو سکتی ہے، لیکن نماز سے غافل ہو جانا ان ہی لوگوں کا شیوہ ہے جو فکر آخرت سے آزاد ہیں۔

۷ یعنی ان کی نماز دکھاوے کی ہوتی ہے۔ خلوص سے بالکل خالی محض ریاکاری کی نماز تاکہ لوگ ان کو مذہبی سمجھیں۔

اللہ کی عبادت حق بندگی سمجھ کر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کی جانی چاہئے، لیکن ریاکاروں کی عبادت محض نمائشی ہوتی ہے، اور اس لئے ہوتی ہے تاکہ لوگوں سے داد حاصل کی جائے۔ اس لئے ایسی عبادت کرنے والے آخرت میں کسی اجر کے مستحق نہیں ہونگے بلکہ اپنے اس گناہ کی وجہ سے سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔ ریاکاری کے سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیانات بھی بڑے مؤثر ہیں، جو بائبل میں منقول ہوئے ہیں۔ چنانچہ متّی کی

انجیل میں ہے:

''خبردار اپنے راستبازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لئے نہ کرو۔۔۔۔پس جب تو خیرات کرے تو اپنے آگے نرسنگانہ بجوا جیسا کہ ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں تا کہ لوگ ان کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔ بلکہ جب تو خیرات کرے تو جو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے ۔۔۔۔۔اور جب تم دعا کرو تو ریاکاروں کی مانند نہ بنو کیونکہ وہ عبادت خانوں میں اور بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر دعا کرنا پسند کرتے ہیں تا کہ لوگ ان کو دیکھیں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔'' (متی: باب ۶)

اور بنی اسرائیل کے علماء اور فقہاء کو جنہوں نے دین کے سلسلہ میں ظاہرداری اختیار کر رکھی تھی، اور جن کے اندر بدترین قسم کی ریاکاری پیدا ہو گئی تھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سخت جھنجھوڑا :

''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو۔ تمہیں زیادہ سزا ہوگی۔۔۔۔۔۔اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔۔۔۔۔۔اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔(متی باب: ۲۳)

۸ یعنی یہ لوگ بڑے بخیل واقع ہوئے ہیں۔ غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت میں جو مال صرف ہونا چاہئے اسے روکے رکھتے ہیں۔ انہیں درحقیقت نہ خدا سے محبت ہے اور نہ اس کے بندوں سے ہمدردی، بلکہ اپنے مال سے محبت ہے اور اپنی دنیا بنانے ہی کی فکر ہے۔ وہ مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اپنے کو خدا پرست ظاہر کر رہے ہیں، لیکن ان غرباء و مساکین کے ساتھ ان کا غیر ہمدردانہ رویہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے خدا پرستی کے دعوے میں سچے نہیں ہیں، کیوں کہ سچی خدا پرستی انسان کو با اخلاق، کریم اور فیاض بناتی ہے۔

متن میں لفظ ماعون استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنیٰ فائدہ کی چیز کے ہیں۔ اس کا اطلاق روزمرہ کے استعمال میں آنے والی چیزوں پر بھی ہوتا ہے اور مال پر بھی۔ مفسرین نے عام طور سے معمولی اور عام ضرورت کی چیزیں مراد لی ہیں جو ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو مستعار دیتا ہے اور جن کا نہ دینا باعثِ خِسّت سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی چیزیں دینے سے انکار کرنا اخلاقاً ذلت کی بات ہے۔ لیکن یہاں جو وعید سُنائی گئی ہے وہ ظاہر ہے کسی بہت بڑے حق کے ادا نہ کرنے یا کسی بڑے گناہ کے ارتکاب ہی پر ہے، نیز سورہ کا مضمون بھی غرباء و مساکین کے حق سے متعلق ہے اس لئے ماعون سے مال کا حق مراد لینا ہی قرین صواب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تائید زہری کے اس قول سے ہوتی ہے کہ ماعون قریش کی زبان میں مال کو کہتے ہیں (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۵۵۶) اور بعض حضرات نے اس سے مراد زکوٰۃ لی ہے۔ لیکن حضرت ابن عمر کا قول اس کی بہترین تفسیر ہے۔ ان سے جب ماعون کے بارے میں پوچھا

گیا۔تو انہوں نے کہا **المال الذی لا یؤدی حقه** ''وہ مال جس کا حق ادا نہ کیا جائے''۔پوچھنے والے نے کہا کہ ابن مسعودؓ تو کہتے ہیں کہ اس سے مراد برتنے کی وہ چیزیں ہیں جو لوگ ایک دوسرے کو دیتے رہتے ہیں،تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا ماعون کا مطلب وہی ہے جو میں تم سے بیان کر رہا ہوں۔(فتح الباری ج۸ ص ۵۹۴ بحوالہ طبری)اسی لئے ہم نے، **یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ** کا ترجمہ ''مال کا حق ادا نہیں کرتے'' کیا ہے۔یہ بات قرآن میں دوسرے طریقہ سے بھی بیان ہوئی ہے مثلاً **مَنَّاعٍ لِلۡخَیۡرِ** (سورہ قلم۔۱۲)''مال کو روکنے والا''یعنی بخیل۔ واضح رہے کہ خیر کا لفظ عربی میں مال کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور منع کا لفظ روکنے،نیز بخل کرنے کے معنیٰ میں بھی۔

(۱۰۸) اَلْکَوْثَر

نام پہلی آیت میں کوثر (خیر کثیر) کے عطا کئے جانے کی خوشخبری دی گئی ہے۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام "اَلْکَوْثَر" ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے۔اور مضمون سے انداز ہوتا ہے کہ یہ مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مخالفتوں کے طوفان سے گذر رہے تھے۔اور آپ کے دشمن آپ کو بدنام کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

مرکزی مضمون یہ سورہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عظیم بشارت اور آپ کے حق میں فضل خاص کا اعلان ہے۔

نظم کلام آیت ۱ میں آپ کو خیر کثیر عطا کئے جانے کی خوشخبری دی گئی ہے۔آیت ۲ میں اس کے شکر کے طور پر نماز اور قربانی کا اہتمام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔آیت ۳ میں آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ آپ کی دشمنی پر تلے ہوئے ہیں وہ آپ کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔البتہ اپنے کو بہت بڑے خیر سے ضرور محروم کرلیں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝۱

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝۲

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝۳

(۱۰۸) سورۃ الکوثر

آیات ۳

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ ہم نے ۱ تمہیں ۲ کوثر عطا کیا۔ ۳

۲ پس تم اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ ۴

۳ بیشک تمہارا دشمن ہی خیر سے محروم ہے۔ ۵

۱ یہ شاہانہ طرز کلام ہے جس میں واحد کی جمع ضمیر اِنَّـــا (ہم نے) استعمال کی گئی ہے۔اور مقصود اس شان کا اظہار ہے جس کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر کا بابرکت عطیہ دربار خداوندی سے عنایت ہوا ہے۔

۲ خطاب براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

۳ کوثر کے معنیٰ خیر کثیر کے ہیں۔(النہایۃ ج ۴ ص ۱۳۷، لسان العرب ج ۵ ص ۱۳۳) اور اسی مناسبت سے یہ جنت کی اس نہر کا نام ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں عطا کی جائیگی۔مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس نے کوثر سے خیر کثیر مراد لیا ہے جس میں جنت کی نہر بھی شامل ہے۔چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ:

عن سعید بن جُبیر عن ابن عبّاسؓ انه قال فی الکوثر هُو الخیرُ الذی اعطاهُ اللّٰه ایّاه قال ابو بشر قُلتُ لِسعید بن جُبیر فَاِنّ النَاس یَزْعَمُوْنَ اَنَّهٗ نَهْرٌ فِی الجَنَّةِ ۔ فَقَالَ سَعِیدٌ اَلنَّهرِ الَّذِیْ فِی الْجَنَّةِ مِنَ الْخَیْرِ الَّذِی اَعْطَاهُ اللّٰهُ اِیَّاه ۔ (بخاری کتاب التفسیر)

"سعید بن جبیر ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کوثر وہ خیر ہے جو اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ابو بشر (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جُبیر سے کہا : لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جنت کی ایک نہر ہے۔سعید نے جواب دیا کہ جنت کی نہر اسی خیر میں سے ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے۔"

اسی طرح اس کے مفہوم میں وہ حوض بھی شامل ہے جو قیامت کے دن میدان حشر میں آپ کو عطا کیا جائے گا، جس کا پانی آپؐ اپنے مخلص پیروؤں کو پلائیں گے۔حدیث میں بھی اس حوض پر بھی کوثر کا اطلاق کیا گیا ہے۔صحیح مسلم میں حضرت انس کی روایت ہے کہ آپؐ نے کوثر کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

هُوَ حوضٌ تَرِدُ عَلَیْهِ اُمَّتِی یَوْمَ القیامةِ ۔ (مسلم کتاب الصلاۃ)

"وہ ایک حوض ہے جس پر قیامت کے دن میری اُمت پہنچے گی۔"

گویا جس خیر کثیر سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے اس میں وہ دو نعمتیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں کیوں کہ یہ عظیم الشان اور گرانقدر ہونے کے علاوہ آپ کے مخصوص فضائل میں شامل ہیں۔اور آیت کا اشارہ جس کو حدیث نبوی نے کھول دیا ہے خاص طور سے ان دو عطیات خداوندی کی طرف ہے۔اور جس بخشش کا وعدہ اللہ تعالیٰ فرمائے اس کا ملنا چونکہ یقینی ہے اس لئے اس کو ماضی کے صیغہ میں اَعْطَیْنَاکَ (ہم نے عطا کیا) بیان فرمایا جو اس کی قطعیت کو ظاہر کرتا ہے۔

یہ بہت بڑی بشارت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت دی گئی جب کہ مشرکین مکہ آپؐ کے دشمن ہو گئے تھے۔اور انہوں نے آپؐ کو اذیت دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔اس موقع پر یہ بشارت آپؐ کی تسلی کا باعث تھی نیز اس سے مخالفین پر یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ تم جس ہستی کو اذیت پہنچا رہے ہو وہ خدا کے نزدیک کیسی عظیم المرتبت ہستی ہے۔جس پر خیر و برکت کی مسلسل بارش ہو رہی ہے۔اور اس خیر و برکت کا ظہور کس طرح حوض کوثر اور نہر کوثر کی شکل میں ہونے والا ہے۔اس کے باوجود اگر تم اس کی شان میں گستاخی کرنا چاہتے ہو تو کرو آسمان کو، تو تم اس پر پھول

نچھاور کرنے سے نہیں روک سکتے!

نہر کوثر اور حوض کوثر کے سلسلہ میں جو بہ کثرت صحیح اور صریح حدیثیں وارد ہوئی ہیں ان سب کو بیان کرنا تو طوالت کا باعث ہوگا اس لئے ہم چند حدیثیں ذیل میں نقل کرتے ہیں:

نہر کوثر کا مشاہدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے موقع پر کرایا گیا تھا۔ حضرت انس کی روایت ہے کہ:

"لَمَّا عُرِجَ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وسلم اِلَی السَّمَاءِ قَالَ اَتَیْتُ عَلٰی نَھْرٍ حَافَتَاہُ قِبَابُ اللؤ لُو مُجَوّ فٌ ، فَقُلْتُ ما ھٰذَا یَا جِبْرِیْلُ؟ قَالَ ھٰذَا الْکَوثَرُ "(بخاری کتاب التفسیر)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج کے لئے آسمان پر تشریف لے گئے تو (وہاں جو کچھ مشاہدہ کیا اس کا ذکر کرتے ہوئے) آپ نے فرمایا میں ایک نہر پر آیا جس کے دونوں کناروں پر مجوف (اندر سے خالی) موتیوں کے قبے بنے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا جبریل یہ کیا ہے؟ فرمایا یہ کوثر ہے"

اور بخاری ہی کی دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

ھٰذا الکوثر الذی اعطاکَ رَبُّکَ "یہ وہ کوثر ہے جو آپؐ کے رب نے آپ کو عطا کیا ہے"

(بخاری کتاب الرقاق)

اور عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلْکَوْثَرُ نَھْرٌ فِی الْجَنَّۃِ حَافَتَاہُ مِنْ ذَھَبٍ وَمَجْرَاہُ عَلَی الدُّرِّ وَالْیَاقُوتِ تُرْبَتُہٗ اَطْیَبُ مِنَ الْمِسْکِ وَمَاؤُہٗ اَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ وَاَبْیَضُ مِنَ الثَّلْجِ ۔

"کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے کے ہیں اور وہ موتیوں اور یاقوت پر بہتی ہے، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے اور اس کا پانی شہد سے زیادہ شیریں اور برف سے زیادہ سفید ہے۔" (ترمذی ابواب التفسیر)

اور حوض کوثر کے بارے میں حضرت سہل بن سعد کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنِّی فَرَطُکُمْ عَلَی الحَوْضِ مِنْ مَرَّ عَلَیَّ شَرِبَ وَمِنْ شَرِبَ لَمْ یَظْمَأْ اَبَداً ۔

"میں تم سے پہلے حوض پر پہنچوں گا۔ جو میرے پاس آئے گا اس کا پانی پئے گا اور جو کوئی اس کا پانی پئے گا اسے پھر کبھی پیاس محسوس نہ ہوگی۔" (بخاری کتاب الرقاق)

عبداللہ بن عمرو کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

حَوضِی مَسِیرۃُ شَھْرٍ مَاؤُ ہٗ اَبْیَضُ مِنَ اللَّبَنِ وَرِیْحُہٗ اَطِیْبُ مِنَ الْمِسکِ وَکِیْزَانُہٗ کَنُجُوْمِ السَّمَاءِ مَنْ شَرِ بَ مِنْھَا فَلَا یَظْمَأُ اَبَداً ۔

"میرے حوض کا طول (یا عرض) ایک ماہ کی مسافت کے بقدر ہوگا۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور اس کی خوشبو مشک سے بھی زیادہ عمدہ اور اس کے کوزے آسمان کے تاروں کی طرح بہ کثرت ہونگے جو اس کا پانی پئے گا اس کو

پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔'' (بخاری کتاب الرقاق)

عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز منبر پر چڑھ کر فرمایا:

اِنِّی فَرَطٌ لَکُمْ وَ اَنَا شَھِیْدٌ عَلَیْکُمْ وَاِنِّی وَاللّٰہِ لَاَنْظُرُ اِلیٰ حَوْضِی الآنَ ۔

''میں تم سے پہلے (حوض پر) پہنچنے والا ہوں اور تم پر گواہ ہوں گا۔ قسم بخدا میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں۔'' (مسلم کتاب الفضائل)

انس بن مالک کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَیَرِ دَنّ عَلَیَّ الْحَوْضَ رِجَالٌ مِمَّنْ صَاحَبَنِی حَتّٰی اِذَارَاَیْتُھُمْ وَرُفِعُوا اِلَیَّ اخْتُلِجُوْادُوْنِی فَلَا قُوْلَنَّ ایْ رَبِّ اُصَیْحَابِیْ اُصَیْحَابِیْ فَلَیُقَا لَنَّ لِی اِنَّکَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوا بَعْدَکَ ۔

''میرے حوض پر کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے جو میرے ساتھی رہے ہیں۔ میں جب انہیں دیکھ لوں گا اور وہ میرے پاس لائیں جائیں گے تو انہیں میرے پاس سے ہٹا دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ اے رب یہ میرے ساتھی ہیں۔ یہ میرے ساتھی ہیں۔ لیکن مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا''۔ (مسلم کتاب الفضائل)

اس طرح کی بکثرت حدیثیں جو حوض کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ آپ کے اس حوض پر آپ کی اُمت وارد ہوگی۔ البتہ اس سے سیراب ہونے کا موقع ان ہی لوگوں کو دیا جائے گا۔ جو آپ کے مخلص پیرو ہوں گے اور جنہوں نے آپ کے طریقہ (سنت) میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہوگی۔

ہے یعنی اس گراں قدر عطیہ کے نوازے جانے پر تم اپنے رب کا شکر ادا کرو اور اس کی شکر گذاری کا طریقہ نماز اور قربانی ہے۔ گویا یہ عبادتیں شکر کا بہترین مظہر ہیں اور خدا کے تقرب کا بہترین ذریعہ بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز سے جو شغف تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ آپ رات کو اٹھ کر دیر تک نماز میں مشغول رہتے یہاں تک کہ آپ کے پاؤں متورم ہو گئے۔ بعض صحابہ نے اس طرف توجہ دلائی تو آپ نے فرمایا کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بن جاؤں (بخاری مسلم)

اسی طرح قربانی کے حکم کی تعمیل بھی آپ بڑی رغبت سے کرتے رہے۔ مدینہ میں عید الاضحی کے موقع پر قربانی کرنا آپ کا معمول رہا اور حجۃ الوداع کے موقع پر تو آپ نے اپنے ہاتھ سے ۶۳/ اونٹ ذبح کئے۔

متن میں لفظ وَانْحَر استعمال ہوا ہے جو اصلاً اونٹ کی قربانی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور یہاں اس سے مقصود ملت ابراہیمی کی طرف اشارہ کرنا ہے، جس میں اونٹ کی قربانی ایک شعار کے طور پر تھی۔ بخلاف اس کے یہود اونٹ کی قربانی کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس شعار کو زندہ کرنے کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لازماً اونٹ ہی کی قربانی کی جائے ورنہ قربانی نہیں ہوگی۔ بلکہ جیسا کہ آپ کے قول و عمل سے ثابت ہے کہ قربانی دوسرے جانوروں کی بھی کی جاسکتی ہے۔ اسلئے یہاں حکم کا اصل منشاء قربانی پر زور دینا ہے خواہ وہ ان جانوروں میں سے

کسی جانور کی ہو جن کی قربانی مشروع ہے۔حدیث میں نحر کا لفظ گائے کی قربانی کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ **عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَحَرْنَا مَعَ رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عامَ الحُدَیْبِیَۃِ البَقَرَۃَ عَن سبعۃٍ والبدنۃ عن سبعۃٍ** (ترمذی ابواب الحج)

''جابر کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ کے سال قربانی کی۔گائے سات افراد کی طرف سے اور اونٹ سات افراد کی طرف سے۔''

نماز اور قربانی کا جو حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے وہ آپ کے توسط سے پوری امت کے لئے ہے۔جس طرح یہ امت کوثر کے عطیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریک ہے،اور قیامت کے دن حوضِ کوثر سے فیض حاصل کرے گی۔اسی طرح وہ نماز اور قربانی کے حکم میں بھی جو آپ کو دیا گیا ہے آپ کی شریک وسہیم ہے۔موقع ومحل کے لحاظ اس حکم کا یہ پہلو بھی یہاں واضح ہو رہا ہے کہ سورۂ ماعون میں مشرکین کی جس نماز کو بے حقیقت قرار دیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں تمہاری نماز خالصۃً اللہ کے لئے ہونی چاہئے،جیسا کہ دوسری جگہ زیادہ وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِیْنَ ۔لَا شَرِیْکَ لَہٗ (الانعام ۔۱۶۲)

''کہو میری نماز،میری قربانی،میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔''

۵ یہ ان مشرکین کی ان گستاخیوں کے جواب میں ہے جو آپ کی شان میں وہ کرتے تھے۔وہ توہین آمیز کلمات کے ساتھ آپ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے کہ آپ کا تعلق شرک اور بُت پرستی کی مخالفت کی وجہ سے قوم سے منقطع ہو گیا ہے۔قریش کو دنیا میں جو قوت واقتدار اور عزت وسرفرازی حاصل ہے اس سے آپ بالکل محروم ہو گئے ہیں اور اب آپ کی حیثیت ایک بے یار ومددگار شخص کی ہو کر رہ گئی ہے۔اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے خیر کثیر سے نوازا ہے۔البتہ آپ کے مخالفین ہر طرح کے خیر سے محروم ہیں اور ابد تک ان کے لئے محرومی لکھ دی گئی ہے۔

یہ درحقیقت ایک پیشین گوئی تھی جو بالکل صحیح ثابت ہوئی۔دشمنان رسول اس طرح ذلیل وخوار اور تباہ وبرباد ہوئے کہ ان کا نام ونشان بالکل مٹ گیا اور اللہ کے رسول کو ایسی عزت وسرفرازی حاصل ہوئی کہ کروڑہا لوگ آپ پر درود وسلام بھیجتے ہیں اور قیامت تک بھیجتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ اس پیشین گوئی کا تعلق صرف اُس زمانہ کے دشمنان رسول ہی سے نہیں تھا،بلکہ ہر زمانہ میں پیدا ہونے والے دشمنانِ رسول سے ہے۔جو بھی آپ کی شان میں گستاخی کرے گا یا آپ کی مخالفت کرے گا اس کے لئے خیر سے محرومی مقدر ہے اور وہ ذلیل ہو کر رہے گا۔

(۱۰۹) اَلْکٰفِرُوْن

نام پہلی آیت الکافرون (کافرو!) کا لفظ آیا ہے اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''الکافرون'' ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مکہ کے آخری دور کی تنزیل ہے۔

مرکزی مضمون غیر اللہ کی پرستش سے بیزاری اور کفار کے دین سے قطعی بے تعلقی کا اظہار و اعلان ہے۔

نظم کلام آیت ۱ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی ہے کہ کافروں کی مخاطب کر کے دوٹوک الفاظ میں اعلان کر دو۔

آیت ۲ اور ۳ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ پرستش کے معاملہ میں میرا موقف کیا ہے اور تمہارا کیا۔

آیت ۴ اور ۵ میں یہ اعلان کہ پرستش کے معاملہ میں کسی قسم کی رواداری برتنے یا کسی بھی مصالحتی فارمولے کو قبول کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

آیت ۶ میں کفار کے دین سے اظہار برأت ہے۔

حدیث حدیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز فجر سے پہلے کی دو رکعتوں میں، نیز حجۃ الوداع کے موقع پر طواف کی دو رکعتوں میں سورۂ قُل یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ اور سورۂ قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ پڑھی تھیں۔

(مسلم کتاب صلوٰۃ المسافرین بروایت ابو ھریرۃ اور کتاب الحج بروایت جابر بن عبداللّٰہ)

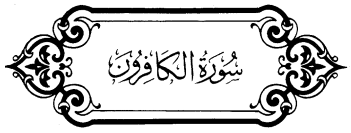

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ﴿۱﴾

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ﴿۲﴾

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ﴿۳﴾

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ﴿۴﴾

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ؕ﴿۵﴾

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۧ﴿۶﴾

(۱۰۹)سُورۃُ الکٰفرون

آیات۶

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ کہہ دو ۱ اے کافرو ! ۲

۲ میں ان کی پرستش نہیں کرتا جن کی پرستش تم کرتے ہو۔ ۳

۳ اور نہ تم اس کی پرستش کرتے ہو جس کی پرستش میں کرتا ہوں۔ ۴

۴ اور نہ میں ان کی پرستش کرنے والا ہوں جن کی پرستش تم نے کی۔ ۵

۵ اور نہ تم اس کی پرستش کرنے والے ہو جس کی پرستش میں کرتا ہوں۔ ۶

۶ تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین ۔ ۷

۱؎ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔

۲؎ مخاطب وہ لوگ ہیں جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حق اچھی طرح واضح ہو چکا تھا، اور اس کے باوجود وہ کفر پر جمے رہے۔

کافر کے لفظی معنیٰ انکار کرنے والے کے ہیں، اور قرآن کی اصطلاح میں کفر ایمان کے مقابل کا لفظ ہے۔ اور کافر سے مراد وہ شخص ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو قبول کرنے سے انکار کر دے۔ اس دین کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ صرف اسی کی عبادت کرے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ جو شخص غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے خواہ وہ بت پرستی کی شکل میں ہو یا بھومی پوجا کی شکل میں، اور خواہ وہ دیوی دیوتاؤں کو مدد کے لئے پکارتا ہو یا کسی فرضی خدا کے بھجن گاتا ہو، کھلا ہوا شرک ہے اور جو مذہب بھی اس شرک کی اجازت دیتا ہے۔ وہ مشرکانہ مذہب ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے کہ اس شرک کی جڑ کاٹ دیں اور انسان کو خدائے واحد کا پرستار بننے کی دعوت دیں۔

یہ دعوت آپ نے دلائل و شواہد کے ساتھ پیش فرمائی اور فہمائش کا بہتر سے بہتر طریقہ اختیار کیا۔ یہ دعوتی جدوجہد ایک عرصہ تک جاری رہی، یہاں تک کہ حق اچھی طرح واضح ہو گیا اور اللہ کی حجت اس کے بندوں پر قائم ہو گئی۔ دعوت کے اس مرحلہ میں داخل ہونے کے بعد جو لوگ کفر پر بضد ہوئے اور رسول کی مخالفت اور دشمنی پر اتر آئے ان سے اے کافرو! کہہ کر خطاب کیا گیا جو بالکل برمحل تھا لیکن اس سے مقصود مخالفین کو بُرا بھلا کہنا نہیں تھا بلکہ ان کے منکر حق ہونے کا برملا اظہار کرنا تھا تاکہ واضح ہو جائے کہ خدا کی حجت ان پر قائم ہو چکی ہے۔ اور ان کے کفر کی پاداش میں غضب الٰہی ان پر ٹوٹنے والا ہے۔ یہ بات اگرچہ کفار مکہ پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، اور وہی اس کے مخاطب اول تھے لیکن اصولی طور پر یہ بات ان لوگوں پر بھی منطبق ہوتی ہے، جو کفار مکہ کی سی ہٹ دھرمی اختیار کریں۔ اور مدعا یہ ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے کافروں پر اللہ کی حجت برابر قائم ہوتی رہے۔ نیز اس کے ذریعہ مسلمانوں کو بھی یہ سبق دینا مقصود ہے کہ کافروں کی راہ الگ اور اہل ایمان کی راہ الگ ہے۔ اور دونوں کے درمیان ایسی وسیع خلیج حائل ہے کہ وہ کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر ہرگز معاملہ نہیں کر سکتے۔

۳؎ مراد بت ہیں جن کی پوجا مشرکین مکہ کرتے تھے۔ نیز وہ تمام معبود بھی جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر پرستش کیا کرتے تھے۔

پرستش کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقف کو واضح کرنے کا حکم دوسری سورتوں میں بھی دیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں فرمایا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ۔

''کہو اے لوگو۔ اگر تم میرے دین کے معاملہ میں شک میں ہو تو سُن لو کہ میں ان کی پرستش نہیں کرتا جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پرستش کرتے ہو بلکہ صرف اللہ کی پرستش کرتا ہوں جو تمہاری روح قبض کرتا ہے۔'' (یونس ۔ ۱۰۴)

۴ مشرکین مکہ خدا کے قائل تھے اور اس کی پرستش سے بھی انہیں انکار نہیں تھا۔ لیکن وہ یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ بتوں کو چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش کی جائے۔ وہ اگر خدا کی پرستش کرتے تھے تو وہ شرک کے ساتھ ہوتی تھی اس لئے ان پر واضح کیا گیا کہ نہ یہ خدا کی پرستش ہے اور نہ ہی تم خدا کے پرستار ہو۔ خدا کی پرستش کے ساتھ کوئی اور پرستش جمع نہیں ہوسکتی اس لئے اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تم بھی خدا کے پرستار ہو، تو یہ تمہاری خام خیالی ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

۵ مشرکین چاہتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بتوں کی پرستش کریں تاکہ مصالحت کی کوئی شکل پیدا ہو۔ سورۂ زمر میں ان کے اس مطالبہ کا جواب بڑے سخت انداز میں دیا گیا ہے۔ فرمایا:

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْنِّىْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجَاهِلُوْنَ ۝ (الزمر۔ ۶۴)

''کہو اے جاہلو! پھر کیا تم مجھ سے مطالبہ کرتے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش کروں''؟

اور یہاں بھی انہیں سخت مایوس کن جواب دیا گیا ہے تاکہ وہ اس سلسلہ میں سمجھوتہ کی کوئی امید نہ رکھیں۔

آیت ۲ اور آیت ۴ میں تکرار نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے فرق ہے کہ آیت ۲ میں حال سے متعلق آپ نے اپنا موقف واضح کر دیا ہے اور آیت ۴ میں آئندہ کے لئے اپنے مؤقف اور اپنے عزم کا اظہار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ میں تمہارے معبودوں کی پرستش کرتا ہوں اور نہ مجھ سے یہ آئندہ کے لئے توقع کی جاسکتی ہے کہ میں اس معاملہ میں کوئی نرمی یا لچک پیدا کروں گا۔ میں حتمی طور پر ہمیشہ کے لئے تمہارے معبودوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔

۶ یعنی تمہاری ہٹ دھرمی کی بنا پر تم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ تم اپنے معبودوں کو چھوڑ کر میرے معبود کی عبادت کرنے والے بن جاؤ گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کفار میں سے آئندہ کسی کے بھی ایمان لانے کا کوئی امکان باقی ہی نہیں رہا، کیوں کہ ان میں ایسے بھی تھے جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ تمہارے اندر میرے معبود کی پرستش کے لئے کوئی آمادگی نہیں پائی جاتی اور تم اپنے بتوں ہی کے پجاری بن کے رہنا چاہتے ہو اس لئے میں تم سے اعلان برأت کرتا ہوں جب تک کہ تم اپنے اس کافرانہ اور مشرکانہ رویہ سے باز نہ آجاؤ۔ لیکن ان میں جو ہٹ دھرم تھے وہ کبھی ایمان لانے والے نہیں تھے اور یہاں خطاب ایسے ہی کافروں سے ہے مثال کے طور پر ابولہب اور ابوجہل جو آخر وقت تک ایمان نہیں لائے۔

۷ یعنی جب پرستش کے معاملہ میں جو خدا سے تعلق کی اصل بنیاد ہے، جب میرے اور تمہارے درمیان کوئی اشتراک نہیں ہے، تو دونوں کا دین ایک کس طرح ہوسکتا ہے۔ اور سمجھوتہ اور رواداری کا سوال پیدا ہی کہاں ہوتا ہے۔ اگر تم میری دعوت قبول کرنا نہیں چاہتے تو تم اپنے موقف پر رہو اور میں اپنے موقف پر قائم ہوں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی سورہ یونس میں فرمائی گئی ہے:

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّىْ عَمَلِىْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِىْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (یونس۔ ۴۱)

’’ اور اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو کہہ دو کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے ۔ میں جو کچھ کرتا ہوں اس سے تم بَری ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اس سے میں بَری ہوں‘‘ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنی قوم سے اعلان برأت کیا تھا جس کو قرآن نے اہل ایمان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے ۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۔ اِذْقَالُوا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَآؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَداً حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ (الممتحنہ ۔ ۴)

’’ تمہارے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے ۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو ان سے بالکل بَری ہیں ۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور نفرت ہوگئی جب تک کہ تم اللہ واحد پر ایمان نہ لے آؤ ۔‘‘

غرضیکہ یہ آیت کفار کے رویہ سے بیزاری اور ان کے دین سے بےتعلقی کا اعلان ہے ۔ اس لئے اس کو رواداری کے مفہوم میں لینا اور اس سے استدلال کرتے ہوئے مشرکانہ مذاہب کے لئے نرم گوشہ پیدا کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سیاہ کو سفید سمجھ لینا یا رات کو دن ثابت کرنے کی کوشش کرنا ۔

آج کل مذہبی رواداری کے نام پر وحدتِ ادیان (سب مذہب یکساں ہیں ان میں حق و باطل کا امتیاز نہیں) کے نظریہ کو بڑے دلفریب انداز میں پیش کیا جا رہا ہے ۔ اس کا پرچار کرنے والے چاہتے ہیں کہ خدا کو بتوں کی صف میں بٹھائیں (تعالیٰ اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ) اور شرک اور توحید کا معجون مرکب تیار کریں ۔ یہ لوگ تو اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں لیکن حق کو باطل کے ساتھ ہرگز نہیں جمع کر سکتے ۔ جس طرح دن اور رات دونوں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتے اسی طرح حق و باطل کو جمع کرنے کی کوشش بھی فضول ہے اور جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کی یہ سورہ ہی اس نظریہ کو باطل قرار دینے کے لئے کافی ہے ۔ اس لئے جو لوگ اسلام اور کفر کا ملغوبہ تیار کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز یہ توقع نہ رکھیں کہ انہیں قرآن کی تائید حاصل ہو سکے گی ۔

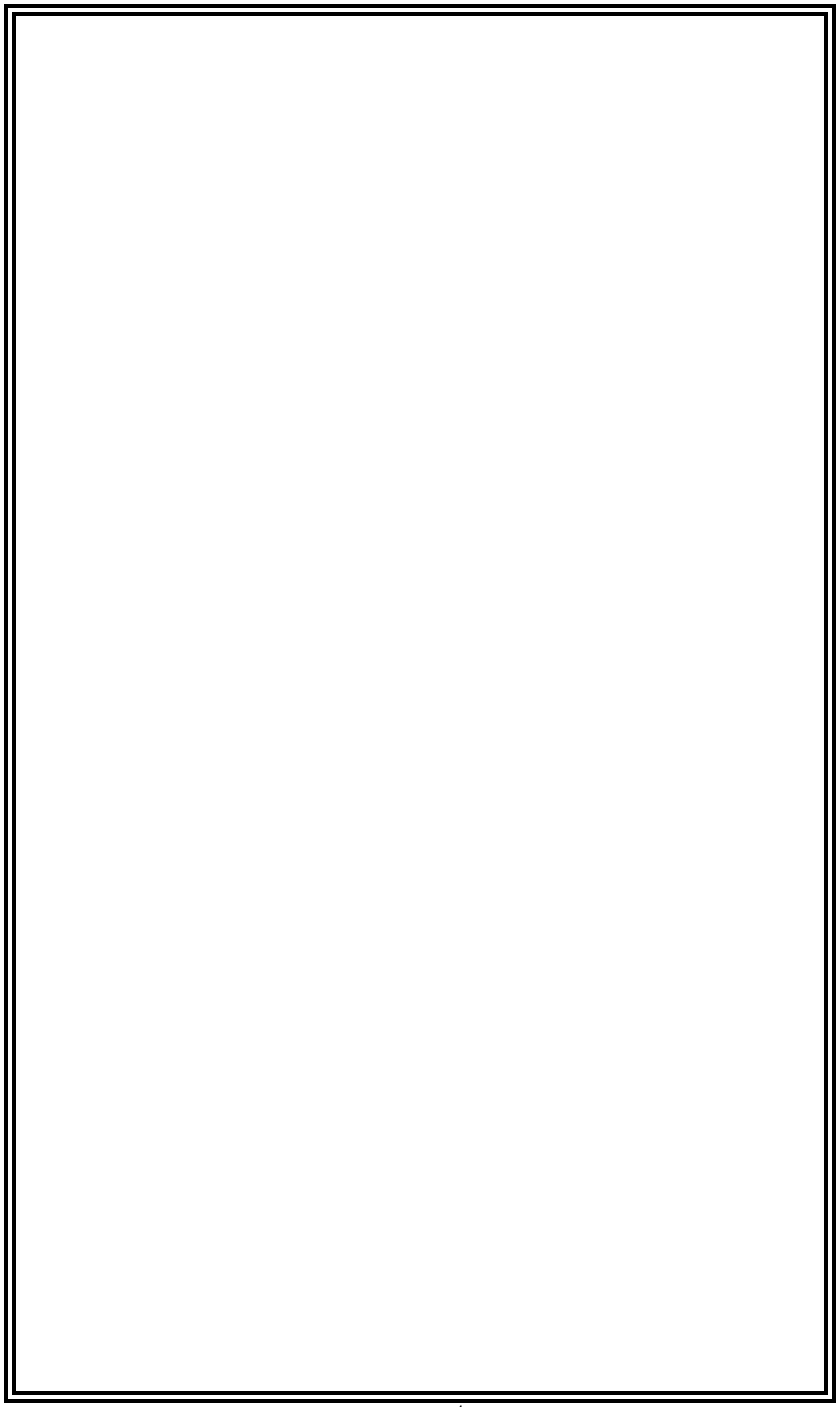

(۱۱۰) النصر

نام پہلی آیت میں نَصر (نُصرَتِ الٰہی) کے آنے کا ذکر ہوا ہے جس کی مناسبت سے اس سورہ کا نام "اَلنَّصر" ہے۔

زمانۂ نزول مدنی ہے اور حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی یہ آخری سورہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۴ ص ۵۶۱ بحوالۂ نسائی) سورہ کے مضمون سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے نیز جیسا کہ ابن عباس کا بیان ہے۔ اس سورہ میں یہ اشارہ موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے ابن عباس سے کہا کہ تم اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی ہے کہ جب اللہ کی نصرت اور فتح آ گئی تو آپ کا وقت آن پورا ہوا، لہٰذا آپ اللہ کی حمد و تسبیح اور استغفار کریں۔ حضرت عمر نے فرمایا میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ (بخاری کتاب التفسیر) معلوم ہوا کہ یہ سورہ اس وقت نازل ہوئی جب کہ آپ کی وفات کا وقت بالکل قریب آ گیا تھا۔

مرکزی مضمون نصرتِ الٰہی اور غلبۂ دین کے ظہور پر بارگاہ خداوندی میں نذرانۂ شکر پیش کرنا یعنی حمد و تسبیح اور استغفار کرنا۔

نظمِ کلام آیت ۱ میں اللہ کی نصرت اور اس کی طرف سے ظاہر ہونے والی فتح ۔۔۔ فتح مکہ ۔۔۔ کا ذکر ہے۔

آیت ۲ میں لوگوں کے اجتماعی شکل میں حلقہ بہ گوشِ اسلام ہونے کا ذکر ہے۔

آیت ۳ میں اس فضل کے حاصل ہونے پر خدا کی مزید حمد و تسبیح اور استغفار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

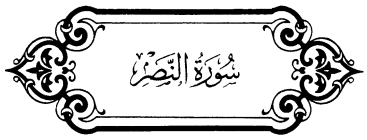

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

(۱۱۰) سُوْرَةُ النَّصْر

آیات ۳

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی۔ ۱

۲ اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔ ۲

۳ تو تسبیح کرو اپنے رب کی حمد کے ساتھ۔ ۳ اور اس سے مغفرت مانگو۔ ۴ یقیناً وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ۵

۱؎ نصر (مدد) سے مراد وہ نصرت ہے جس کا ظہور غلبۂ حق کی شکل میں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ لازماً ان کے مخالفین کے مقابلہ میں ان کی مدد فرمائے گا۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْھَادُ ۔ (المؤمن۔ ۵۱)

''یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان لانے والوں کی اس دُنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی کریں گے جب کہ گواہ کھڑے ہوں گے۔''

اس مدد کا پورا پورا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب کہ حق و باطل کی کشمکش آخری مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور یہی وہ مدد ہے جس کا انتظار رسول کے ساتھیوں کو ہوتا ہے۔

مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ ۔ (البقرہ ۔۲۱۴)

''کب آئے گی اللہ کی مدد؟ یقین جانو! اللہ کی مدد قریب ہے۔''

اور اسی مدد کو سورہ فتح میں نَصْرًا عَزِیْزًا (زبردست نصرت) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اور فتح سے مراد فتح مکہ ہے جو ایک فیصلہ کن فتح تھی اور جس کے بعد مشرکین کا زور ٹوٹ گیا اور عرب میں اسلام کو مکمل غلبہ حاصل ہوا۔

فتح مکہ کا واقعہ رمضان ۸ھ (جنوری ۶۳۰ء) کا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار جانباز ساتھیوں کو لے کر مدینہ سے روانہ ہو گئے تھے۔ مکہ میں آپ بغیر کسی قابل ذکر مزاحمت کے داخل ہوئے۔ اور اعلان فرمایا کہ جو شخص بھی ہتھیار ڈال دے گا اس کو امن دیا جائے گا۔ جو لوگ اسلام دشمنی میں پیش پیش رہے تھے ان کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور سے معاف کر دیا۔ اس موقع پر کتنے ہی لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ خانۂ کعبہ میں جو ایک بت شکن رسول ۔۔۔ حضرت ابراہیم ۔۔۔ کا تعمیر کردہ تھا قریش نے اس میں ۳۶۰ بت بٹھائے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نجاست سے خانۂ کعبہ کو پاک کیا۔ بتوں کو لکڑی سے گراتے جاتے اور یہ آیت پڑھتے جاتے:

جَاءَ الحَقُّ وَ زَھَقَ البَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا (بنی اسرائیل : ۸۱)

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا اور باطل مٹنے ہی کیلئے تھا۔''

ان بتوں میں سب سے بڑا بت ہبل تھا۔ بت پرست جنگ کے موقعہ پر اسی کی جے پکارتے تھے لیکن، آج وہ خود ڈھیر ہو گیا تھا۔ شکست سے دوچار ہونے والوں کی وہ کیا مدد کرتا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فتحیابی پر نماز شکر ادا کی اور صدائے تکبیر بلند کرتے ہوئے یہ حقیقت افروز اعلان فرمایا:

لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ صَدَقَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الاحزاب وَحْدَہٗ ۔ (ابو داؤ کتاب الدیات)

''اللہ جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں اس نے اپنا وعدہ سچا کیا، اپنے بندہ کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا شکست دی۔''

واضح رہے کہ عربی میں اِذَا عام طور سے مستقبل کے لئے آتا ہے۔لیکن کبھی کبھی ماضی کے لئے بھی آتا ہے۔اور یہاں قرینہ نیز، حضرت ابن عباس کا مذکورہ بیان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ماضی کے مفہوم میں ہے اس لئے ہم نے آیت کا ترجمہ ''جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی'' کیا ہے جب کہ عام طور پر اس کا ترجمہ ''جب اللہ کی مدد اور اس کی فتح آئے'' یا ''آئے گی'' کیا جاتا ہے۔

۲؎ فتح مکہ اثر قریش تک محدود نہیں رہا بلکہ عرب کے مختلف علاقوں میں جو قبائل آباد تھے ان پر اس کے زبردست اثرات پڑے۔ان قبائل کے نمائندے وفود کی شکل میں مدینہ آنا شروع ہوئے اور ۹ھ اور ۱۰ھ میں بہ کثرت وفود نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر قبول اسلام کا اعلان کیا اور اجتماعی شکل میں لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے۔جس دین کے لئے قریش اکیس سال تک رکاوٹیں پیدا کرتے رہے وہ دو سال کے اندر عرب کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا۔یہاں تک کہ اس سرزمین پر کوئی مشرک باقی نہ رہا۔گویا فتح مکہ اس زبردست انقلاب کی تمہید تھی۔

۳؎ یعنی غلبہ دین اور لوگوں کے قبول اسلام کا یہ روح پرور منظر جو آپ نے دیکھا نصرت الٰہی کا نتیجہ ہے۔اس لئے اس فضل کے حاصل ہو جانے پر اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔اور چونکہ آپ کی بعثت کا مقصد پورا ہو گیا ہے اس لئے آپ کو خدا کی حمد و تسبیح میں زیادہ مشغول ہو جانا چاہئے۔

اس سے یہ اہم حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اہل ایمان کا اصل نصب العین خدا کو پانا ہے اور اس کے لئے اپنی آخری سانس تک سعی و عمل کرنا ہے۔غلبۂ دین کی جدوجہد کے مرحلہ میں بھی اور اس کی تکمیل کے بعد بھی۔

۴؎ یعنی تمہیں خدا سے یہ دعا کرنا چاہئے کہ اس خدمت کو انجام دینے میں جو کوتاہیاں ہوئی ہوں اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں جو بھول چوک ہوئی ہو اُسے وہ معاف فرمائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دیکر اہل ایمان کی رہنمائی اس بات کی طرف کی گئی ہے کہ وہ کسی بھی خدمت کے انجام پانے یا کسی فتح و کامرانی کے حاصل ہو جانے پر دنیادار لوگوں کی طرح اترانے اور فخر کرنے کے بجائے اسے اللہ کے فضل اور اس کی توفیق کا نتیجہ سمجھیں۔اور اس کی حمد و تسبیح کریں کہ تعریف کا مستحق وہی ہے، نیز اس احساس کے ساتھ کہ معلوم نہیں اس خدمت کے انجام دینے میں کیا کیا کوتاہیاں ہوئی ہوں گی۔اپنے رب سے نہایت عاجزی کے ساتھ معافی کے خواستگار ہوں۔ایسے موقع پر اہل ایمان کا رویہ یہی ہونا چاہئے اور انہیں ان طور طریقوں سے احتراز کرنا چاہئے۔جو ان کے اندر احساس بندگی کے بجائے احساس برتری پیدا کرنے والے ہوں۔

ایسی عظیم فتح اور ایسا زبردست غلبہ حاصل ہو جانے کے بعد قرآن نے جشن منانے کا حکم نہیں دیا، بلکہ بارگاہ خداوندی میں شکر و بندگی کا نذرانہ پیش کرنے کا حکم دیا، جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ اعلیٰ تعلیم وحی الٰہی ہے اور اس کو پیش کرنے والی شخصیت پیغمبر خدا ہی کی شخصیت ہو سکتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دن میں سو مرتبہ استغفار پڑھا کرتے تھے۔(مسلم کتاب الذکر) نیز بخاری کی حدیث میں ہے کہ اس سورہ کے نازل ہونے کے بعد آپ رکوع و سجود میں بہ کثرت یہ پڑھا کرتے تھے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِکَ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ ۔

"پاکی تیرے ہی لئے ہے اے اللہ ہمارے رب میں تیری حمد کے ساتھ تیری پاکی بیان کرتا ہوں۔ خدایا میری مغفرت فرما۔

(بخاری کتاب التفسیر)

۵۔ اللہ تعالیٰ کی صفت تـوّاب (بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا) بیان ہوئی ہے جو منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو لئے ہوئے ہے۔ منفی پہلو کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر بندہ اس سے معافی مانگے اور توبہ کرے تو وہ اس کو معاف کر دیتا ہے اور اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔ اور مثبت پہلو کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ جب اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ بندہ کی طرف اپنی مہربانیوں کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہاں اس صفت کا ذکر اس مفہوم میں ہے کہ تم امید رکھو کہ وہ نہ صرف تمہاری معافی کی درخواست (استغفار) قبول فرمائے گا بلکہ تم پر اپنی نظر عنایت بھی فرمائے گا اور اپنی مہربانیوں کے ساتھ تمہاری طرف متوجہ رہے گا۔

(۱۱۱) اللَّھب

نـــــام آیت ۱ میں لہب کا لفظ آیا ہے جس کے معنیٰ شعلہ کے ہیں۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام ''اللَّہب'' ہے۔

زمانہٴ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہوگی۔کیوں کہ اس میں ابولہب کا نام لیکر اس کا انجام بد بیان کیا گیا ہے۔اور انبیاء علیہم السلام کسی کا انجام بد اس پر حجت قائم کرنے کے بعد ہی بیان کرتے ہیں۔اس لئے یہ سورہ، سورۂ کافرون کے بعد ہی نازل ہوئی ہوگی۔جس میں کافروں سے اعلان برأت کیا گیا ہے۔

مـرکـزی مـضـمـون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن کے انجام بد سے لوگوں کو آگاہ کرنا ہے، تا کہ قیامت تک پیدا ہونے والے دشمنان رسول اور مخالفین اسلام اس سورہ کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ لیں۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں دشمنِ رسول ابولہب کا دردناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۴ اور ۵ میں اس کی بیوی کے عبرتناک انجام کا منظر پیش کیا گیا ہے جو اس دشمنی میں اپنے شوہر کے ہمنوا اور شریک کار تھی۔

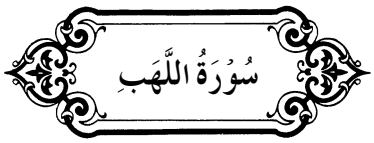

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١

مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣

وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤

فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥

(۱۱۱) سُورۃ اللَّھب

آیات ۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ ٹوٹ گئے ابولہب کے ۱ دونوں ہاتھ ۲ اور وہ تباہ ہوگیا۔ ۳

۲ اس کا مال اور اس کی کمائی اس کے کچھ کام نہ آئی۔ ۴

۳ وہ عنقریب شعلہ زن آگ میں داخل ہوگا۔ ۵

۴ اور اس کی بیوی بھی جو ایندھن اٹھائے ہوئے ہوگی۔ ۶

۵ اس کی گردن میں مضبوط رسی ہوگی ۔ ۷

۱؎ ابولہب کنیت ہے۔اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔جس کے معنیٰ ہیں عزیٰ دیوی کا بندہ۔چونکہ یہ مشرکانہ نام تھا اس لئے قرآن نے اس کا ذکر اس کے مکروہ نام سے کرنے کے بجائے اس کی کنیت سے کیا۔ابولہب قریش (خاندان، بنی ہاشم) کا رکن رکین، عبدالمطلب کا بیٹا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔جن وجوہ سے اس کی زندگی میں اس کی قسمت کا فیصلہ چکایا گیا۔اور اس کے انجام سے باخبر کرنے کے لے ایک مکمل سورہ نازل کی گئی وہ مختصراً درج ذیل ہے:۔

اولاً: ابولہب خانۂ کعبہ کا متولی تھا اور خدا کے گھر کو بت کدہ بنائے رکھنے پر اصرار نیز بت پرستی میں اس کا انہاک اس کا سب سے بڑا اور سنگین جرم تھا۔

ثانیاً: جو جاہ ومنصب اس کو حاصل تھا اس نے اس کے اندر غرور وتکبر پیدا کر دیا تھا۔اور سرکشی وبغاوت کا رویہ اختیار کر کے وہ فرعون کے مقام پر جا بیٹھا تھا۔

ثالثاً: دعوت اسلامی کی مخالفت کا آغاز اسی نے کیا تھا۔اس لئے امامت کفر اس کا مقدر بن گئی۔

رابعاً: وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کٹر دشمن تھا اور اس دشمنی میں اس نے تمام اخلاقی حدود کو پھاند ڈالا تھا۔یہاں تک کہ رشتۂ رحم کو کاٹنے میں وہ سب سے آگے نکل گیا۔اس کی واضح مثال اس کا وہ طرز عمل ہے جو اس نے آپ کے معاشرتی اور معاشی بائیکاٹ کے سلسلہ میں اختیار کیا۔قریش کے بائیکاٹ کرنے پر جب آپ نے شعیب ابی طالب میں پناہ لی، تو ابولہب نے کفار قریش کا ساتھ دیا اور اسے اپنے بھتیجے پر اس وقت بھی رحم نہیں آیا جب کہ وہ فاقہ کے دن گذار رہا تھا۔(ابن ہشام ج ۱ ص ۳۷۲)

خامساً: وہ زندگی بھر اسلام کی راہ کا کانٹا بنا رہا اور توحید کی مخالفت میں سب سے زیادہ سرگرم رہا۔چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام قبائل عرب کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو ابولہب اس سے لوگوں کو متنفر کرتا رہا۔ ربیعہ بن عباد کا بیان ہے کہ میں نے ذوالمجاز کے بازار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ لوگو! ''لاالٰہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) کہو فلاح پاؤ گے۔'' اور آپ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جاتا تھا کہ یہ شخص جھوٹا ہے اس کی بات نہ مانو۔میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے۔(ابن کثیر ج ۱ ص ۵۱۴ بحوالہ احمد)

سادساً: بخل اور زر پرستی میں وہ اپنے زمانہ کا قارون تھا۔

سابعاً: اس کو اپنے خداؤں پر بڑا ناز تھا۔چنانچہ اس نے نبی ﷺ کے بائیکاٹ میں قریش کا ساتھ دیتے ہوئے ہند بن عتبہ سے کہا تھا ''جس شخص نے لات وعزیٰ کو چھوڑ دیا ہے اس کو چھوڑ کر کیا میں نے ان خداؤں کی مدد نہیں کی؟ ہند نے کہا ''ہاں اور اللہ تجھے جزائے خیر دے'' (ابن ہاشم ج ۱ ص ۳۷۲)

ابولہب کے انجام کی یہ خبر درحقیقت اس بات کا اظہار ہے کہ اگر پیغمبر کا چچا بھی کفر کرے تو وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔اس کا قانون عدل بے لاگ اور خاندان ونسب کے اثرات سے بالاتر ہے۔

۲۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد اس کے جسمانی ہاتھوں کا تباہ ہو جانا بھی ہے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں وہ اٹھایا کرتا تھا اور اس کے زور کا ٹوٹ جانا اور اس کی شوکت کا ختم ہو جانا بھی۔ اس نے اللہ کے کلمہ کو پست کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں بری طرح ناکام رہا۔ جنگ بدر میں اس کا زور ٹوٹ گیا۔ اس کے حامی و ناصر بری طرح مارے گئے اور اس کی شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس طرح وہ پیشین گوئی پوری ہوئی جو اس آیت میں کی گئی تھی۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ'') (شعراء ۲۱۴) نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے صفا پر چڑھ کر پکارا: یا صباحاہ (صبح کے خطرہ سے ہوشیار!) لوگوں نے کہا یہ کون پکار رہا ہے؟ پھر وہ آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ نے فرمایا اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لئے آ رہا ہے تو کیا تم میری بات سچ مانو گے؟ لوگوں نے کہا ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا تو دیکھو میں تمہیں آنے والے عذاب عظیم سے خبردار کرتا ہوں۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ مَا جَمَعْتَنَا اِلَّا لِهٰذَا (تباہ ہو جائے تو۔ کیا تو نے ہمیں اسی لئے جمع کیا تھا؟) اس پر تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (ٹوٹ گئے ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ ہوا) نازل ہوئی۔ (بخاری کتاب التفسیر)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سورۂ لہب اُسی وقت نازل ہوئی، کیوں کہ جیسا کہ اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے، کسی کے حق میں عذاب کا فیصلہ اسی وقت سنایا جاتا ہے جبکہ اسے آخری حد تک مہلت دی جا چکی ہو اور اس کے بعد وہ اپنے کفر و سرکشی پر اڑا رہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابولہب کی یہی وہ حرکتیں تھیں جن کی وجہ سے بالآخر وہ معتوب قرار پایا اور یہ سورہ اس کی حرکتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب ہے۔

۳۔ جنگ بدر میں اس کے حامیوں کی شکست کا اسے زبردست صدمہ ہوا اور اس کے بعد وہ خود بھی تباہ ہوا۔ چنانچہ اس کی موت تباہی کی صورت میں ہوئی اور آخرت کا دردناک عذاب بھی اس کے لئے مقدر ہوا جنگ بدر میں وہ شریک نہیں ہوا اور اس جنگ کو ختم ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ چیچک کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی لاش تین دن تک اس کے گھر میں پڑی سڑتی رہی مگر کوئی اس کو ٹھکانے لگانے والا نہ تھا۔ کیونکہ قریش چیچک کے مرض کو چھوت کا مرض خیال کرتے تھے۔ بالآخر اس کے لڑکوں نے اس کی لاش ایک دیوار کی آڑ میں اس طرح دفن کر دی کہ دور ہی سے اس کی قبر پر پتھر پھینکتے رہے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۳۰۹)

آج ابولہب کا نام لینے والا کوئی نہ رہا، البتہ اس پر لعنت بھیجنے کے لئے ایک پوری امت موجود ہے۔ جو اپنی نمازوں میں سورۂ لہب پڑھ کر اس دشمن رسول پر لعنت بھیجتی رہتی ہے۔ اس طرح قرآن کی یہ پیشین گوئی کہ رسول کو غلبہ حاصل ہوگا اور دشمن رسول تباہ ہوگا۔ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ قرآن کی صداقت کا یہ ایسا ثبوت ہے جو تا قیامت باقی رہے گا۔

۴؎ یعنی نہ اس کی وہ دولت خدا کی پکڑ سے اسے بچا سکی جس پر اُسے ناز تھا اور نہ وہ اعمال ہی اس کے کچھ کام آ سکے جو جھوٹی مذہب پرستی کی بنیاد پر اس نے انجام دئے تھے۔

قرآن میں اعمال کے لئے کَسَب (کمائی) کا لفظ بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ یہاں بھی یہ اسی مفہوم میں ہے۔

۵؎ اس کا اخروی انجام ہے جو قیامت کے دن اس کے سامنے آئے گا۔

ابولہب اور نَارًا ذاتَ لَهَبٍ (بھڑکتی آگ) میں بڑی مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے دل میں بغض وحسد کی جو آگ تھی وہ قیامت کے دن بھڑک اٹھے گی۔ جزاء درحقیقت انسان کے عمل ہی کا نتیجہ ہے۔

۶؎ ابولہب کی بیوی کا نام ام جمیل تھا۔ یہ ابوسفیان کی بہن تھی اور چونکہ اسلام دشمنی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض وعداوت میں وہ اپنے شوہر کی معاون اور مخالفانہ سرگرمیوں میں اس کی شریک تھی اس لئے اس کا انجام بھی بیان فرمایا۔

وہ جہنم میں اپنے شوہر کے لئے ایندھن ڈھونے کا کام کرے گی، کیوں کہ اس نے عداوت کی آگ بھڑکائی تھی۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (ایندھن اٹھانے والی) کا مطلب سعید بن جبیر نے گناہوں کا بوجھ اٹھانے والی بیان کیا ہے (فتح القدیر للشوکانی ج ۵ ص ۵۱۲) قیامت کے دن مجرمین کا جو حال ہوگا وہ قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ''وہ اپنے بوجھ اپنے پیٹھوں پر لادے ہوئے ہوں گے'' (الانعام۔ ۳۱)

۷؎ یعنی جہنم میں اس کی گردن میں مضبوط رسی پڑی ہوئی ہوگی۔ گویا اس کا حال اس لونڈی کا سا ہوگا جو سر پر لکڑیاں (ایندھن) اٹھائے ہوئے ہو اور جس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی پڑی ہو۔ قیامت کے دن اسے ذلت کا جو عذاب چکھنا ہوگا اس کی یہ تصویر ہے۔

سعید بن مسیّب کہتے ہیں کہ اس کی گردن میں جواہرات کا قیمتی ہار تھا اور وہ کہا کرتی تھی کہ لات وعزّیٰ (بتوں کے نام) کی قسم! میں اسے محمد کی عداوت میں خرچ کروں گی اس لئے قیامت کے دن اس کے جسم میں یہ ہار عذاب کا موجب ہوگا۔ (فتح القدیر للشوکانی ج ۵ ص ۵۱۳)

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس ہار پر اسے ناز ہے۔ اور جس کو وہ مخالف رسول سرگرمیوں میں خرچ کرنا چاہتی ہے وہ قیامت کے دن واقعی ''اس کے گلے کا ہار'' ثابت ہوگا۔ اور اس کا یہ سامان آرائش اس کی رسوائی کا باعث ہوگا۔

ابولہب کی بیوی کے اس انجام میں عورتوں کے لئے بھی عبرت ہے اور مردوں کے لئے بھی۔ عورتوں کے لئے یہ عبرت کہ ایک عورت کفر وسرکشی کا رویہ اختیار کر کے کتنے برے انجام کو پہنچ جاتی ہے اور مردوں کے لئے یہ عبرت کہ عورتیں کس طرح گناہ کے کاموں میں مردوں کی معاون بن کر ان کو تباہی کی طرف دھکیلتی رہتی ہیں۔

***

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا اِمروز

چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی

***

(۱۱۲) الاخلاص

نام اس سورہ کا ایک نام تو پہلی آیت قُل ھُواللّٰہُ اَحَدٌ کو ہی قرار دیا گیا ہے اور دوسرا نام اس کے مضمون کی مناسبت سے ''الاخلاص'' ہے کیوں کہ یہ خالص توحید کے بیان پر مشتمل ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے۔ اور مضمون نیز اسلوب کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دعوت کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہوگی، کیوں کہ اس دور میں مختصر فقروں میں دین کی بنیادی باتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کی توضیح و تفصیل بعد کی سورتوں میں کی گئی ہے۔

ابتدائی دور میں نازل ہونے کا ایک قرینہ حضرت بلال کا یہ واقعہ ہے کہ جب انہیں امیہ بن خلف سخت دھوپ میں لٹا کر ان کے سینہ پر بڑا پتھر رکھ دیتا اور کہتا کہ اسی حال میں تجھے مرنا ہوگا، الا یہ کہ تو محمد کا انکار کر کے لات و عُزّیٰ کو پوجنے لگے، تو اس کے جواب میں وہ اَحد اَحد کہتے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۵۸) معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک سورۂ اخلاص نازل ہو چکی تھی اور اَحد کا لفظ اسی سورہ کا تھا جو زبان زد ہو گیا تھا۔

مرکزی مضمون توحید ہے اور خاص طور سے اس کا یہ پہلو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا صحیح تصور پیش کرنا، تاکہ مشرکانہ تصورات کی جڑ کٹ جائے۔

نظم کلام آیت ۱ اور ۲ میں مثبت پہلو سے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ اور آیت ۳ اور ۴ میں منفی پہلو سے، تاکہ قوموں اور ملّتوں میں جن راہوں سے شرک داخل ہوا ہے وہ مسدود ہوں۔

اھمیت و عظمت سورہ اخلاص درحقیقت قرآن کی آخری سورہ ہے، کیوں کہ اس کے بعد کی دو سورتیں اسی تصور توحید سے ابھری ہیں۔ اور اس تصور توحید، نیز پورے قرآن کی حفاظت کا سامان ہیں۔ قرآن کا آغاز توحید سے ہوا تھا اور اختتام بھی توحید ہی پر ہوا ہے۔ اس سے توحید کی اہمیت نیز اس سورہ کی عظمت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

علامہ فراہی فرماتے ہیں: ''اگرچہ یہ سورہ اپنے ظاہری انداز کے لحاظ سے تمام سورتوں میں ایسی چھوٹی ہے جیسی تمام بدن میں آنکھ کی ''پتلی'' مگر سارا عالم ہدایت اسی سے روشن نظر آتا ہے۔'' (مجموعہ تفاسیر فراہی ص ۵۲۵)

سورۂ اخلاص کی یہ فضیلت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنَّہَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ سورۂ (قل ھُوَ اللّٰہ احدٌ) قرآن کے ایک تہائی حصہ کے برابر ہے۔'' (بخاری کتاب فضائل القرآن)

اس کی یہ فضیلت معانی قرآن کے اعتبار سے ہے، کیوں کہ قرآن میں توحید کا مضمون اس کثرت سے بیان ہوا ہے کہ گویا اس کا ایک تہائی حصہ اسی پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ سورۂ اخلاص میں اس اہم اور پھیلے ہوئے مضمون کو چار مختصر فقروں میں اس طرح سمیٹ دیا گیا ہے جیسے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہو۔ اس لئے اسے ایک تہائی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ رہی اس کی تلاوت کی برکتیں تو اس سے وہی لوگ فیضیاب ہو سکتے ہیں جو توحید خالص پر ایمان رکھتے ہوں اور اپنے عقیدہ میں شرک کا کوئی شائبہ نہ آنے دیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ①

اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ②

لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ ③

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۚ ④

(۱۱۲)سُورۃُ الاخلاص

آیات ۴

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ کہو ۱ ۔وہ ۲ اللہ یکتا ہے۔ ۳

۲ اللہ وہ بالاتر ہستی ہے جو سب کا مرجع وملجا ہے۔ ۴

۳ نہ اس کی کوئی اولاد ہے ۵ ۔اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ ۶

۴ اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔ ۷

۱ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور آپ کے واسطے سے ہر اس شخص سے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہو۔ کہنے سے مراد اظہار و اعلان ہے۔

۲ آیت میں ھُوَ (وہ) عربی قواعد کی رُو سے ضمیر شان ہے جو کسی بات کی اہمیت کو واضح کرنے اور اس پر توجہ کو مرکوز کرانے کیلئے جملہ کے آغاز میں آتی ہے۔ اور اس سے کلام میں بڑی فصاحت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ھُوالزمان غدار (وہ زمانہ ہے جو بے وفائی کرتا ہے)۔ آیت قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ (کہو وہ اللہ یکتا ہے) میں ھُوَ (وہ) کی ضمیر، بیان کی اہمیت واضح کر رہی ہے کہ اسے کان لگا کر سنو اور اس پر اپنی توجہ مرکوز کرو۔

۳ ''اللہ یکتا ہے'' یعنی وہ اپنی ذات اور صفات میں بالکل منفرد ہے۔ واحد (ایک) کے مقابلہ میں اَحَد (یکتا) کا لفظ اس بات کی صراحت کرتا ہے کہ اس کی وحدت میں کثرت کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اور اس کی وحدانیت ایسی کامل ہے کہ نہ اس کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور نہ تقسیم۔ اس کا وجود مستقل بالذات ہے اور مخلوقات سے بالکل الگ ہے۔ خداؤں کی کوئی جنس نہیں بلکہ وہ ایک ہی خدا ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

انسان کی فطرت خدا کے اس تصور سے آشنا ہے۔ اس کے وجدان کی پکار بھی یہی ہے۔ اور اس کی عقل بھی اسی کی شہادت دیتی ہے، نیز کائنات کا ذرہ ذرہ اور اس کا پورا نظام اسی پر دلالت کرتا ہے۔

وَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ آیَۃٌ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ

''ہر چیز میں اس کی نشانی ہے۔ جو اس کی وحدت پر دلالت کرتی ہے۔'' اس کا اَحَد (یکتا) ہونا کائنات کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ ابھری ہوئی اور سب سے زیادہ بنیادی حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے جن لوگوں نے خدا کے بارے میں سوچا ان کو ایسی زبردست ٹھوکر لگی کہ پھر وہ سنبھل نہ سکے۔ اس سلسلہ کی بنیادی غلطی خدا کو مخلوق پر قیاس کرنا ہے۔ جب کہ یہ بات بالکل بدیہی ہے کہ خالق اور مخلوق میں کسی پہلو سے بھی مشابہت ممکن نہیں ہے اور نہ ہماری محدود عقل اس قابل ہو سکتی ہے کہ اس کی ذات میں غور و خوض کرنے لگے۔ اسلئے اس کے یکتا و یگانہ ہونے کے سیدھے سادے تصور کو چھوڑ کر جتنے فلسفے بھی اہل مذاہب نے خدا کے وجود کے بارے میں ایجاد کئے ہیں وہ سب بے حقیقت اور یکسر باطل قرار پاتے ہیں۔ ظاہر ہے جب پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی تو کتنی ہی بلند عمارت کیوں نہ تعمیر کی جائے وہ ٹیڑھی ہی ہوگی۔

رہے مادہ پرست لوگ جو خدا کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو ان کا یہ انکار فطرت انسانی کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور جو شخص اپنی فطرت ہی سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو اس کو کوئی بات بھی دلیل سے منوائی نہیں جا سکتی۔ انسان اپنی آنکھیں پھوڑ دینے کے بعد کسی بھی چیز کے وجود سے انکار کر سکتا ہے۔ ایسے شخص کو کوئی چیز بھی نہیں دکھائی جا سکتی۔

جہاں تک انبیائی ہدایت کا تعلق ہے بلا استثناء تمام پیغمبروں نے توحید ہی کی تعلیم دی تھی، چنانچہ بائبل میں باوجود تحریفات کے توحید کا تصور بنیادی طور سے موجود ہے مثلاً تورات میں ہے: ''سن اے اسرائیل! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔'' (استثناء ۶:۴) ''جو کوئی واحد خداوند کو چھوڑ کر کسی اور معبود کے آگے قربانی چڑھائے وہ بالکل نابود کر دیا جائے۔'' (خروج ۲۲: ۲۰) اور زبور میں ہے: ''تو ہی واحد خدا ہے۔'' (زبور ۸۶ : ۱۰)

لیکن انبیاء علیہم السلام کی اس بنیادی تعلیم سے قوموں اور ملتوں نے انحراف کیا اور گمراہی میں پڑ گئیں۔ اس انحراف کی ایک مثال تو

عیسائی مذہب کا عقیدۂ تثلیث (Trinity) ہے جو باپ، بیٹا اور روح القدس تین خداؤں کے مجموعہ کا نام ہے۔اور اس کی دوسری مثال ہمارے ملک کے بت پرستوں کا تری مورتی۔۔۔۔۔(Trimurty त्रिमूर्ति) کا عقیدہ ہے جو تین دیوتاؤں برہما، وشنو اور شیو کے مجموعہ کا نام ہے ان کا مذہبی نشان ''اوم'' (Om ओम) تین خداؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔

'In later times, Om is the mystic name for the Hindu triad,and represents the union of the three gods viz.a (Vishnu).u (Shiva).m(Brahma).(A Snskrit - English Dictionary by Sir Monier, Oxford p.235)

اور ویدوں کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر سی کنہن راجا اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہم توحید کے تصور سے ہمیشہ ناآشنا رہے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

Reads the Mahabharata. it will be found that every divinity is in his turn a Supreme God head. This is exactly what is found in the vedas too ------ and there never came a stage when there was only one God '' (the Quintessence of the Rigveda p. 11)

۴؎ متن میں لفظ اَلصَّمَدُ استعمال ہوا ہے جس کے معنی میں بڑی وسعت ہے۔اس لئے کسی ایک لفظ میں اس کا ترجمہ کرنا مشکل ہے۔

صمد کے لغوی معنیٰ ہیں وہ جس کا قصد کیا جائے اور یہ اس سردار کے لئے بولا جاتا ہے جس سے بالاتر کوئی دوسرا شخص نہ ہو اور جس کی طرف لوگ اپنی ضرورتوں اور معاملات میں رجوع کرتے ہوں۔اسی طرح صمد اس چٹان کو بھی کہا جاتا ہے ،جس کی دشمن کے حملہ کے وقت پناہ لی جائے، نیز اس ٹھوس چیز کو بھی کہتے ہیں جسمیں جوف نہ ہو۔

ان لغوی معنیٰ کے پیش نظر آیت میں اللہ تعالیٰ کیلئے اَلصَّمَد کی جو صفت بیان ہوئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بالاتر ہے، اس کی سیادت کامل ہے۔وہی مقصود و مرجع ہے، وہی ملجا و ماویٰ ہے، وہ بے نیاز ہے، اسے کسی چیز کی حاجت نہیں جب کہ سب اس کے محتاج ہیں اور وہ سب کی حاجتوں کو پورا کرنے والا ہے۔وہ پناہ کی چٹان ہے جیسا کہ زبور میں کہا گیا ہے:

''خداوند میری چٹان اور میرا قلعہ اور میرا چھڑانے والا ہے'' (زبور ۱۸:۲) ''اے خداوند تو ہی میری پناہ ہے۔'' (زبور ۷۱:۱)

اس کی صمدیت کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ نہ تو کوئی چیز اس کے اندر داخل ہوتی ہے۔اور نہ کوئی چیز اس کے اندر سے خارج ہوتی ہے اس لئے اس کے اولاد ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔اور وہ اس بات سے بھی پاک ہے کہ انسان اس میں ضم ہو جائے جیسا کہ ہمارے ملک کے مشرکین کا عقیدہ ہے۔

۵؎ یہاں پھر انسان نے ٹھوکر کھائی کہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے اس کے لئے اولاد تجویز کر بیٹھا، حالانکہ یہ بات عقلاً بھی غلط ہے اور نقلاً بھی۔عقلاً اس لئے غلط ہے کہ کسی کو خدا کا بیٹا ماننے کی صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ خدا کا جزء ہے، کیوں کہ بیٹا باپ کا جزء ہوتا ہے۔اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدائی قابل تجزیہ اور قابل تقسیم ہے، نیز اس سے لازم آئے گا کہ اس کی کوئی بیوی ہو اور کسی کی بیوی اس کی ہم جنس ہی ہو سکتی ہے، لہٰذا ماننا پڑے گا کہ خدا کی بھی جنس ہے۔ظاہر ہے اس سے زیادہ گھٹیا اور لغو تصور خدا کے بارے میں اور کیا ہو سکتا ہے؟ مگر اس صریح خلافِ عقل تصور کو اہل مذاہب نے محض جذبات سے مغلوب ہو کر اور غلو کا شکار ہو کر قبول کر لیا اور خدا کے لئے بیٹے اور

بیٹیاں تجویز کیں۔نقلاً یہ بات اس لئے غلط ہے کہ خدا نے بندوں کی ہدایت کے لئے جو کتابیں بھی نازل فرمائیں ان میں توحید ہی کی تعلیم دی گئی تھی۔ان کتابوں کے جو اجزاء ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں سارا زور توحید پر دیا گیا ہے۔رہا بائبل کا وہ حصہ جس میں حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے تو اولاً یہ بات تورات، زبور اور انجیل کی واضح اور بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔تورات بائبل کے مجموعہ میں سب سے پہلی اور سب سے قدیم کتاب ہے۔اس لئے اس کی تعلیم کے خلاف انا جیل رابعہ کے بیان کی حیثیت تحریف ہی کی قرار پاتی ہے۔ثانیاً انا جیل اربعہ میں جہاں حضرت مسیح کے لئے ''بیٹا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں عمومیت کے ساتھ خدا کے نیک بندوں کے لئے بھی خدا کے بیٹے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں: مثلاً:

''مبارک ہے وہ صلح کراتے ہیں کیوں کہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔'' (متی ۵ : ۹)

بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات مجازی معنیٰ میں کہی گئی ہے نہ کہ حقیقی معنیٰ میں۔لیکن اگر توحید کی اس تعلیم کو سامنے رکھا جائے جو تورات، زبور اور انجیل کے اوراق میں پھیلی ہوئی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ عبد (بندہ) کے لفظ کو ابن (بیٹا) سے بدل دیا گیا ہے۔اسی طرح لفظ رب (پروردگار۔مالک) کی جگہ اب (باپ) کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔متی کی انجیل میں ہے:

''پس تم اس طرح دعا کیا کرو کہ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔'' (متی ۹:۶)

یہ کھلی ہوئی تحریف ہے جو یا تو ان کتابوں کے مؤلفین نے کی ہے یا ان کے مترجمین نے کیوں کہ انجیل ہی میں واضح طور سے کہا گیا ہے:

''یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے اے اسرائیل سن۔خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے، اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔'' (مرقس: ۱۲، ۲۹، ۳۰)

خدا کے لئے اولاد تجویز کرنے میں نصاریٰ منفرد نہیں ہیں بلکہ دوسری قومیں بھی اس گمراہی میں شریک ہیں۔یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں اور مشرکین مکہ نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں ٹھہرایا تھا۔اس سے بھی دو قدم آگے ہندوستان کے بت پرست ہیں جو نہ صرف بے شمار خداؤں کے قائل ہیں بلکہ ان کی اولاد کے بھی۔مثلاً:

The Maruts are the sons of Rudra. another great god in the Rigveda" (the Quintessence of the Rigveda p.45)

ان کے نزدیک مہد برہما وہ رحم ہے جس میں بھگوان باپ کی حیثیت سے اپنا تخم ڈال دیتا ہے جس سے مخلوق جنم لیتی ہے چنانچہ گیتا میں ہے:

Mahad- Brahma is the womb wherein I cast My Primal seedling whence are born all creatures. Wharever beings are born from any womb Mahad - Brahma is their Primal mother and I Their Primal Father who inseminate her."

(The Bhagavad gita 14.-3 -4 Engl. Transl. by Dilip Kumar roy p.160)

لیکن قرآن نے خدا کی معرفت ایسے صاف ستھرے حقیقت افروز اور دل لگتے انداز میں پیش کی ہے کہ اس روشنی کے سامنے ساری تاریکیاں کافور ہوگئی ہیں۔

۶ وہ خدا ہی کیا ہوا جسے کسی نے جنم دیا ہو؟ لیکن مشرکانہ مذاہب میں خداؤں کے جنم لینے کا تصور پایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر رِگ وید میں خداؤں کی پیدائش کا ذکر موجود ہے:

"There is a song about the birth of gods (x.72). The gods are spoken of generlly as having been born from the heaven and the earth and in various other ways."(Quintessence of the Rigveda p.100)

اسی مشرکانہ تصور کی یہاں نفی کی گئی ہے کہ جس طرح اللہ کی کوئی اولاد نہیں اسی طرح اس کا کوئی بھی باپ بھی نہیں ہے۔ جنم لئے ہوئے خدا تو فرضی خدا ہی ہو سکتے ہیں حقیقی خدا تو سب کا خالق ہے وہ مخلوق کیونکر ہو سکتا ہے؟ وہ تنہا اللہ ہی کی ذات ہے جس سے نہ کوئی چیز جنم لیتی ہے اور نہ کسی نے اسے جنم دیا ہے۔۔۔۔۔ کس قدر خدا کے شایان شان ہے قرآن کا یہ تصور توحید!

ے یعنی نہ اللہ کی ذات میں اس کی برابری اور اس کے جوڑ کا کوئی ہے اور نہ اس کی صفات میں۔ سب مخلوق ہیں اور وہ تنہا خالق، سب محتاج ہیں اور وہ اکیلا غنی و بے نیاز، سب بندے اور غلام ہیں اور وہ ایک معبود و آقا۔ اس کے مانند اور اس کے ہم رتبہ نہ کبھی کوئی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

اس واضح حقیقت کے باوجود مشرکین نے خدا کے ہمسر ٹھہرائے۔ اس معاملہ میں ہندوستان کے مشرکین سب سے آگے ہیں۔ انہوں نے خالق اور مخلوق دونوں کو ایک مخلوط وجود (ہمہ اوست) قرار دیا۔ ان کی مذہبی کتاب اُپنِشد میں شرک کو ایک فلسفہ کو حیثیت سے پیش کیا گیا ہے:

"All that exists, says the Upanishad.is He, He is that All and the All is he.(The Upanishad by M.P.Pandit p. 154)

"The Self or Soul of everyone is Brahman." (upanishad by swami sivananda p. 16)

ان کی دوسری مذہبی کتابوں میں بھی خدا کا تصور بہت الجھا ہوا ہے:

"There is no Personal Supreme God in the religion of Vedas."(The Qunitessence of the Ridveda P. 7)

"He is in all and all are in Him --- He descenceas the Avatar." (The Bhagavad Gita-A Revelation by D.K. Roy P.33)

"Lord,I behold in Your body all Gods."(The Bhagavad Gita - Ch xl : 15)

جو لوگ ان مشرکانہ فلسفوں میں اُلجھ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں ان کی نجات اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ وہ تعصّبات کو چھوڑ کر قرآن کی روشنی کو قبول کر لیں۔

الفلق (۱۱۳)

نام پہلی آیت میں لفظ فلق آیا ہے جس کے معنیٰ صبح کے ہیں۔اس مناسبت سے اس سورہ کا نام "اَلْفَلَق" ہے۔سورۂ فلق سورۂ ناس دونوں استعاذہ کی سورتیں ہیں اس لئے ان کا مشترکہ نام مُعَوِّذَتَیْن (پناہ والی سورتیں) بھی ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی ہوگی جب کہ شیطانی قوتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شر پہنچانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور آپ کے مخالفین حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔

مرکزی مضمون بندوں کو اس بات کی تعلیم دینا ہے کہ وہ ہر قسم کے شر کے مقابلہ میں اللہ ہی کی پناہ ڈھونڈیں کہ وہی اکیلا پناہ دہندہ ہے۔اس سلسلہ میں ایسے دعائیہ کلمات سکھائے گئے ہیں جو استعاذہ کے لئے موزوں ترین ہیں۔

نظم کلام آیت ۱ میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ بندہ پناہ کے لئے اسی ہستی کی طرف رجوع کرے جس کی ربوبیت کے کرشمے وہ رات دن دیکھ رہا ہے۔

آیت ۲ تا ۵ میں بتایا گیا ہے کہ کن کن چیزوں کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔

فضیلت اس سورہ میں، نیز اس کی بعد والی سورہ میں پناہ مانگنے کے لحاظ سے جو جامع کلمات اور جو مؤثر دعا ارشاد ہوئی ہے اس کی اہمیت و فضیلت حدیث میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔عُقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اُنْزِلَتْ عَلَیَّ آیَاتٌ لَمْ یُرَ مِثْلُہُنَّ قَطُّ: اَلْمُعَوِّذَتَیْنِ " مجھ پر ایسی آیات نازل ہوئی ہیں جو بالکل بے مثال ہیں یعنی اَلْمُعَوِّذَتَیْن ۔" (مسلم کتاب صلاۃ المسافرین)

برکتیں حدیث میں آتا ہے:

عَنْ عَائِشَۃَ رضی اللّٰہُ عنہا قَالَتْ کَانَ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا آوٰی اِلٰی فِرَاشِہٖ نَفَثَ فِیْ کَفَّیْہِ بِقُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ وَبِالْمُعَوِّذَتَیْنِ جَمِیْعًاثُمَّ یَمْسَحُ بِھِمَاوَجْھَہٗ وَمَا بَلَغَتْیَدَاہُ مِنْ جَسَدِہٖ ۔	" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر جاتے تو اپنے دونوں ہاتھوں میں قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ اور مُعَوِّذَتَیْن پڑھ کر پھونکتے پھر ان کو اپنے چہرے اور جسم پر جہاں تک کہ ہاتھ پہنچ جاتا پھیر لیتے۔"

(بخاری کتاب الطب)

تعویذ گنڈوں سے بچتے ہوئے ان سورتوں کی برکتوں سے فیض اور شفاء حاصل کرنے کا یہ صحیح اور مسنون طریقہ ہے۔مگر یاد رہے کہ سورہ کا اصل مقصد توحید پر جمے رہنا، اس کے تقاضوں کو پورا کرنا اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا ہے کہ عقائد میں شرک کا کوئی شائبہ نہ پایا جائے۔جو لوگ اس مقصدِ عظیم کو نظر انداز کر کے کلامِ الٰہی کی صرف ظاہری برکتوں کو حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں ان کی مثال اس پیاسے شخص کی سی ہے جو دریا کے کنارے بیٹھ کر اپنے ہاتھ اور منہ دھو لیتا ہے مگر پانی پینے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ظاہر ہے اس کے اس عمل سے ہاتھ اور منہ تو دھل جائیں گے لیکن اس کی پیاس ہرگز بجھ نہ سکے گی۔

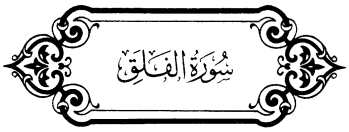

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

(۱۱۳)سُورۃُ الفلق

آیات ۵

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ کہو ، ۱ میں پناہ مانگتا ہوں ۲ صبح کے رب کی۔ ۳

۲ جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے اس کے شر سے ۔ ۴

۳ اور اندھیری رات کے شر سے جب کہ وہ چھاجائے۔ ۵

۴ اور گرہوں میں پھونکنے والوں کے شر سے۔ ۶

۵ اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے۔ ۷

۱؎ یعنی اللہ سے یہ دعا کیا کرو اور اس کی پناہ ان کلمات کے ذریعہ مانگا کرو۔ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور آپ کے واسطہ سے ہر اس شخص سے جو قرآن پر ایمان لایا ہو۔

۲؎ پناہ کے معنیٰ حفاظت، بچاؤ اور امان کے ہیں۔ اور پناہ مانگنے سے مراد اپنی حفاظت کے لئے پناہ دینے والی ہستی سے دعا کرنا، اس کی طرف رجوع کرنا، اس کا سایۂ عاطفت ڈھونڈنا اور اس کے سہارے کو مضبوطی کے ساتھ تھام لینا ہے۔ پس یہاں اَعُوْذُ (میں پناہ مانگتا ہوں) کا مطلب یہ ہے کہ میں خدا کو واحد پناہ دہندہ مان کر اپنے کو اس کی حفاظت میں دے دیتا ہوں وہی ہر قسم کے شر سے بچانے والا ہے اور میں اسی سے بندگی کا تعلق استوار کرتا ہوں۔

واضح رہے کہ کسی کو حقیقی معنیٰ میں پناہ دہندہ سمجھنا اس کو خدا قرار دینا ہے۔ اس لئے اللہ کے سوا کسی کی پناہ مانگنا جیسا کہ مشرکین دیوی دیوتاؤں کی پناہ مانگتے ہیں کھلا شرک ہے۔

۳؎ یعنی جو رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر کے صبح کو نمودار کرتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ (رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح نمودار کرنے والا۔ الانعام:۹۶) یہاں اللہ کی صفت ربوبیت کے ساتھ اس کے اس کرشمۂ قدرت کا ذکر اس معنیٰ میں ہے کہ گویا پناہ لینے والا اپنے اس یقین اور اطمینان کا اظہار کر رہا ہے کہ جو ہستی تاریکی کو پھاڑ کر صبح کو ظہور میں لاتی ہے وہ مایوس کن حالات میں امید کی کرن بھی پیدا کرے گی۔ اور فتنوں کے ہجوم کو چھانٹ کر امن و عافیت کی راہ بھی کھولے گی۔

۴؎ اس آیت پر غور کرنے سے درج ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

(۱) سب چیزیں اللہ ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ خالق تنہا وہی ہے اور مالک بھی وہی، اسلئے کوئی چیز بھی خالق کائنات سے زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا مخلوق کے شر سے بچنے کے لئے خالق کی پناہ ڈھونڈنا ہی صحیح طرز عمل ہے۔ برخلاف اس کے مخلوق کے شر سے بچنے کے لئے مخلوق ہی کی دہائی دینا خواہ اس مقصد کے لئے آدمی کسی دیوی دیوتا کو پکارے یا کسی ''غوث'' اور ''ولی'' کو، سراسر حماقت اور یکسر باطل ہے۔

(۲) ''جو کچھ اس نے پیدا کیا اس کے شر سے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی پیدا کردہ ہر چیز میں لازماً شر کا پہلو ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کی پیدا کردہ چیزوں میں سے جو چیزیں بھی اپنے اندر شر کا کوئی پہلو رکھتی ہیں ان سب کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

(۳) کوئی چیز بھی اپنی ذات میں مؤثر نہیں ہے اور نہ کوئی شر خود بخود کسی کو لاحق ہوتا ہے۔ بلکہ ہر چیز اللہ کے حکم ہی سے اثر انداز ہوتی ہے اور جو شر بھی کسی کو لاحق ہوتا ہے۔ اس کے اذن ہی سے ہوتا ہے اس لئے شر سے بچنے کے لئے اسی سے دعا کرنا چاہئیے اور اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئیے ۔

(۴) شر سے مراد محسوس ہونے والی آفتیں اور بلائیں بھی ہیں اور معنوی مضرتیں اور گمراہیاں بھی، پہلی چیز کی مثال بیماریاں اور ایذائیں ہیں اور دوسری چیز کی مثال گناہ اور کفر و شرک ہے۔ سیاق کلام کے لحاظ سے شر کا یہ دوسرا پہلو خاص طور سے مراد ہے۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مُعَوِّذَتَیْنِ کو قرآن کے بالکل آخیر میں رکھا گیا

ہے۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کے ذریعہ جس ہدایت سے نوازا گیا ہے اس کی حفاظت کے سلسلہ میں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے تاکہ شر پسند قوتیں اثر انداز نہ ہونے پائیں، اور بھٹکانے میں کامیاب نہ ہوں۔

۵ پچھلی آیت میں مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا ذکر عمومیت کے ساتھ ہوا ہے۔ اب بعض خاص چیزوں کے شر سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کی ہدایت کی جارہی ہے۔

رات آتی ہے تو تاریکی چھا جاتی ہے اور اس کی تاریکی میں شر پسند عناصر اور شیطانی قوتوں کے ابھرنے کا موقع ملتا ہے۔ ظاہری اور جسمانی آفتوں کے اعتبار سے بیماریاں رات میں بڑھتی ہیں اور موذی جانور رات میں نکلتے ہیں۔ غرضیکہ رات کو ڈر اور خوف کا ماحول رہتا ہے۔ رہی باطنی اور اخلاقی آفتیں تو رات میں جرائم کثرت سے ہوتے ہیں۔ اکثر سازشیں رات ہی میں کی جاتی ہیں اور شیطان اپنے لشکر کے ساتھ رات کی تاریکی ہی میں حملہ آور ہوتا ہے۔ اس لئے رات کی ظاہری تاریکی باطنی تاریکی کا موجب ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس شر کی طرف سے چوکنا رہنے اور اس سے خدا کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔

واضح رہے کہ رات کی طرف شر کو منسوب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رات میں خیر کا نزول نہیں ہوتا یا خیر کے کام انجام نہیں پاتے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ رات کا وقت شیطانی قوتوں کے لئے شر پھیلانے کے تعلق سے بڑا سازگار ہوتا ہے۔

۶ عُقَد (گرہوں) سے مراد وہ گرہیں ہیں جو شیاطین انسان کے شعور اور اس کے حواس پر لگا کر اسے غافل اور مدہوش بنا دیتے ہیں، چنانچہ صحیحین کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَعْقِدُ الشَّيْطَانُ عَلٰى قَافِيَةِ رَاْسِ اَحَدِكُمْ ثَلَاثَ عُقَدٍ اِذَا نَامَ ۔ بِكُلِّ عُقْدَةٍ يَضْرِبُ عَلَيْكَ لَيْلاً طَوِيلاً ۔ فَاِذَا اسْتَيْقَظَ فَذَكَرَ اللّٰهَ عُقْدَةٌ وَاِذَا تَوَضَّأَ انْحَلَّتْ عَنْهُ عُقْدَتَانِ ۔ فَاِذَا صَلّٰى انْحَلَّتِ الْعُقَدُ فَاَصْبَحَ نَشِيْطًا طَيِّبَ النَّفْسِ وَاِلَّا اَصْبَحَ خَبِيْثَ النَّفْسِ كَسْلَانَ (مسلم كتاب صلاة المسافرين)

"جب تم میں سے کوئی شخص سوتا ہے تو اس کے سر کے پچھلے حصہ پر شیطان تین گرہیں لگاتا ہے۔ اور ہر گرہ کے ساتھ یہ بات بھی چسپاں کر دیتا ہے کہ ابھی رات لمبی ہے۔ پھر جب وہ شخص جاگ اٹھتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ اور جب وضو کرتا ہے تو دوسری گرہ بھی کھل جاتی ہے اور جب نماز پڑھتا ہے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے۔ اور صبح کو وہ ہشاش بشاش اور پاکیزگی نفس کی حالت میں ہوتا ہے۔ بصورت دیگر وہ صبح کو سست اور خباثتِ نفس کی حالت میں ہوتا ہے۔"

یہ شیطان کے انسان کو غفلت میں ڈالنے کی ایک مثال ہے جو حدیث میں پیش کی گئی ہے۔ اس سے شیطان کے القاء، اس کی حرکتوں اور اس کے حملوں کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نَفَّاثَات کا لفظ نَفْثٌ سے ہے جس کے معنیٰ پھونکنے کے ہیں۔ حدیث میں القائے شیطانی کو اس کے نَفْث سے تعبیر کیا گیا ہے:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ... "میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان کے نفخ

مِنْ نَفْخِهٖ و نَفْثِهٖ و هَمْزِهٖ ۔ اس کے نَفْث اور اس کے ہمزہ سے۔''

اس حدیث کے راوی ابن مُرّہ نے ان تینوں الفاظ کی وضاحت اس طرح کی ہے۔ کہ شیطان کے نَفْثِ سے مراد شعر، اس کے نفخ سے مراد کبر اور اس کے ہمز سے مراد جنون ہے۔(ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ ج ۷۵۰)

اس میں نفث کو شعر سے جو تعبیر کیا گیا ہے وہ دراصل القائے شیطانی ہی کی ایک شکل ہے اس کی دوسری شکل سحر اور جادو بھی ہے۔

نَفَّاثَات کا لفظ جمع مؤنث کا صیغہ ہے اور مبالغہ کے وزن پر ہے۔ یہ نفوس کی صفت ہے اس لئے عربی قواعد کے مطابق مؤنث ہے۔ یعنی وہ نفوس جو پھونکنے کے عادی ہیں۔ مراد شیطانی نفوس ہیں جو اپنے القاء کے ذریعہ انسان کے شعور اور اس کے حواس کو متاثر کر دیتے ہیں۔ اوپر حدیث میں شیطان کے گرہ باندھنے کا جو ذکر ہوا ہے اس میں بھی یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ ہر گرہ کے ساتھ یہ بات بھی چسپاں کر دیتا ہے کہ ابھی رات لمبی ہے۔ یہ درحقیقت شیطان کا اس گرہ میں نفث (پھونکنا) ہی ہے۔

ان احادیث کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ شیاطین اپنے القاء کے ذریعہ انسان کے شعور، اس کے حواس اور اس کی نفسیات کو متاثر کر کے اُسے غفلت، بےخودی، مدہوشی اور نفسیاتی امراض کا شکار بناتے ہیں۔ اور اس پر بُری اور گمراہ کن باتیں الہام کرتے ہیں۔ ان کے اس شر سے خدا کی پناہ مانگی گئی ہے۔ یہ القائے شیطانی شاعری کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے۔ اور ساحری کی شکل میں بھی۔ زُخرف القول کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور گانے کی شکل میں بھی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو کسی ایک شکل میں محدود سمجھا جائے۔ سفلی عمل کرنے والوں کے ہاں تو گنڈوں میں پھونک مارنے کا طریقہ پہلے ہی سے چلا آرہا ہے۔ ساحر اور ٹونے ٹوٹکے کرنے والے شیاطین کی مدد سے یہ عمل خبیث انجام دیتے ہیں اور لوگوں کے لئے گمراہی کا سامان کرتے ہیں۔ اور آج کل ہپناٹزم (Hypnotism) کے ذریعہ بھی انسان کے حواس اور اس کی نفسیات کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ سب شیطانی اعمال کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس قسم کی تمام اذیتوں سے بچنے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی پناہ لی جائے اور اس بات پر یقین رکھا جائے کہ اس کے اذن کے بغیر کوئی چیز ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

عام طور سے مفسرین اس آیت کے ذیل میں نبی ﷺ پر جادو کی روایت نقل کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک یہودی نے یا ایک منافق نے جو یہود کا حلیف تھا اور جس کا نام لبید بن عاصم تھا آپ کی کنگھی کے بالوں میں جادو کر کے اس کو ایک کنویں کے اندر پتھر کے نیچے دبا دیا تھا۔ اس جادو کے اثر سے آپ بیمار ہوئے اور یہ کیفیت ہوئی کہ کسی کام کے متعلق خیال کرتے کہ کر لیا ہے لیکن نہیں کیا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بعض روایتوں کے مطابق چھ ماہ تک آپ پر اس کا اثر رہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد آپ کو وحی کے ذریعہ مطلع کیا گیا اور مَعُوِذَتَین پڑھنے کی ہدایت ہوئی جس سے آپ کو شفا یاب ہوگئے۔ یہ روایت بخاری، مسلم اور دوسری کتب حدیث میں نقل ہوئی ہے لیکن بوجوہ قابل قبول نہیں:

اولاً : یہ روایت قرآن سے متصادم ہے، کیوں کہ قرآن نے کفار کے اس الزام کی نفی کی ہے کہ نبی ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ یَقُولُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلاً مَسْحُورًا ط (ظالم کہتے ہیں کہ تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کی پیروی کر رہے ہو ۔ بنی اسرائیل: ۴۷) گویا قرآن جس بات کی تردید کر رہا ہے یہ روایت اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ اس کا جواب اس روایت پر یقین کرنے والے علماء یہ دیتے ہیں کہ نبی پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے جس طرح حضرت موسیٰ کو جادوگروں کی رسّیوں اور لاٹھیوں کے بارے میں خیال ہوا تھا کہ وہ سانپ کی طرح دوڑ رہی ہیں (سورۂ طٰہٰ: ۶۶)۔ رہا کفار کا الزام کہ نبی ایک سحر زدہ آدمی ہے تو وہ اس مفہوم میں تھا کہ کسی جادوگر نے آپ کو پاگل بنا دیا ہے جس کی قرآن نے تردید کی۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ " جادو کا اثر صرف ذاتِ محمد پر ہوا تھا نبوتِ محمد اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔" لیکن یہ جواب محض سخن سازی ہے کیوں کہ روایت میں جادو کا یہ اثر بیان کیا گیا ہے کہ آپ کسی کام کے متعلق یہ خیال کرتے کہ کر لیا ہے لیکن نہیں کیا ہوتا۔ یعنی جادو کا اثر معاذ اللہ آپ کے ذہن پر ہوا تھا اور وہ بھی کئی ماہ تک باقی رہا نیز آپ کو اس کی خبر اس وقت ہوئی جب کہ وحیِ الٰہی نے آپ کو مطلع کیا۔ جب کہ حضرت موسیٰ نے جادوگروں کی رسّیوں اور لاٹھیوں کو سانپ کی شکل میں محض وقتی طور پر دیکھا تھا اور ان کو یہ معلوم تھا کہ یہ رسّیاں اور لاٹھیاں حقیقت میں سانپ نہیں ہیں۔ بلکہ سانپ کی شکل میں دکھائی دے رہی ہیں۔ اس لئے اس کے دیکھنے سے ان کو دھوکا نہیں ہوا پھر یہ کوئی بیماری نہیں تھی جس میں حضرت موسیٰ مبتلا ہوئے ہوں اس لئے روایت میں بیان کردہ سحر کے واقعہ کو حضرت موسیٰ کے واقعہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

ثانیاً : سحر کے اس واقعہ کو تسلیم کرنے سے عصمتِ انبیاء پر حرف آتا ہے کیوں کہ روایت میں سحر کا اثر محض جسمانی حالت پر نہیں بلکہ ذہنی کیفیت پر بھی بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بات منصبِ نبوت میں قادح ہے۔ اس لئے یہ دلیل بے معنیٰ ہے کہ اگر آپ زخمی ہو سکتے تھے اور بیمار ہو سکتے تھے تو آپ پر جادو کا اثر بھی ہو سکتا تھا۔

عصمتِ انبیاء کا مسئلہ اجماعی ہے اور قرآن و سنت اس پر ناطق ہیں۔ اس لئے ایسی روایت جو منصب نبوت میں قادح ہو ہرگز قابل اعتناء نہیں ہو سکتی، خواہ وہ بخاری کی روایت ہو یا مسلم کی۔

ثالثاً : جہاں تک سلسلۂ روایت کا تعلق ہے اس میں ایک راوی ہشام ہیں جو اگرچہ ثقہ ہیں۔ لیکن علامہ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ان کے بارے میں ایک بات یہ بھی نقل کی ہے کہ وہ عراق جانے کے بعد اپنے والد سے بہ کثرت روایت کرنے لگے تھے، جس پر اہل عراق نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ نیز یہ کہ مالک نے ان کی ان حدیثوں پر جو وہ اہل عراق سے بیان کرتے تھے نکارت کا اظہار کیا ہے۔ وہ تین مرتبہ کوفہ آئے تھے۔ پہلی مرتبہ وہ اس طرح روایت کرتے حَدَّثَنِیْ اَبِی قَالَ سَمِعْتُ عَائِشَۃَ 'میرے والد نے مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے حضرت عائشہ کو فرماتے ہوئے سنا " اور دوسری مرتبہ آئے تو اس طرح روایت کرنے لگے اخبرنی ابی عن عائشہ مجھے میرے والد نے خبر دی کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے۔" اور تیسری مرتبہ آئے تو ان الفاظ میں روایت کرنے لگے ابی عن عائشہ " میرے والد نے عائشہ سے روایت کی ہے۔" (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۵۰) اس سے

یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہشام اگر چہ ثقہ راوی تھے لیکن روایت کرنے میں کچھ بے احتیاطیاں بھی ان سے ہونے لگی تھیں۔ ایسی صورت میں ان کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر والی روایت کو جو ایک بہت بڑے مسئلہ میں ہے ان کی بے احتیاطی پر کیوں نہ محمول کیا جائے؟

رابعاً : سلسلہ روایت میں ایک راوی سفیان بن عُیینہ ہیں جو یہ اقرار کرتے ہے کہ میں نے اِسے ابن جریج سے پہلی مرتبہ سنا۔ اس پر مولانا امین احسن صاحب کی یہ گرفت بالکل بجا ہے کہ:

''گویا اس واقعہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے سو سال بعد شہرت پائی، اس سے پہلے اس کا علم صرف بعض افراد تک محدود رہا۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ العیاذ باللہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم چھ ماہ تک مسحور رہے ہوتے تو یہ واقعہ اتنا غیر معمولی تھا کہ صدر اول ہی میں اس کا چرچا ہو جاتا اور یہ روایت ایک متواتر روایت کی حیثیت سے ہم تک پہنچتی۔'' (تدبر قرآن ج ۸ ص ۶۶۶)

طوالتِ کلام سے بچتے ہوئے ہم ان چند وجوہ کو بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں البتہ یہاں ان مفسرین کے بیانات کے چند اقتسابات نقل کریں گے جنہوں نے شدت کے ساتھ سحر والی روایت کو رد کر دیا ہے۔

مشہور مفسر علامہ ابوبکر جصاص اپنی تفسیر احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

''اور لوگوں نے جادو کے عمل سے بھی زیادہ بڑی اور ہولناک بات جائز قرار دی ہے۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا اور اس کا اثر بھی آپ پر ہوا تھا حتیٰ کہ آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ میں کوئی بات کہہ رہا ہوں اور کر رہا ہوں جب کہ میں نے نہ وہ بات کہی ہوتی ہے اور نہ کی ہوتی ہے۔ اور ایک یہودی عورت نے آپ پر کھجور کے چھلکے کے اندر کنگھی اور بالوں میں جادو کر دیا تھا یہاں تک کہ آپ کے پاس جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ اور آپ کو اطلاع دی کہ اس عورت نے کھجور کے چھلکے کے اندر جادو کر دیا ہے اور وہ کنویں کے پتھر کے نیچے ہے۔ تو آپ نے اس کو نکلوایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سے اس کا اثر زائل ہو گیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کفار کے دعوے کو جھٹلاتے ہوئے فرمایا ہے۔ **وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلاً مَسْحُوْرًا** (اور ظالم کہتے ہیں کہ تم ایک ایسے آدمی کے پیچھے چل رہے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے)۔ اس طرح کی حدیثیں درحقیقت ملحدوں کی وضع کردہ ہیں۔'' (احکام القرآن ج ۱ ص ۵۵)

سید قطب اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں فرماتے ہیں:

''لیکن یہ روایتیں عمل و تبلیغ کے معاملہ میں اصلاً عصمتِ نبوی کے خلاف ہیں۔ اور اس اعتقاد کے ساتھ آپ کا ہر فعل اور ہر قول سنت و شریعت ہے، درست نہیں قرار پاتیں۔ نیز یہ روایات قرآن کے اس بیان سے بھی متصادم ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سحر زدہ ہونے کی نفی کی گئی ہے اور مشرکین کے اس باطل دعوے کو جھوٹ قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ روایتیں بعید از قیاس ہیں ۔ نیز خبر آحاد کو عقیدہ کے مسئلہ میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے قرآن ہی مرجع ہے اور اصول و اعتقاد کے معاملہ میں احادیث کو قبول کرنے کے لئے تواتر شرط ہے جب کہ یہ روایتیں

متواتر نہیں ہیں۔ مزید برآں ان دونوں سورتوں کا نزول راجح قول کے مطابق مکہ میں ہوا تھا۔ اور یہ بات دوسری روایتوں کی بنیاد کو کمزور کر دیتی ہے۔'' (فی ظلال القرآن ج ۶ ص ۴۰۰۸) اور مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

'' اگر چہ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ اس جادو کا کوئی اثر آپ کے فرائض نبوت پر نہیں پڑا لیکن ساتھ ہی نہایت سادہ لوحی سے یہ اعتراف بھی کر لیا گیا ہے کہ اس کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ پڑا کہ آپ گھلتے جا رہے تھے، کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ کر لیا ہے لیکن نہیں کیا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے نزدیک اس شانِ نزول کو رد کرنے کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ یہ اس مسلمہ عقیدے کے بالکل منافی ہے جو قرآن نے انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہمیں تعلیم کیا ہے۔ عصمتِ حضرات انبیاء (علیہم السلام) کی ان خصوصیات میں سے ہے جو کسی وقت بھی ان سے منفک نہیں ہو سکتیں۔ اس عصمت کو اس امر سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کہ نبی کے دندان مبارک شہید ہو گئے یا وہ زخمی ہو گیا یا وہ قتل کر دیا گیا۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اس کی نبوت میں قادح نہیں ہے کہ اس کو آپ اس امر کی دلیل بنائیں، کہ جب نبی ان چیزوں میں مبتلا ہو سکتا ہے تو مسحور بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کو کردہ اور نا کردہ، دیدہ اور نا دیدہ میں کوئی امتیاز ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے شیطانی تصرفات سے اپنے نبیوں کو محفوظ رکھا ہے اور ان کی محفوظیت دین کے تحفظ کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ محفوظیت ہی نبی کے ہر قول و فعل کو سند بناتی ہے۔ پورا قرآن انبیاء کی عصمت پر گواہ ہے اور ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ ان کی عصمت پر ایمان رکھے۔'' (تدبر قرآن ج ۸ ص ۶۶۵۔ ۶۶۶)

ان مفسرین کے مذکورہ بیانات سے سحر کے واقعہ اور روایت کی حقیقت منقح ہو جاتی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ لوگوں کو جتنی دلچسپی ایک روایت کو صحیح ثابت کر دکھانے سے ہے اتنی دلچسپی انہیں اس بات سے نہیں کہ اس کا عصمتِ انبیاء پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ روایت پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟

۷ حَسَد کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو اپنی کسی نعمت یا فضیلت سے نوازا ہے تو دوسرا شخص اس پر جلنے لگے اور اس بات کا خواہشمند ہو کہ وہ اس سے چھن جائے۔ اور '' حاسد جب حسد کرے'' کا مطلب یہ ہے کہ حاسد جب حاسدانہ کارروائی کرنے لگے اور جوشِ حسد میں اقدام کر بیٹھے۔ ایسے موقع پر اس کے شر، اس کی ایذاؤں اور اس کی اذیتوں سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگنا چاہیئے۔

حاسد کا لفظ اگر چہ عام ہے لیکن یہ بھی ایک اُبھری ہوئی حقیقت ہے کہ حسد کی ابتداء شیطان ہی سے ہوئی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کر کے خلافتِ ارضی کا تاج اس کے سر پر رکھا تھا۔ اسی فضیلت کی بنا پر شیطان انسان کا دشمن بن گیا اور چاہتا ہے کہ انسان بھٹک جائے۔

قرآن میں یہود کے حسد کا بھی خاص طور سے ذکر ہوا ہے :

وَدَّ كَثِيْرٌ مِن اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْيَرُدُّوْنَكُمْ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ (البقرہ ۔ ۱۰۹)

'' بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان لانے کے بعد پھر تمہیں کفر کی طرف پلٹا لے جائیں۔ محض اپنے نفس کی حسد کی بنا پر۔''

کفار مکہ کو بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بنا پر حسد تھا کہ مکہ اور طائف کے سرداروں کو چھوڑ کر آپ کو کیوں نبوت کے لئے منتخب کیا گیا۔ وہ کہتے تھے:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (الزخرف : ۳۱)

''یہ قرآن دونوں شہروں کے (رئیسوں میں سے) کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا؟''

یہ حسد ہی کی آگ تھی جس نے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن بنا دیا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ اہل ایمان پر ان کے رب کی طرف سے کوئی خیر نازل ہو:

مَايَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ اَهْلِ الْكِتَابِ وَلَاالْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَّبِّكُمْ (البقرہ:۱۰۵)

''جن لوگوں نے کفر کیا خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی طرف سے تم پر کوئی خیر نازل ہو۔''

الغرض آیت کا منشاء یہ ہے کہ ایک مؤمن کو جب کبھی کسی حاسد سے سابقہ پیش آئے تو وہ اس کے فتنوں سے بچنے کے لئے خدا کی پناہ مانگے۔ اس طرح وہ اپنے غصہ کو بھی قابو میں رکھ سکے گا اور خدا کی مدد کا بھی مستحق ہوگا۔

قرآن کے اختتام پر حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی جو ہدایت دی گئی ہے اس سے ایک اہم بات کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اہل ایمان خوب سمجھ لیں کہ اس کتاب ہدایت کو پا کر انہیں بڑی نعمت اور بہت بڑا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس پر ان کے دشمنوں کا انہیں حاسدانہ نگاہوں سے دیکھنا اور توحید سے جو ہدایت کی اصل بنیاد ہے انہیں پھیرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا ہرگز بعید نہیں۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ اپنے حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کی طرف سے چوکنا رہیں اور ان کے فتنوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا سہارا لیں۔

(۱۱۴) النَّاس

نام اس سورہ میں پانچ مرتبہ اَلنَّاسِ (انسان) کا لفظ آیا ہے۔اس مناسبت سے اس کا نام "اَلنَّاس" ہے۔

زمانۂ نزول مکی ہے اور مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اس وقت نازل ہوئی ہوگی جب کہ قرآن کے خلاف شیاطین انس وجن نے لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی مہم شروع کر دی تھی۔

مرکزی مضمون سورہ فلق کی طرح اس کا مرکزی مضمون بھی استعاذہ ہی ہے۔البتہ اس میں وسوسہ اندازی کو سب سے بڑا شر قرار دے کر اس سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

نظم کلام آیت ۱ تا ۳ میں پناہ دہندہ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

آیت ۴ میں جس کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے اس کے ایک خطرناک اور شاطر دشمن ہونے سے متنبہ کیا گیا ہے۔

آیت ۵ میں بتایا گیا ہے کہ ان کے حملوں کا اصل نشانہ انسان کا دل ہوتا ہے۔

آیت ۶ میں خبردار کیا گیا ہے کہ یہ دشمن، جس طرح جنوں میں سے ہوتا ہے اسی طرح انسانوں میں سے بھی ہوتا ہے۔

اہمیت ترتیب کلام کے لحاظ سے قرآن کی یہ آخری سورہ ہے۔اور ایک پہلو سے وہ توحید کی محافظ ہے تو دوسرے پہلو سے پورے قرآن کی۔توحید کی محافظ اس طرح ہے کہ اس میں توحید کے اصل دشمن شیطان کی شاطرانہ چالوں سے ہوشیار رہنے اور اس کے شر سے بچنے کے لئے خدائے واحد کا سہارا لینے اور اس کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔رہا اس سورہ کا پورے قرآن کے لئے محافظ اور پاسبان ہونا تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔یہ اس ہستی کی طرف سے نازل ہوا ہے جو حکمت اور کمالات سے متصف ہے) (حم السجدہ۔ ۴۲) مُعَوِّذَتَين کو اخیر میں رکھ کر شیطان کے نفوذ کی تمام راہیں بند کر دی ہیں اس لئے کلام الٰہی میں شیطانی کلام کے خلط ملط اور باطل کے گڈمڈ ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا۔بالفاظ دیگر یہ سورہ اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب شیطان اور اس قماش کے انسانوں کی دخل اندازیوں سے قیامت تک کے لئے محفوظ رہے گی۔اس میں کسی قسم کی آمیزش یا تحریف ممکن نہیں ہے۔وہ ہمیشہ کے لئے اپنی اصل شکل میں باقی رہنے والی کتاب ہے۔

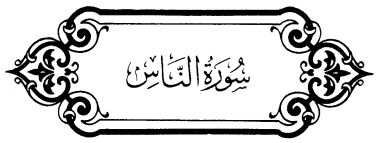

سُوْرَةُ النَّاسِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱

مَلِكِ النَّاسِ ۝۲

اِلٰهِ النَّاسِ ۝۳

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝۴

الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝۶

(۱۱۴) سُورۃُ الناس

آیات ۶

اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے

۱ کہو، [۱] میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب کی۔ [۲]

۲ انسانوں کے بادشاہ کی۔ [۳]

۳ انسانوں کے معبود کی۔ [۴]

۴ وسوسہ ڈالنے والے خناس (چھپنے والے) کے شر سے۔ [۵]

۵ جو لوگوں کے سینوں (دلوں) میں وسوسے ڈالتا ہے۔ [۶]

۶ جو جنوں میں سے بھی ہوتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ [۷]

۱؎ اس کے اوّلین مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور لفظ قُلْ (کہو) سے سورہ کا آغاز اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کلام وحی ہے۔ اور خدائے تعالیٰ نے آپ کو جن الفاظ میں پیغام پہنچانے کا حکم دیا تھا ٹھیک ٹھیک ان ہی الفاظ میں آپ نے لوگوں تک پہنچا دیا۔ ان میں سے کوئی لفظ بھی حتیٰ کہ قُلْ (کہو) کا لفظ بھی آپ نے ساقط نہیں فرمایا۔ یہ قرآن کے لفظ بہ لفظ وحی الٰہی ہونے کا صریح ثبوت ہے۔

۲؎ انسانوں کا رب یعنی تمام لوگوں کا پروردگار اور مالکِ حقیقی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو خدا انسانوں کا رب ہے وہی پناہ دہندہ بھی ہے۔ اس کے سوا کوئی پناہ دینے والا نہیں ہے اس لئے میں پناہ کے لئے اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

زبور میں بھی اس سے ملتا جلتا مضمون ہے:

''اے خدا ! میری حفاظت کر کیوں کہ میں تجھ ہی میں پناہ لیتا ہوں۔ میں نے خداوند سے کہا ہے تو ہی رب ہے۔ تیرے سوا میری بھلائی نہیں۔'' (زبور ۱۶: ۱ ، ۲)

واضح رہے کہ اَعُـــوْذُ کے لفظی معنی پناہ لینے کے ہیں جس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ بندۂ خدا سے نہ صرف پناہ مانگتا ہے بلکہ عملاً اس نے اپنے کو اسی کی حفاظت میں دے دیا ہے اور اسی کا سہارا لے لیا ہے۔ لیکن چوں کہ معوذتین دعائیہ سورتیں ہیں اور اردو محاورہ میں ایسے موقع پر پناہ مانگنا بولا جاتا ہے، اس لئے ہم نے لفظ اعوذ کا ترجمہ ''میں پناہ مانگتا ہوں'' کیا ہے۔

۳؎ یعنی چونکہ خدا انسانوں کا بادشاہِ حقیقی ہے اس لئے وہ بندوں کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے اس لئے میں اسی مقتدر اعلیٰ کا سہارا لیتا ہوں۔

اس سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ جس طرح زمین اور آسمانوں پر قائم ہے اسی طرح پورے بنی نوع انسان پر بھی قائم ہے۔ انسانی گروہوں میں سے کوئی گروہ ایسا نہیں جس پر اس کی بادشاہت قائم نہ ہو۔ اس لئے کسی گروہ کا اپنے کو اس کی بادشاہت سے آزاد سمجھ لینا ایک خلاف واقعہ بات ہے۔ اس سے حقیقت تو نہیں بدلتی البتہ انسان کا طرزِ عمل غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے دائرۂ عمل میں سرکش بن کر رہ جاتا ہے۔

۴؎ یعنی حقیقتاً تمام انسانوں کا معبود اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ اس کے رب اور بادشاہ ہونے کا تقاضا بھی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لوگوں نے اس حقیقت سے انحراف کر کے غیر اللہ کو معبود بنا لیا ہو۔ عبادت کی مستحق تنہا اللہ ہی کی ذات ہے اور اس کائنات میں معبود یعنی عبادت کے لائق ہونا تنہا اسی کی صفت ہے۔ اور وہی ہے جس کی عبادت آسمانوں میں بھی کی جاتی ہے اور زمین میں بھی، اس لئے انسانوں کا معبود بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کو رب مَـــلِکَ (بادشاہ) اور الٰہ (معبود) مان کر جب بندہ اس سے پناہ کی درخواست کرتا ہے تو وہ اسے قبول فرماتا ہے۔ بالفاظ دیگر دعائے تعوذ کی قبولیت کے لئے توحید شرط لازم ہے۔

۵؎ وسوسہ کے معنیٰ بُری بات اور بُرے خیال کے ہیں جو غیر محسوس طریقہ پر کسی کے دل میں ڈالا جائے۔ اور

وسواس کے معنی ہیں وسوسہ اندازی کرنے والا۔ یہ شیطان کی صفت ہے اور اس کی دوسری صفت خناس ہے۔ جو خنوس سے ہے اور جس کے معنی چھپنے، غائب ہوجانے اور پیچھے ہٹنے کے ہیں، نیز اس کے ایک معنی انقباض (سکڑنے) کے بھی ہیں۔

شیطان جب انسان کو کسی گناہ پر آمادہ کرنا چاہتا ہے تو وہ گناہ کے کام کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے اور خوشگوار نتائج کی امید دلاتا ہے۔ یہی چیز وسوسہ کی شکل میں انسان کے دل میں داخل ہوتی ہے اور جب وہ اس کے اثر کو قبول کرتا ہے تو یہ خیال پختہ ہوکر ارادہ اور عمل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سب سے پہلی وسوسہ اندازی شیطان نے آدم وحوا پر کی تھی۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُرِيَ عَنْهُمَامِنْ سَوْ اٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْتَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ ..... وَقَا سَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ (الاعراف ۲۰، ۲۱)

"پھر شیطان نے ان پر وسوسہ اندازی کی تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ان سے پوشیدہ رکھی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے۔ اور کہا کہ تمہارے رب نے تم کو اس درخت سے اس لئے روکا ہے کہ تم کہیں فرشتے نہ بن جاؤ یا تمہیں حیات جاوداں حاصل نہ ہوجائے۔ اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔"

یہ شیطان کی وسوسہ اندازی کی واضح مثال ہے کہ کس طرح شیطان خیر خواہ بن کر آتا ہے اور گناہ کی ترغیب کیسے پُر فریب انداز میں دیتا ہے۔ آدم وحوا کے سامنے گو شیطان نمودار ہوگیا تھا۔ لیکن دنیا میں اس کی وسوسہ اندازی چھپے دشمن کے حملہ کی طرح ہوتی ہے اس لئے آدمی کو اس کی وسوسہ اندازی کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ اپنے دل میں وہ بُرے خیالات محسوس کرنے لگتا ہے۔ لیکن ان خیالات کو قبول کرنا یا نہ کرنا انسان کے اپنے فیصلہ پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر وہ بیدار اور اپنے دشمن کی طرف سے چوکنا ہو تو شیطانی وساوس کا کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ اور اگر غافل ہو تو اثر قبول کرتا ہے۔ اور انسان کا قلب اسی صورت میں بیدار رہتا ہے جب کہ اس میں خدا کی یاد بس گئی ہو۔ ذکر الٰہی انسان کی مدافعت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس ہتھیار کو استعمال کر کے جب وہ دل میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے خدا کی پناہ مانگتا ہے تو وسوسے بے اثر ہوکر رہ جاتے ہیں اور شیطان کو ناکام لوٹنا پڑتا ہے۔ آیت کا منشاء شیطان کی ان چھپی کارروائیوں سے ہے جو وہ انسان کے خلاف کرتا ہے متنبہ کرنا ہے تاکہ انسان اپنے دشمن کی طرف سے چوکنا رہے اور اپنی مدافعت کا سامان کرے۔

یہ تو آیت کے مفہوم کا عمومی پہلو ہے۔ رہا محلِ کلام کے لحاظ سے خصوصی پہلو، تو یہاں خاص طور سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اہل ایمان کو قرآن کی شکل میں جو ہدایت عطا ہوئی ہے، اس کے لئے سب سے بڑا خطرہ اگر کوئی ہے تو وہ شیطان کی وسوسہ اندازی ہی ہے۔ یعنی وہ ایسی باتیں دل میں ڈال سکتا ہے جو قرآن کے معاملہ میں شکوک وشبہات پیدا کرنے والی اور راہ ہدایت سے منحرف کر دینے والی ہوں۔ خاص طور سے عقیدۂ توحید جو دین کی اساس اور قرآن کی اصل روح ہے، شیطان کی ریشہ دوانیاں اس کے خلاف ہوسکتی ہیں۔ اس لئے اس دشمن کی شاطرانہ چالوں سے ہوشیار رہنے اور اپنے دین اور عقیدہ کی حفاظت کا سامان کرنے کی ضرورت ہے۔

۶ دلوں میں وسوسے ڈالنا اردو محاورہ کے لحاظ سے ہے ورنہ اصل میں لفظ صدور استعمال ہوا ہے جو صدر کی جمع

ہے۔اور جس کے معنی سینہ کے ہیں۔شیطان کی وسوسہ اندازی کا محل انسان کا باطن یعنی اس کا سینہ ہے۔سینہ دل کے لئے بمنزلۂ دہلیز کے ہے جہاں سے وسوسے دل میں داخل ہوتے ہیں۔علامہ ابن قیم نے اس کی بڑی اچھی تشریح کی ہے۔

''یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاس (جو انسانوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے) فرمایا اور یہ نہیں فرمایا کہ ان کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔کیوں کہ سینہ دل کا صحن اور اس کا گھر ہے جہاں سے واردات دل تک پہنچتے ہیں۔یعنی پہلے سینہ میں مجتمع ہوتے ہیں پھر دل میں داخل ہوتے ہیں۔لہٰذا سینہ دل کے لئے بمنزلۂ دہلیز کے ہے۔اور تمام احکام اور ارادے دل سے نکل کر سینہ میں آتے ہیں اور پھر وہاں سے ان کی تقسیم اس کے لشکروں (معاونین) پر ہوتی ہے۔(تفسیر المعوذتین لابن قیم۔ص ۶۶)

یعنی وسوسے دل میں براہ راست داخل نہیں ہوتے بلکہ سینہ کے واسطہ سے داخل ہوتے ہیں۔گویا شیطان کے تیر سینہ میں پیوست ہو جاتے ہیں اور ان کا زہریلا اثر دل پر اسی وقت ہوتا ہے جب کہ دل غفلت کی نیند سو رہا ہو۔ورنہ اگر دل ذکر الٰہی سے بیدار ہو تو وہ مدافعت کر لیتا ہے اور اس کے اثر سے محفوظ رہتا ہے۔

؎ یعنی وسوسہ اندازی کرنے والا شیطان محض ابلیس ہی نہیں ہے بلکہ جنوں اور انسانوں میں ایسے شیاطین بہ کثرت موجود ہیں جو یہ کام کرتے رہتے ہیں۔

وَكَذَالِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (الانعام : ۱۱۲)

''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو دشمن بنا دیا ہے جو ایک دوسرے پر چکنی چپڑی باتیں فریب دینے کے لئے القاء کرتے ہیں۔''

جہاں تک شیاطین جن کی وسوسہ اندازی کا تعلق ہے ان کا چھپ کر حملہ آور ہونا بالکل واضح ہے۔رہے شیاطین انس تو وہ بھی جب وسوسہ اندازی کرتے ہیں تو اپنے اصلاً شیطان ہونے کی حیثیت کو چھپا کر ہی کرتے ہیں، چنانچہ وہ انسان کے خیر خواہ بن کر نمودار ہوتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا کوئی خیال اور ان کا کوئی مشورہ کسی کے لئے اسی صورت میں قابل قبول ہو سکتا ہے جب کہ ایک ناصح اور ایک خیر خواہ کی حیثیت سے وہ سامنے آئیں۔اگر وہ اپنی اصل روپ یعنی شر پسند کی حیثیت سے سامنے آئے تو کوئی شخص بھی ان کی طرف توجہ کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینا چاہئے کہ شر پھیلانے کے تعلق سے اصل کردار شیاطینِ جن کا ہے۔جن کا سرغنہ ابلیس ہے۔رہے شیاطین انس تو وہ ان ہی کے تابع ہیں۔

اشاریہ

(نمبر صفحات)

اللّٰہ

..... خالق ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۶۶

..... کی قدرت ۷، ۳، ۲۲، ۳۶، ۴۸، ۲۱۷

..... کی ربوبیت ۷، ۱۰، ۱۱، ۲۲، ۴۸

..... کی حکمت ۷، ۱۰، ۱۳، ۴۸

..... کی عظمت وجلالت ۸۶ ، ۸۷

.....کی حکومت اور اقتدار ۴۸، ۸۲، ۱۳۸، ۱۶۴

..... کا علم ۴۸، ۹۶

..... کا یکتا ہونا ۲۵۶، ۲۵۷

..... انسانوں کا رب ۲۷۲، ۲۷۳

..... انسانوں کا بادشاہ ۲۷۲، ۲۷۳

..... انسانوں کا معبود ۲۷۲، ۲۷۳

..... کے کوئی اولاد نہیں ۲۵۶، ۲۶۰

..... کسی کی اولاد نہیں ۲۵۶، ۲۶۰

..... کا باخبر ہوتا ۱۹۲، ۱۹۴

..... کی برابری کا نہیں ۲۵۶، ۲۶۹

..... خدائے واحد ۲۳۹، ۲۴۶

..... بالاتر ۲۵۶، ۲۵۸

..... ملجاء پناہ کی چٹان ۲۵۶، ۲۵۸

..... صمد ۲۵۸

..... پناہ دہندہ ۲۶۳، ۲۷۳

..... صبح کا رب ۲۶۲، ۲۶۳

..... کے ہاتھ میں سارے اختیارات ۱۱، ۱۲

..... ربِّ اعلیٰ ۹۶، ۹۷، ۱۴۴

..... عرش کا مالک ۸۶، ۸۷

..... کا کریم ہونا ۱۶۹

..... کا نام لینے کا مطلب ۱۰۳

..... کا منصوبہ ۸۹، ۱۱۳

..... ربُّ العالمین ۵۲، ۶۲، ۶۴

..... رب ۴، ۷۴، ۷۸، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۱۰۲، ۱۱۲

۱۱۶، ۱۴۸، ۱۵۴، ۱۶۶، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۸، ۱۹۲، ۲۱۴

..... زبردست ۸۲

..... لائق ستائش ۸۲، ۲۴۶

..... دیکھنے والا ۸۲، ۱۷۰

..... بخشنے والا ۸۶

..... محبت کرنے والا ۸۶، ۸۷

..... کے نام ۹۷

..... کی معرفت ۹۷

..... کی طرف واپسی ۱۰۸، ۱۰۹

..... کا فرشتوں کے جلو میں آنا ۱۱۶، ۱۱۹

..... احکم الحاکمین ۱۶۰، ۱۶۴

..... کا عذاب ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۳۸

..... آسمان وزمین کا مالک ۱۶

..... حساب لینے والا ۱۰۸، ۱۱۰

..... کی حجت ۲۳۹

..... توبہ قبول کرنے والا ۲۴۴، ۲۴۶

..... کے وفادار بندے ۲۹
..... کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرنا ۲۸
..... کے حضور جوابدہی کا تصور ۲۹
..... رحمٰن ۱۶
آیات
..... کا انکار کرنے والا ۱۲، ۱۳۰
آخرت ۲۴، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۵۰، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۹
آسمان ۱۱، ۲۴، ۲۶، ۴۵، ۸۳، ۹۰، ۱۰۸، ۱۱۰، ۱۳۶
..... کی تخلیق ۷، ۲۴، ۲۹
..... قیامت کے دن کھول دیئے جائیں گے۔ ۸، ۱۴، ۴۵، ۵۴، ۷۴
..... کا پھٹنا ۵۴، ۷۴
.....کیا سائنس کی رو سے آسمان کا وجود نہیں ہے ۷۵
..... کی قسم کا کھانے کا مطلب ۸۳، ۱۳۳، ۱۳۴
..... سات آسمان ۸، ۱۱
..... کی کھال کھینچ لی جائے گی ۴۲
..... محض حدِّ نظر نہیں ۷۵
.....سائنس داں کائنات کی پہنائیوں کو ناپنے سے قاصر ۷۵
..... کے بارے میں قرآن کا بیان ۷۵
آمنہ ۱۵۰
ابرہہ ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷
ابوجہل ۱۶۹
اسلام مہد سے لحد تک کا دین ۳۶
.....کو افیون قرار دینے والے ۷۰
..... کا غلبہ ۲۴۶
اصحاب الاخدود (خندق والے) ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵
اصحاب الفیل (ہاتھی والے) ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷
اعمال ۴۵
..... کا ریکارڈ ۱۴، ۲۹، ۴۵، ۵۳، ۵۷، ۵۹، ۱۹۰
..... کا پارسل ۵۶
..... قیامت کے دن عملی زندگی کے مناظر کا پیش کیا جانا ۱۸۸، ۱۹۰
..... زندگی کی بولتی فلم ۱۴
..... اچھے اعمال ۵۶
..... اعمال صالحہ کی حقیقت ۲۰۶
امیہ بن خلف ۳۳
انسان
.....کا مشقت کی حالت میں پیدا ہونا ۱۲۵، ۱۲۶
..... کی فطرت ۱۹۴
..... مشقتوں اور تکلیفوں میں انسان کی عظمت کا راز ۱۲۵، ۱۲۶
.....کو بہترین ساخت پر پیدا کرنے کا مطلب ۱۶۰، ۱۶۲
..... کی گراوٹ کی مثال ۱۶۴
..... کی سرکشی ۱۶۸، ۱۶۹
.....کی زندگی کے لئے خدائی منصوبہ ۹۸، ۱۱۳، ۱۱۴
..... کو نیکی و بدی کا شعور ۱۳۴
.....کی تخلیق ۳۴، ۳۴، ۵۴، ۵۶، ۹۰، ۹۴، ۱۴۴
.....کا اپنے رب کی طرف کشاں کشاں جانا ۷۴، ۷۶
..... کے سفر کی آخری منزل ۷۶
..... اتفاقی حادثہ نہیں ۹۸
..... کا پستی کے آخری گڑھے میں گرنا ۱۶۴
..... کا عروج کو پہنچنا ۱۲۶، ۱۶۴

..... کی کوششیں ۱۴۰، ۱۴۱

..... گھاٹے میں ۲۰۴

اہل کتاب ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲

..... میں تفرقہ ۱۸۲

..... غلو کا شکار ۲۵۹

..... یہود کا عزیز کو خدا کا بیٹا قرار دینا ۲۵۹

..... عیسائیوں کا مسیح کو بیٹا قرار دینا ۲۵۹

اہل ایمان ۷۰، ۶۸، ۱۳۰، ۱۶۰، ۱۷۰، ۲۰۴، ۲۴۶

.....کفار پر ہنسیں گے ۷۲

..... کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ۸۰

..... مردوں اور عورتوں پر ظلم ۸۲، ۸۵

..... کا نیک انجام ۱۰۶، ۱۰۸

..... ایمان کے ساتھ عمل صالح ضروری ۲۰۵، ۲۰۶

..... کا اصل نصب العین ۲۴۶

اونٹ ۱۰۸، ۱۰۹

..... اونٹنی ۱۳۸

اِرَم ۱۱۲، ۱۱۴

ام جمیل (ابولہب کی بیوی) ۲۵۳

..... کو حمّالۃ الحطب کہنے کا مطلب ۲۵۳

..... کی گردن میں جواہرات کا ہار ۲۵۳

..... کی گردن میں آگ کی مضبوط رسی ۲۵۳

..... اس کے انجام سے عبرت ۲۵۳

ابولہب ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲

اُبی بن کعب ۱۷۹

اُپنیشد ۲۶۰

.....میں شرک کو فلسفہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ۲۶۰

استغفار ۲۴۴، ۲۴۶

ایٹمی توانائی ۱۹۴

اسماعیل ۱۲۵، ۲۲۷

ابوطالب ۱۵۰

ابراہیم ۱۰۲، ۱۰۳، ۲۴۱، ۲۶۲

..... کا قوم سے اعلان برأت ۲۴۱

بادل ۸، ۱۱

بت پرستی ۲۵

.....ہندستان کے بت پرست ۲۵۹

..... تری مورتی ۲۵۸

..... اوم ۲۵۸

..... مہد برہما ۲۵۹

بخل ۱۴۰، ۱۴۱، ۲۲۶، ۲۲۹

بدبخت ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶

بددیانتی ۶۳

.....اشیاء میں ملاوٹ ۶۳

برزخ ۱۰، ۶۴، ۷۰

بے نیازی ۱۴۰، ۱۴۲

بنی اسرائیل ۲۵، ۱۰۳

بیت المقدس ۱۶۱

بیت اللہ ۲۱۵، ۲۲۱

..... پر ابرہہ کی فوج کشی ۲۱۸

.....کا رب ۲۲۰

بروج ۸۲، ۸۳

بائبل

..... آسمان کے درہم برہم ہونے کا ذکر ۵۵

..... سورج کا تاریک ہونا ۵۵
..... میں توحید کی تعلیم ۱۰۴،۲۵۸،۲۵۹
..... میں انجیر وزیتون کا ذکر ۱۴۱
..... میں زر پرستی کی مذمت ۲۱۰
..... میں ریاکاری کی مذمت ۲۲۹
..... زبور میں خدا کو پناہ کی چٹان کہا گیا ہے ۲۵۸
.....اناجیل اربعہ میں مسیح کو خدا کا بیٹا کہا گیا۔اس کی **حقیقت** ۲۵۹،۲۶۰
..... تورات سب سے قدیم کتاب ۲۵۹
بدکار گنہگار ۵۸،۶۰،۶۷
پاکیزگی
.....اختیار کرنے کا مطلب ۲۰،۲۵
..... حاصل کرتا ۳۲
پرندے ۲۱۴،۲۱۶،۲۱۷
..... کی سنگباری ۲۱۷
پناہ مانگنا
..... کے معنیٰ ۲۶۳
..... مخلوق کے شر سے ۲۶۲، ۲۶۳
..... اندھیری رات کے شر سے ۲۶۲، ۲۶۳
.....گرہوں میں پھونکنے والے کے شر سے ۲۶۲،۲۶۴
..... حسد کرنے والے کے شر سے ۲۶۲ ، ۲۶۸
..... وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے ۲۷۴
..... خناس کے شر سے ۲۷۴، ۲۷۵
پہاڑ ۲۴،۹۶،۱۰۸، ۱۰۹
..... زمین کی میخیں ۱۰
..... کا چلایا جانا ۱۲، ۱۴، ۴۲، ۴۳، ۱۹۷
.....زمین کی گردش میں توازن پیدا کرنے کا موجب ۱۰
..... تسنیم ۶۸، ۶۹
.....تقویٰ (خداخوفی، پرہیزگاری) ۱۳۲، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۶۶
توحید ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۱۷، ۲۵۵، ۲۵۷
تزکیہ ۱۳۲
تسبیح ۹۶، ۹۷، ۲۴۴، ۲۴۶
ثمود ۸۶، ۱۱۲، ۱۳۲، ۱۳۸
..... کا زمانہ ۱۱۴
..... کی سرکشی اور انجام ۸۷
..... کا مسکن ۱۱۰، ۱۱۴
جادو ۲۶۵، ۲۶۶
..... ٹونے ٹوٹکے ۲۶۵
..... ہپناٹزم ۲۶۵
..... سفلی عمل ۲۶۵
..... جادو اور عصمت انبیاء ۲۶۶
جما ہوا خون (علق) ۱۶۸
جزا و سزا ۷، ۱۰، ۸۳، ۱۶۰، ۱۶۴، ۱۹۰
..... سے بچنے کیلئے کائنات کی سائنٹفک توجیہ ۵۶
..... طے شدہ بات ۹۴
..... کا تصور ۱۶۳
..... جزا کے بارے میں ہندو مت اور بدھ مت کا تصور ۹
..... روز جزا پر ہواؤں سے استدلال ۲۰، ۲۱
..... کا انکار ۵۴، ۲۲۶، ۲۲۷
..... کے وقوع پر تاریخی شہادت ۱۱۷
..... پر یقین رکھنے کی دعوت ۱۶۳
..... پر تاریخی مقامات سے استشہاد ۱۶۳

.....جذبات،ارادےنیتیں دیکھی جائیں گی ۱۹۴
جفت وطاق ۱۱۲، ۱۱۳
جبریل ۱۷،۴۶،۴۹،۱۶۷
جوڑے ۱۰
.....پیدا کرنے کی حکمت ۱۰
جنت ۲۸،۴۲،۸۲،۱۲۰،۱۲۱،۱۸۴
..... کا ماحول ۱۷
..... کی سوسائٹی ۱۰۱
..... کی زندگی ۱۰۹
..... کی شراب ۱۶،۶۸،۶۹
..... نوخیز لڑکیاں ۱۶
..... کی پُر بہار فضاء ۶۹
..... میں خدا کی شان کے جلوے ۶۹
..... میں شاندار تخت ۶۹
جہنم ۱۲، ۱۴، ۲۸، ۵۸، ۶۰، ۶۶، ۸۲، ۱۰۰
۱۰۷، ۱۸۰، ۲۱۱، ۲۱۲
..... کا وجود ۲۰۱
..... سرکشوں کا ٹھکانہ ۱۲، ۲۸
..... کی آگ ۴۲، ۸۵، ۹۶
..... کا نمونہ ۱۹۸
..... بھڑکتی آگ ۷۸، ۱۰۶، ۱۴۴، ۱۹۶، ۲۰۸
..... کی گہرائی ۱۹۸
جیوتش ۴۸
چاند ۷۸، ۱۳۲، ۱۳۳
حق ۲۰۴، ۲۰۶
حسد
..... کا مطلب ۲۶۸، ۲۶۹
..... شیطان کا حسد ۲۶۸
..... یہود کا حسد ۲۶۸
..... کفار مکہ کا حسد ۲۶۹
حرص ۲۰۱
حطمہ ۲۰۸، ۲۱۱
خداپرستی ۲۲۹
خسارہ ۲۰۵
خناس ۲۷۲
..... کا مطلب ۲۷۴
خطاکار ۱۷۱
خدیجہ ۱۵۱
خشیت الٰہی ۱۸۳، ۱۸۴
دنیا ۱۰۲، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۷۹
..... تفریح گاہ نہیں ۱۲۷
..... امتحان گاہ ۲۰۵
..... کا نظام ۱۴۹
..... کے مقابلہ میں آخرت ۱۰۳
..... سدا بہار نہیں ۴۳
..... کے نقد فائدے ۱۰۳
..... اندھیر نگری نہیں ۱۱۷
دعوت
..... پیغمبر کا دعوت کو پیش کرنا ۳۳
..... کا آغاز ۱۴۹
..... ایک حکیمانہ کام ۴۱
..... منکرین کو دعوت فکر ۱۰۹
.....نبی کی کوہ صفا سے دعوت ۲۵۲
دن ۸، ۱۱، ۱۲، ۲۸، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۴۱، ۱۴۸، ۱۴۹

دین ۲۳۹
..... دین حق ۱۸۰، ۱۸۲
..... کے معنیٰ ۱۸۳
..... نبی کا دین ۲۳۸
..... میں تحریف کرنے والے ۲۲۷
دیوی دیوتا ۱۷، ۹۷
دُعا
..... تزکیۂ نفس کے لئے ۱۳۵
دل
..... پر زنگ چڑھ جانا ۶۷
ذکرالٰہی
ذونواس ۸۴
روح ۱۶، ۱۷، ۱۷۴
..... سے مراد ۱۷۷
رفعِ ذکر ۱۵۵
رضاءالٰہی ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۲۱، ۱۲۰
رات ۸، ۲۴، ۴۶، ۴۸، ۷۸، ۷۹، ۱۱۳
۱۳۲، ۱۳۳، ۱۴۱، ۱۱۴۸، ۱۴۹
..... کی قسم ۱۴۶، ۴۰
..... دس راتیں ۱۱۳، ۱۱۲
رسول
..... کو جھٹلانا ۱۳۸
رہبانیت ۱۳۵
زمین ۱۰، ۱۱، ۲۹، ۳۴، ۴۳، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۳۲
..... کی سخت ۱۴
..... کو بچھانا ۷۴، ۲۹، ۲۸
..... کی نعمتیں ۲۹
..... کا حکیمانہ نظام ۲۹
..... کی قیامت کے دن شکل ۷۶، ۴۴، ۱۴
..... کا مُردوں کا اُگلنا ۷۶، ۷۴، ۱۸۹، ۱۸۸
..... کا اپنی سرگزشت سنانا ۱۸۹، ۱۸۸
..... کا پھیلا دیا جاتا ۷۶، ۷۴
..... کا شق ہونا ۹۳
..... بھومی پوجا ۱۸۹
زیتون ۱۶۲، ۱۶۰، ۱۶۱، ۳۴
زمانہ ۲۰۵ ، ۲۰۴
..... گذرتے ہوئے زمانہ سے انسان کی تباہی پر
استدلال ۲۰۵
زکوٰۃ ۱۸۰، ۱۸۳
زندگی بعدموت ۷، ۱۰، ۲۳، ۲۶، ۳۴، ۳۶
۴۴، ۷۹، ۸۶، ۸۷، ۹۲، ۹۳، ۱۸۹، ۱۶۳
..... پر دلائل ۳۶
زید بن نفیل ۱۵۱
سمندر
..... بہائے جائیں گے ۵۵، ۵۴
..... بھڑکا دئے جائیں گے ۴۴، ۴۲
..... میں آگ لگ جانا ۵۵، ۴۴
سورج ۱۳۳، ۱۳۲
..... روشن چراغ ۱۱، ۸
..... دیوتا نہیں ۴۳
..... لپیٹ دیا جائے گا ۴۳، ۴۲
..... جہنم کا نمونہ ۱۹۸
..... کے بارے میں جدید اکتشافات ۴۳
..... کا درجۂ حرارت اور اس کا حجم ۱۱

..... بالآخر تاریک ہوگا، سائنس کا اعتراف ۵۵

سرکشی ۱۷، ۲۸، ۱۳۲، ۱۳۶، ۱۶۶، ۱۶۹

ستارے ۴۷، ۵۵، ۸۳، ۹۱

..... قانون الٰہی میں جکڑے ہوئے ۴۷

..... دعوت فکر دیتے ہیں ۴۸

..... کا بے نور ہو جانا ۴۲

..... کا گرنا ۵۵، ۵۴

..... دمکتا ستارہ ۹۰، ۹۱

..... کی قسم ۴۶

..... سحیئین ۶۴، ۶۲

سجدہ ۷۸، ۷۹، ۱۷۰، ۱۷۱

سینہ ۲۵، ۱۶۰، ۱۶۲

سجیل ۲۱۴، ۲۱۷

سائل ۱۴۸

شب قدر ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸

شر

..... سے مراد ۲۶۳

شیطان ۴۶، ۵۰

..... القائے شیطانی ۲۶۴

..... خناس ۲۶۱، ۲۷۲

..... کی وسوسہ اندازیاں ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵

..... شیاطین انس وجن ۲۷۵

..... ابلیس شیطانوں کا سرغنہ ۲۷۵

شرح صدر ۱۵۵

شفق ۷۹، ۷۸

شرک ۱۶، ۱۷

..... بت پرستی باطل دیوی دیوتاؤں کی پناہ مانگنا ۲۳۸، ۲۱۷

..... اہل مذاہب کے فلسفے ۲۶۰، ۲۵۹، ۲۵۸

..... غیر اللہ کی پناہ مانگنا ۲۶۳

..... خدا کے بارے میں لغو تصور ۲۵۸

..... خدا کے لئے اولاد تجویز کرنا عقلاً ونقلاً غلط ۲۵۸

..... خالق ومخلوق کا مخلوط وجود (ہمہ اوست) ۲۶۰

شفاعت

..... کے غلط تصور کی تردید ۱۷

..... کا صحیح تصور ۱۸

شریعت ۱۳۵

..... پر طریقت کے اضافے کی ضرورت نہیں ۱۳۵

..... پر ریاضتوں کے اضافے کی ضرورت نہیں ۱۳۵

..... پر مراقبوں کی ضرورت نہیں ۱۳۵

صبح ۴۸، ۱۹۲، ۱۹۳

..... کی قسم ۴۶

صحیفے ۱۸۰، ۱۸۲، ۱۰۲، ۱۰۴

..... سب سے قدیم صحیفہ ۱۰۴

..... موسیٰ کا صحیفہ ۱۰۴

صور ۱۲، ۱۳، ۳۸، ۳۹

صبر ۱۲۹، ۱۳۰، ۲۰۴، ۲۰۶

صالح ۱۳۸

طعنہ زنی کرنے والے ۲۰۹، ۲۱۰

..... کارٹون، طنز نگاری، تیر ونشتر ۲۱۰

..... پگڑی اچھالنا ۲۱۰

طُویٰ ۲۴، ۲۵

عبدالمطلب ۱۵۰، ۲۱۵، ۲۲۱، ۲۵۱

عیب چینی ۲۰۹

عبداللہ بن ام مکتوم ۳۳

عتبہ ۳۳

علم ۱۶۹

..... قلم کے ذریعہ ۱۶۶، ۱۶۸

..... قلم کی اہمیت ۱۶۹، ۱۶۸

..... علم کی حقیقت ۱۶۹

عبادت ۱۸۳

..... میں منہمک ہونا ۱۵۶، ۱۵۷

.....کا مقام ۱۵۷

عیسیٰ

..... کا درس ۱۶۱، ۱۶۲

..... کے بیانات ۲۲۸، ۲۲۹

..... کا علماء کو جھنجھوڑنا ۲۲۹

عُقد ۲۶۴

گرہیں سے مراد ۲۶۴

..... شیطان کا گرہ لگانا ۲۶۴

عاد ۱۱۲، ۱۱۴

عدالت خداوندی ۱۳، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۴۵، ۴۷، ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۱۱۹، ۲۰۲

..... ایک کٹھن مرحلہ ۶۳

..... نیکوکاروں سے آسان حساب ۷۷

علیین ۶۶، ۶۷

عقیدۂ تثلیث ۲۵۷، ۲۵۸

عقیدۂ تناسخ ۶۰

عالم بالا ۱۴

عرش ۸۷

عبادت الٰہی ۱۵۴، ۱۵۷، ۱۸۰

غارت گری ۱۹۴، ۱۹۳

غارحراء ۱۷۲، ۱۶۷

غلام

..... آزاد کرنا بہت بڑی نیکی ۱۳۰، ۱۲۴

فلق ۲۶۳، ۲۶۱

فرشتے ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۳۵، ۴۵، ۵۷، ۵۹، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۷۰، ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۷

فجر ۱۷۴، ۱۱۳، ۱۱۲

فلکیات ۴۸، ۷۵، ۹۱

فرعون ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۸۶، ۱۱۲، ۱۱۹

.....کو دعوت حق ۲۴

..... کا رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ ۲۵

فلسطین ۲۲۱

قیامت

۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۳، ۲۹، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۵۵، ۶۲، ۶۳، ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۸۹

..... ایک بڑی خبر ۸، ۹

..... کے بارے میں اختلاف کرنیوالے ۷، ۹، ۱۳

..... کے موقف کا نقشہ ۶۳، ۶۴

..... روز جزا ۱۳، ۵۸، ۱۸، ۱۷، ۱۳

..... کی ہولناکی ۲۲، ۳۱، ۴۷

..... کائنات کا سب سے بڑا ہنگامہ ۲۹، ۳۱

..... کب آئے گی ۱۹، ۲۸، ۲۹، ۳۰

..... وعدے کا دن ۸۲، ۸۳

..... سے خبردار کرنا ۳۱

..... کا پہلا جھٹکا ۲۲، ۴۳، ۴۴

.....کے دن زمان ومکان کے پیمانے بدل جائیں گے۔ ۴۵

..... کانوں کو بہرہ کرنے دینے والی آواز ۳۸
..... کی خبر ۲۰،۵۶،۵۵
..... کے دن آسمان کا پھٹ جانا ۷
..... چھاجانے والی آفت ۱۰۶،۱۰۷
..... زبردست زلزلہ ۱۱۹،۱۸۸،۱۸۹
..... میدان حشر ۶۳
..... دوبارہ اٹھایا جانا ۹
..... کے دن موجودہ سوسائٹی کا ڈھانچہ چکنا چور ۶۶
..... کے دن بھید کھل جائیں گے ۱۹۴
..... کھڑکھڑانے والی آفت ۱۹۶،۱۹۷
..... کے دن لوگوں کا متفرق طور پر نکلنا ۴۲، ۴۴
..... منکرین قیامت کا اشکال ۲۳
..... کے دن جوابدہی ۲۰۰،۲۰۲
..... دنیا کا اختیام اور سائنس
..... نئے عالم کا تصور اندھا عقیدہ نہیں
..... کے دن مجرمین کا حال ۲۵۲، ۲۵۳
قرآن ۳۲،۴۸،۷۸،۸۶،۸۷
..... نزول کا آغاز ۱۶۷،۱۷۵،۱۷۸
..... پڑھنے کا حکم ۱۶۶،۱۶۷،۱۶۸
..... پڑھنے کا ثمرہ ۱۷۲
..... کے نزول کے موقع پر سخت پہرہ
..... بلند مرتبہ ۳۲،۳۳،۳۴،۳۵
..... شیطان کی دخل اندازیوں سے پاک ۳۵،۴۹
..... یاددہانی ۵۲
..... لفظاً لفظاً کلام الٰہی ۴۹،۱۶۸،۱۶۹
..... کی حفاظت کا سامان ۹۸،۹۹
..... کا نزول شب قدر میں ۱۷۴،۱۷۵
..... سلامتی کا پیغام ۱۷۸
..... مصحف عثمانی ۱۸۶
..... کی پیشین گوئی ۲۵۱،۲۵۲
..... کی محافظ سورتیں ۲۷۱
قریش ۲۱۵،۲۱۹،۲۲۱
..... نے ابرہہ کا مقابلہ کیوں نہیں کیا ۲۱۷
..... کو سفر سے الفت ۲۲۱،۲۲۰
..... کو امن وعافیت ۲۲۰
..... کا سلسلۂ نسب ۲۲۳
قدار
قتلِ اولا ۴۲، ۴۳
..... فیملی پلاننگ ۴۴
قربانی ۲۳۲،۲۳۵،۲۳۶
قسم ۳۲، ۱۴۰، ۱۴۸، ۱۹۲، ۲۰۴، ۹۷، ۹۰
..... کھانے کا مطلب ۴۷
قبر ۳۵، ۱۹۲، ۲۰۰
..... میں دفن کرنا طریقۂ فطرت ۳۵
..... قبریں اُکھیڑ دی جائیں گی ۵۵، ۵۴
قربِ الٰہی ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۶
کفر ۱۹۴، ۱۸۰، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۰۸
..... سے مراد ۱۸۱، ۱۸۳
کافر ۱۶، ۳۸، ۳۹، ۷۲، ۷۸، ۸۶
۹۴، ۲۳۸، ۲۳۹
کائنات
..... کی تخلیق ۱۴۱
کوثر ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴
کراماً کاتبین (فرشتے) ۶۱، ۵۹، ۵۸

کہانت ۴۸،۵۰
گھاٹی ۱۲۴، ۱۳۰
گھوڑے ۱۹۲، ۱۹۳
گیتا ۲۵۹، ۲۶۰
لوحِ محفوظ ۸۶، ۸۸
لبید بن عاصم ۲۶۵
مشرکین ۱۸۰، ۱۸۱
..... کا انجام ۱۹، ۷
..... مشرکین مکہ کے خیالات ۹، ۱۳، ۱۷، ۲۴۰، ۲۵۹
..... کے لئے شفاعت نہیں ۱۷
..... مشرکین مکہ کی نماز ۲۲۷، ۲۲۸
..... ہندستان کے مشرکین ۲۶۹
..... مشرکین کا عقیدہ ۲۵۷، ۲۵۸
..... مشرکین مکہ کی بت پرستی ۲۳۹، ۲۴۰
..... مشرکانہ مذاہب میں خدا کے جنم لینے کا تصور ۲۶۰، ۲۵۹
منکرین ۹۲، ۱۰۹، ۱۹۷
معوذتین ۲۶۱، ۲۷۱
ماعون ۲۳۰
مال و دولت
..... کا خرچ کرنا ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۴۲، ۱۴۵
..... کا گھمنڈ ۲۱۰، ۲۱۱
..... ارباب مال کا فریب میں مبتلا ہونا ۲۱۰
..... سے محبت ۱۱۶، ۱۹۲، ۱۹۴، ۲۲۹، ۲۳۰
..... زر پرستی ۲۱۰، ۱۱۹
..... مال اڑانا ۱۲۷، ۱۲۴
..... مال کام نہ اڑانا ۱۴۰
..... زیادہ حاصل کرنے کی طلب ۲۰۰، ۲۰۱
..... معیار زندگی ۲۰۱
..... مال سمیٹنا ۲۰۸
..... سرمایہ پرستی ۲۱۰
مادۂ تولید ۹۰، ۹۲، ۹۳
..... ریڑھ اور پسلیوں کے درمیان سے
..... نکلنے کا مطلب ۹۲
مویشی ۲۸
معجزہ
.....اونٹنی کا معجزہ ۱۳۸
..... لاٹھی کا سانپ بن جانا ۲۵
مسکین ۱۱۶، ۱۳۰، ۲۰۱
..... کو کھلانے کی ترغیب ۱۱۸، ۲۲۶، ۲۲۷
..... کی مدد ۱۲۹، ۲۲۹
میراث ۱۱۶، ۱۱۳
میزان ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸
موسیٰ ۲۰، ۲۴، ۲۵، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۶۲
متقین ۱۷، ۱۶
مقرب بندے ۶۸
معراج ۱۸۸
مشکلات
..... کے ساتھ آسانی ۱۵۴، ۱۵۶
علائیت وقدامت پسندی ۷۰
مدائن صالح ۱۱۹
مکہ ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۶۰، ۱۶۲
..... فتح مکہ ۲۴۵، ۲۴۶

نماز ۱۰۲، ۱۷۰، ۱۸۰، ۱۸۳، ۲۳۲، ۲۳۶
..... حقیقی نماز ۲۲۸، ۲۲۷
..... رسمی نماز ۲۲۸
..... دکھاوے کی نماز ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸
..... حقیقی اور رسمی نماز کا فرق ۱۰۳
..... نماز یوگا نہیں ۱۰۳
..... اللہ کی یاد ۱۰۳
..... سے غافل ۲۲۶، ۲۲۷
نفاثات
..... کا مطلب ۲۶۴
..... شیطان کے نفث سے مراد ۲۶۵
نجران ۸۴
نصرت الٰہی ۲۴۵
نیکی و بدی کا شعور ۱۳۴
نبی صلی اللہ علیہ وسلم ۴۹
..... کا سلسلۂ نسب ۲۲۴
..... کو کوثر عطا کیا جانا ۲۳۲
..... بعثت سے پہلے ۱۵۱، ۲۵۲
..... نبوت کا اعزاز ۱۵۵، ۱۵۶
..... کا دشمن خیر سے محروم ۲۳۲، ۲۳۶
..... کی ذمہ داری ۱۵۴، ۱۵۵
..... پر اللہ کے احسانات ۱۵۲
..... کو خوش خبری اور تسلی ۱۴۹، ۱۵۵، ۱۵۶
..... بعثت سے پہلے توحید پر قائم ۱۵۱، ۱۵۲
..... کی آزمائش ۱۴۹
..... کی تیوری چڑھانا ۳۳
..... دیوانے نہیں ۴۶، ۴۹
..... کا تیموں اور کمزوروں کے ساتھ رویہ ۱۵۲
..... کا شرح صدر ۱۵۴، ۱۵۵
..... کا ذکر بلند ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶
..... کا عبادت میں انہماک ۱۵۶، ۱۵۷
..... کی راہ کی مشکلات ۱۵۰
..... کے لئے عطاو بخشش ۱۵۰
..... یتیم پیدا ہوئے تھے ۱۵۰
..... کی دعوت ۲۳۹، ۲۴۰
..... کا مشرکین سے اعلان برأت ۲۴۱
..... کا عذاب سے خبردار کرنا ۲۵۲
..... کی خدمت میں وفود ۲۴۶
..... کا دنیا سے رخصت ہو جانے کا اشارہ سورۂ نصر میں ۲۴۳
..... آپ پر جادو کا اثر نہیں ہوا تھا ۲۶۵، ۲۶۶
..... نبی پر جادو والی روایت قرآن کے خلاف ۲۶۵
جادو اور عصمت انبیاء ۲۶۶
نفس
..... کو درست بنانے کا مطلب ۱۳۴، ۱۳۵
..... نفس کا تزکیہ ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۵
..... نفس مطمئنہ کا مطلب ۲۲۰، ۲۲۱
..... نفس کا حقیقی ارتقاء ۱۳۵
نامۂ اعمال ۶۱، ۶۶، ۶۷، ۷۴، ۷۷
..... اعمال نامہ کی مثال مائیکرو فلم ۴۵
..... تیار کرنے والے ۵۸
..... کی بولتی فلم ۵۹
..... ریکارڈ آفس میں محفوظ ۶۴، ۶۶
..... بائیں ہاتھ میں دیا جانا ۷۴، ۷۷

..... دہنے ہاتھ میں دیا جانا ۷۶
نیکوکار ۵۸، ۶۰
..... کا انجام ۳۸، ۳۹، ۶۶، ۶۹
۷۷، ۱۴۰، ۱۴۱
نیند ۱۱، ۸
ناپ تول
..... میں کمی کرنے والے ۶۲، ۶۳
نعمتیں
۱۶، ۳۸، ۳۹، ۲۰۰، ۲۰۲
..... کا ناجائز استعمال ۱۹۳، ۱۹۴
..... نعمت کا اظہار ۱۴۸
نصیحت ۳۲، ۹۶، ۱۰۹، ۱۰۸
ہُبل ۲۴۵
ہدایت ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۸، ۱۶۶
..... انبیائی ہدایت ۲۵۷
ہوائیں ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲
ہادیہ ۱۹۶، ۱۹۸
ہود ۱۱۰
ہمدردی ۱۲۹، ۱۳۰
وید ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰
..... میں خداؤں کی پیدائش کا ذکر ۲۵۸، ۲۵۹
وعید ۶۶، ۲۲۹
وادیٔ مُحسّر ۲۱۶
وحدت ادیان ۲۴۱
وسوسہ
..... کا مطلب ۲۷۴
..... شیطان کا سینوں میں وسوسہ ڈالنا ۲۷۵
یتیم ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۸، ۱۲۹، ۲۲۷
..... کو دھکے دینا ۲۲۶، ۲۲۷
یوگا ۱۳۵
یمن ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۲۱

ادارہ دعوۃ القرآن کی اردو کتابیں

''تفسیر دعوۃ القرآن'' تالیف: مولانا شمس پیرزادہؒ

☆ جلد اوّل سورہ فاتحہ تا سورۂ عنکبوت پارہ ۱ تا ۲۰	750/-	☆ جلد دوم سورۂ روم تا سورۂ ناس پارہ ۲۱ تا ۳۰	450/-
☆ ترجمۂ قرآن مجید (دعوۃ القرآن کا اردو ترجمہ مع عربی متن)	300/-	☆ پارۂ عم علیحدہ ۲۳×۳۶×۱۶ صفحات ۲۸۸	70/-
☆ تفسیر سورہ فاتحہ	8/-	فقہ زکوٰۃ تالیف: یوسف القرضاوی اردو ترجمہ و تلخیص: شمس پیرزادہؒ	180/-

اس تفسیر کے مراٹھی، گجراتی، ہندی اور انگریزی تراجم بھی دستیاب ہیں۔

دیگر اردو کتابیں

☆ تنویر الحدیث	80/-	☆ جواہر الحدیث	60/-
☆ ابھرتے معاشرتی مسائل	25/-	☆ شادی کے شرعی اور غیر شرعی طریقے	16/-
☆ طلاق کب اور کیسے؟	6/-	☆ اکٹھی تین طلاقیں	10/-
☆ یہ کیسا بگاڑ ہے؟	12/-	☆ یہ کیسی دینداری ہے؟	18/-
☆ کیا قرآن کو سمجھ کر پڑھنا ضروری نہیں؟	6/-	☆ قرآن کا انداز بیان	6/-
☆ موضوع اور ضعیف حدیثوں کا چلن	9/-	☆ حجیت حدیث اور ------	10/-
☆ سنو اپنے رب کی	10/-	☆ رویت ہلال کا مسئلہ	8/-

مولانا ریاض احمد کی تالیفات

☆ اتحاد ملت ضرورت اہمیت اور طریقہ	25/-	☆ محمد ﷺ مشن اور کردار	10/-
☆ اولاد کی تربیت	12/-	☆ بدعت، مبالغہ اور تشدد کا مقام (اللہ، رسولؐ اور صحابہؓ۔	14/-
☆ فضائل اعمال میں ضعیف احادیث پر عمل کا شرعی حکم	12/-	☆ بدعت کے حق میں مولانا نعمانیؒ کے دلائل کا جائزہ	12/-
☆ دین اسلام میں بدعت اور اجتہاد کا حقیقی محل	15/-	☆ فضائل اعمال (تبلیغی نصاب) ایک جائزہ	16/-
☆ مسنون اذکار و نوافل میں بدعت کی پہچان	12/-	☆ مطالعۂ قرآن کی ضرورت و اہمیت	12/-
☆ اسوۂ رسول اور تزکیۂ نفس	100/-	☆ جادو عقیدہ و عمل کا امتحان	20/-
☆ کفو، برادری و ادا اور اسلام	8/-	☆ تبلیغی اصول، قرآن و حدیث کی روشنی میں	10/-
☆ سیاسی و اجتہادی امور اور مولانا مودودی	12/-		

چند کتابوں کے مراٹھی، گجراتی، ہندی اور انگریزی تراجم بھی دستیاب ہیں۔

بیشتر کتابوں کے مراٹھی، گجراتی، ہندی اور انگریزی تراجم بھی دستیاب ہیں۔

ادارہ دعوۃ القرآن

۵۹ر محمد علی روڈ ممبئی ۴۰۰۰۰۳ ☆ فون: ۲۳۴۶۵۰۰۵